

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب مہانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

# مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب مہانوی رحمۃ اللہ علیہ

مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱  
فون: ۴۴۴۶۲۰، ۴۴۴۰۰۹۲

مکتبہ مہانوی دفتر الابقاء  
رسالہ

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(رواه البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمیٰ بہ

# حقیقت الصبر

حکیمُ الامۃ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی ضاٹھانوی

رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

مُحَمَّدٌ عَبْدُ الْمَنَّانِ غَفْلَةٌ

مکتبہ ضاٹھانوی۔ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی  
ایم۔ اے جناح روڈ

اطلاع ضروری: یہ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

# حقیقۃ الصبر

آیت	کہاں ہوا	تھانہ بھون بھون شیخ رشید احمد صاحب متعلقہ دارالحدیث
مکتبہ	کب ہوا	۲۲ محرم ۱۳۳۳ھ بروز جمعہ شروع ۷ بجکر ۲۵ منٹ
کے	گنتی دیر ہوا	۲۲ گھنٹہ (۹ بجکر ۵۰ منٹ پر ختم)
بہنوں	کس طرح ہوا	تخت پر بیٹھ کر
ہے	کیوں ہوا	جس مکان کی ایک نقل ہو گیا تھا بطور تعزیت کے بیان ہوا
مکان	کیا مضمون تھا	صہبت پر گہرے کی حقیقت ہے کہ رنجِ دہی کو عقل کی حد تک پہنچاؤ اور اعمال میں نقلیں نہ کریں۔
ای نشان	سے طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	اہل مصائب کو خصوصاً اور اصحابِ تحریکاتِ فاضلہ کو عموماً
فہم من	کس شخص کا کیا	احقر ظفر احمد تھا نوی عفا الشرحہ وکلان لہ
کے مضمون	سامعین کی تحقیق سے	جمع رہا تقریباً ۳۰ اور نورتوں کا مجمع پروردہ میں اس کے علاوہ تھے۔
الاشتیات	متفرقات	حضرت مولانا پر دھوپ آگئی تھی سامعین کو بھی دھوپ سے تکلیف ہونے لگی اس لیے بیان جلد ختم کر دیا گیا مضمون باقی رکھا تھا جسکو تیس دن بروز کیشنبہ مدرسہ میں پورا کیا گیا اسکا نام ما علیہ الصبر ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله محمدًا ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمد عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم۔

اما بعد۔ فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم۔ بسوا اللہ الرحمن الرحیم۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ  
أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝

اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے

تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کی ملک میں اور ہم سب اللہ ہی کے پاس جانے

والے ہیں ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں ان کے پروردگار کی طرف سے ہونگی

اور عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کی رسائی ہو گئی

شاید اس آیت کو سن کر کسی کو یہ شبہ ہوا ہوگا کہ اس وقت کسی خاص مصیبت کے

متعلق صبر کی تعلیم کی جائے گی اور وجہ اس شبہ کی یہ ہے کہ ان اللہ اکثر ایسے ہی مواقع میں پڑھا

جاتا ہے جہاں کوئی موت کا واقعہ ہو گیا ہو۔ مگر میرا مقصود اس وقت یہ نہیں ہے۔ گو اگر یہ مقصود

ہو تب بھی غلط نہیں کیونکہ بعض واقعات اس گھر میں ایسے ہوئے بھی ہیں۔ مگر مجھ کو صرف

مضمون تعزیت کا بیان مقصود نہیں کیونکہ اس کا بیان بارہا ہو چکا ہے۔ مصیبت کے وقت

صبر کی ضرورت کو سامعین بارہا سن چکے ہیں۔ پھر ماشار اللہ گھر والے خود سمجھ دار ہیں ان کو

اس بات کے سمجھانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں میں اس وقت ایسا مضمون بیان کرنا چاہتا

ہوں جو شاید ابھی تک کانوں میں نہ پڑا ہوگا اور آجکل اس کی بہت ضرورت ہے۔

اس مضمون کا تعلق صرف مصیبت موت اقرباء سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کی مصیبت

سے اس کو تعلق ہے۔ مصائب بعض خاص ہوتی ہیں جن کا اثر ایک شخص یا چند اشخاص

تک محدود ہو، بعض عام ہوتی ہیں جن کا تعلق عام طور پر سب مسلمانوں سے ہو یہ

مضمون دونوں قسموں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں پر عام

مصائب کا بھی ورود ہے اس لئے اس مضمون کی بہت ضرورت ہے۔ اور میری عادت

یہی ہے کہ اکثر ضرورت کے موافق بیان کیا کرتا ہوں۔ اور ایسے ہی مضامین کو بیان

کے لئے اختیار کیا جاتا ہے جن کی طرف توجہ کم ہے چنانچہ اس وقت ایسا ہی مضمون مجھ کو

بیان کرنا ہے میں اول اجمالاً تعین مقصود کئے دیتا ہوں۔ تاکہ پھر تفصیل کے سمجھنے میں

آسانی ہو۔ نیز سامعین کو تمہید سے اُس مضمون کا اشتیاق بھی پیدا ہو گیا ہوگا تو دیر تک ان کو منتظر رکھنا بھی مناسب نہیں۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ انسان کی حالت یکساں نہیں رہا کرتی۔ بلکہ اس پر مختلف حالات کا درود ہوتا رہتا ہے۔ کبھی گوارا واقعات پیش آتے ہیں کبھی ناگوار گوارا واقعات کا اثر تو یہ ہے کہ اسے دل میں نشاط و انبساط ہوتا ہے فرحت و سرور کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہے کہ اس حالت میں انسان جو کام کرنا چاہتا ہے خوشی خوشی کر لیتا ہے ہر کام میں دل لگتا ہے بلکہ کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور جو شخص جس کام کا پابند ہے اس کو پابندی کے ساتھ کرتا رہتا ہے نشاط و انبساط کی حالت میں دنیا اور دین دونوں کے کام بخوبی چلتے رہتے ہیں گو کوئی شخص مستی و کاہلی یا غفلت و لاپرواہی کی وجہ سے کچھ نہ کرے مگر اس حالت کا اثر یہی ہے کہ اگر کام کرنا چاہے تو کر سکتا ہے صرف ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد کوئی مانع نہیں ہوتا۔ اور ناگوار واقعات کی خاصیت یہ ہے کہ ان سے دل میں انقباض اور بستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رنج و غم کا غلبہ ہوتا ہے طبیعت پر مردہ مرجھائی سی رہتی ہے یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہوتا ہے کہ پریشانی بڑھ کر افعال میں اختلال ہو جاتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا ہر وقت قلب پر ایک فکر سوار ہے جو ہر کام میں ساتھ رہتی ہے جس کی وجہ سے اول تو کچھ کام ہی نہیں ہوتا اور جو ہوتا بھی ہے تو انتظام اور پابندی کے ساتھ نہیں ہوتا غرض دین و دنیا دونوں کے کاموں میں گڑ بڑ ہو جاتی ہے رنج و غم و فکر و پریشانی حدوث ارادہ عمل سے بھی مانع ہوتا ہے اور بقاء ارادہ کو بھی مانع ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے اختلال امور دنیا سے تو چنداں بخت نہیں کیونکہ اول تو اس کا ہر مقابلہ دین کے اشد نہیں۔ دوسرے امور دنیا کے اختلال کا ضرر امر محسوس ہے اس کی طرف چند روز میں خود بخود توجہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی کے گھر میں دوکان سے روزانہ دو چار روپے آتے تھے۔ اب پریشانی میں دوکان کے بند ہونے سے وہ آمدنی بند ہو گئی تو د چار دن کے بعد اس ضرر کا احساس خود بخود ہو جاتا ہے۔ یا کوئی ملازمت سے رخصت لے کر آیا تھا رخصت ختم ہونے کے بعد اس کو تنخواہ کے کٹنے کا خیال

جلدی ہی پیدا ہو جاتا ہے وعلیٰ ہذا جو شخص دنیا کمانے کا جو طریقہ بھی اختیار کئے ہوئے ہے اس کے بند ہونے کا ضرر اس کو جلدی ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ اس لئے مجھے اس کے بیان کی ضرورت نہیں میں اس وقت اعمال دین کے اختلال پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مصیبت کا اثر دین پر یہ پڑتا ہے کہ معمولات میں اختلال ہو جاتا ہے۔ انسان مصیبت سے پہلے جن اولاد کا پابند ہوتا ہے مثلاً ذکر و شغل یا نماز و تلاوت قرآن وغیرہ کا مصیبت کے وقت ان سب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بعض تو فرائض و واجبات کو بھی ناغہ کر دیتے ہیں اور جو دیندار کہلاتے ہیں وہ فرائض و واجبات کو تو ترک نہیں کرتے مگر معمولات زائدہ کو وہ بھی ناغہ کر دیتے ہیں۔ اور ناگوار واقعات کا اثر بہت سخت ہے کیونکہ یہ دین کا ضرر ہے اور مسلمان کے نزدیک دین دنیا سے مقدم ہے اس لئے اس کا ضرر بھی ضرر دنیا سے اشد ہے اور اس پر متنبہ کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ دین کا ضرر امر محسوس نہیں فرض نماز یا تہجد یا ذکر تلاوت قرآن کے ناغہ کرنے سے کوئی ظاہری آمدنی بند نہیں ہوتی تو اس کے ضرر کا احساس بھی جلدی نہیں ہوتا نیز اس ضرر پر کوئی عزیز یا خیر خواہ بھی متنبہ نہیں کرتا حتیٰ کہ مشائخ و معلمین کی بھی یہ عادت ہے کہ جب ان کے کسی مرید وغیرہ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کو صرف جزع و فزع نہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور عام طور پر صبر و شکر کی تعلیم اسی معنی کر کی جاتی ہے (کہ جزع و فزع نہ کرو ۱۲) اس پر نظر نہیں ہوتی کہ اس ناگوار واقعہ سے ان امور میں بھی خلل پڑ گیا ہے جن کا یہ پہلے سے پابند تھا ان طاعات و عبادات میں بھی گڑبڑ ہو گئی ہے جو پہلے سے مامورہ ہیں اور نہ اس ضرر پر اس کو متنبہ کیا جاتا ہے۔ اور منشا غلطی کا یہ ہے کہ طاعات معمول بہا کی پابندی کو عموماً حقیقت صبر سے خارج سمجھا جاتا ہے اور اس کے خلل کو انسان صبر پر محمول نہیں کیا جاتا۔ بس جو شخص مصیبت کے وقت جزع و فزع نہ کرے اس کو بڑا صابر اور مستقل مزاج سمجھتے ہیں گو اس کے معمولات میں کیسا ہی خلل ہو گیا ہو یہ ایک عام غلطی ہے جس پر عوام تو کیا خواص کی بھی نظر نہیں اس لئے میں اس وقت اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔

لوگوں کی نظر ناگوار واقعات کے صرف پہلے اثر ہے۔ جو قلب پر واقع ہوتا ہے دوسرے اثر پر جو اعمال میں واقع ہوتا ہے بالکل نظر نہیں کی جاتی۔ دوسروں کی تو کیا شکایت خود صاحب واقعہ کو بھی اس پر نظر نہیں ہوتی۔ اگر کسی وقت کسی کی نظر ہوئی بھی تو صرف اس قدر کہ پریشانی میں فرائض و واجبات میں اگر خلل آنے لگا تو دین داروں کو اس وقت کچھ تنبیہ ہو جاتا ہے۔ مگر سنن و مستحبات کے اختلال پر ان کو بھی بہت کم تنبیہ ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سنن زوائد و مستحبات کے متعلق یہ اعتقاد جما ہوا ہے کہ ان کے کرنے میں ثواب اور نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ اس لئے ان کے نافع ہونے کو سہل بات سمجھتے ہیں حالانکہ نصاب میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن زائدہ اور مستحبات کا یہ حکم قبل شروع کے ہے اور شروع کے بعد ان کا حکم بدل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حکم تو عین وقت اشتغال کے ساتھ مختص ہے وہ یہ کہ شروع کرنے کے بعد مستحب کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور ایک حکم عام ہے جو وقت اشتغال کے ساتھ مختص نہیں وہ یہ کہ جس مستحب کو معمول بنا لیا جائے اور کچھ عرصہ تک اس پر مواظبت کر لی جائے اب اس کا نافع کرنا اور مواظبت کچھ چھوڑ دینا مکروہ ہے اور اس کی دلیل ایک حدیث بخاری کی ہے جو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا

يَا عَبْدَ اللَّهِ لَا تَكُنْ مِثْلُ فُلَانٍ كَانَ يَقْوَمُ مِنَ اللَّيْلِ ثُمَّ تَوَكَّاهُ يَعْنِي اے عبد اللہ تم فلاں شخص کی طرح نہ ہونا جو رات کو (نماز کے لئے) اٹھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی اس حالت پر ناگواری اور کراہت ظاہر فرمائی ہے معلوم ہوا کہ ایک مستحب کو معمول بنا کر ترک کر دینا مذموم و مکروہ ہے۔

رَقُلْتُ بُوْبَ عَلِيٍّ الْبَخَارِيُّ مَا يَكْرَهُ مِنْ تَرْكِ قِيَامِ اللَّيْلِ لِمَنْ كَانَ يَقْوَمُهُ قَالَ الْحَافِظُ اِيْ اِذَا اشْعُرْ ذَلِكِ بِالْاَعْتَرَا ضِ عَنِ الْعِبَادَةِ قَالَ وَفِيهِ اسْتِحْبَابُ الدَّوَامِ عَلَى مَا اَعْتَادَهُ الْمُؤْمِنُ الْخَيْرُ مِنْ غَيْرِ تَفْرِيطٍ وَيَسْتَنْبِطُ مِنْهُ كَرَاهَةً قَطْعِ الْعِبَادَةِ وَاِنْ لَوْ تَكُنْ وَاِجِبَةً اھ (ص ۳۳ ج ۳ فتح الباری ۱۲ ج ۱۲)

(بخاری نے ایک باب باندھا ہے کہ مکروہ ہے رات کو اٹھنے کا ترک کرنا اس شخص کیلئے جو راتیں اٹھا کرتا تھا)

اسی لئے بزرگوں کا ارشاد ہے کہ قرآن و واجبات کے علاوہ نوافل وغیرہ کا اتنا ہی پابند ہو جس کو نباہ سکے ورنہ شروع ہی نہ کرے اس سے بڑی بے برکتی ہوتی ہے اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جب ایک کام پابند ہو پھر اس میں فتور ہونے لگے تو اس کا خلل ممتد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس عمل پر تو پھر عمر بھر بھی پابندی نصیب نہیں ہوتی اور اس سے گذر کر دوسرے اعمال میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ آج تو تہجد میں فتور ہے۔ کچھ دنوں میں صبح کی نماز کی پابندی بھی نہ رہے گی پھر وقت کی بھی پابندی نہ رہے گی نماز قضا ہونے لگے گی اور یہ سارا فساد ایک مستحب کی پابندی چھوڑنے سے ہوا اس کے علاوہ ترک پابندی میں ایک اور خرابی اس سے بھی سخت ہے۔ وہ یہ کہ شریف طبائع کا خاصہ ہے اور مسلمان سب شریف ہی ہیں کہ جب وہ کسی سے ایک خاص قسم کا برتاؤ شروع کرتے ہیں تو جب تک اس برتاؤ کا نباہ ہوتا رہے اس وقت تک تو ان کے دل میں تعلق بھی بڑھتا رہتا ہے اور جب وہ برتاؤ چھوٹ جاتا ہے تو سب سے پہلے اس صاحبِ برتاؤ ہی کے دل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب دوسرے کو بھی اس کی رکاوٹ کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ بھی رکنے لگتا ہے مثلاً ایک دوست کے ساتھ آپ کا ہمیشہ سے یہ برتاؤ ہو کہ جب آپ اس سے ملنے جائیں کچھ بدیہ اور سختی ساتھ یجائیں۔ پھر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ خالی ہاتھ چلے گئے تو ہر شخص اپنے دل میں غور کرے کہ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی یقیناً خالی ہاتھ جاتے ہوئے دل رکیگا۔ اور ایک قسم کی شرمندگی اس پر طاری ہوگی گو دوسرے کو اس کے خالی ہاتھ آنے کی طرف التفات بھی نہ ہو اور مگر اس کے دل میں خود بخود یہ دوسو سے دوڑیں گے کہ آج میرے خالی آنے سے دوست کو ضرور کچھ خیال ہوا ہوگا۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ بس اب وہ تعلق نہیں رہا وہ محبت نہیں رہی چاہے اس کے دل میں کچھ بھی نہ آیا ہو مگر یہ اپنے معمول کے خلاف کرنے سے ان اوہام میں ضرور مبتلا ہوتا ہے اور یہ طبعی بات ہے۔ بس رکاوٹ کا بیج تو آج ہی سے بویا گیا اس کے بعد یہ ہوگا کہ ایک دفعہ تو خالی ہاتھ بھی چلا گیا تھا اب ہینے گذر جائے ہیں کہ جانے کا نام بھی نہیں لیستہ دور ہی سے خط کے ذریعہ سے بات چیت



کر لیتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد خط کتابت کا سلسلہ بھی بند ہو جاتا ہے اور دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص مجھ سے رکنے لگا۔ اب وہ بھی اسے رکنے لگتا ہے اور محبت بدل بعدم محبت ہو جاتی ہے پھر عدم محبت کے بعد بھی عداوت تک نو برس پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص تہجد یا ذکر و شغل شروع کرتا ہے تو جب تک وہ ان کا پابند رہے اس وقت تک اس کے دل میں حق تعالیٰ سے تعلق اور محبت کی ترقی ہوتی رہتی ہے اور جب پابندی چھوٹی تو پہلے اسی کی طبیعت میں افسردگی اور پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے اس کو ایک قسم کی ندامت سی آتی ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب حق تعالیٰ کے یہاں میرا وہ رتبہ نہیں رہا ہو گا جو پابندی اعمال کے وقت تھا۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ میں مردود و مطرود ہو گیا تو پہلے خود اس کے دل میں حق تعالیٰ سے حجاب اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے پھر سچے ادھر سے بھی بعد و حجاب ہو جاتا ہے پس ترک معمول سے اول اس کے دل میں افسردگی کا پیدا ہونا یہ پہلا حجاب ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کو نشاط و انبساط سے ترقی ہوتی ہے اور افسردگی سے اس میں کمی آتی ہے۔ جب ایک دفعہ دل میں افسردگی اور پریشانی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلق رقبہ میں ضرور کمی آتی ہے۔ پھر یہ خیال پیدا ہونا کہ میں مردود و مطرود ہو گیا دوسرا حجاب ہے اس وقت اس کے دل سے محبت نکل جاتی ہے اور قلب خالی ہو جاتا ہے۔ پہلے درجہ میں تو حق تعالیٰ کی طرف سے حجاب نہ ہوا تھا مگر اب ادھر سے بھی حجاب ہو گیا پھر جب مردودیت کا خیال جم کر اس کے قلب سے محبت ہی نکل جاتی ہے تو واجبات و فرائض میں بھی کوتاہی کرنے لگتا ہے اور معاصی پر اقدام کرنے لگتا ہے اور دل میں سمجھتا ہے کہ میں مردود تو ہو ہی گیا۔ پھر لذات نفس پر کیوں کریں یہ تیسرا حجاب ہے اس وقت محبت بدل عداوت ہو جاتی ہے اس کے بعد بعض اوقات کفر کی سرحد سے قریب ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ ایمان تک سلب ہو جاتا ہے۔

میرٹھ میں ایک کو تو ال تھے وہ بہت ظلم کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ میں جہنم میں تو جاؤں ہی گا پھر رشوت اور ظلم میں کیوں کمی کروں یہ حالت سخت حجاب کی دلیل ہے مگر نہ معلوم کس بزرگ کی توجہ کا اثر ہوا یا کونسا عمل ان کا قبول ہو گیا

ان کا خاتمہ اور انجام اچھا ہوا ہے

در نہ بیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود ؛ (ورنہ تیرے دل بے رحم سے تو کوتاہی نہیں ہوتی) انھوں نے تو اپنی طرف سے خاتمہ بُرا ہونے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ حق تعالیٰ ہی نے دستگیری فرمائی اور اس تمام حالت کا منشا اور سرچشمہ وہی افسردگی ہے جو اول اول معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے سے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں حجابات کی سات قسمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ غفلت و اعراض بھی ہے جس کا اثر افسردگی ہے اور بقیہ چھ درجے یہ ہیں۔ حجاب تفاسل، سلب مزید، سلب قدم، تسلی عداوت یعنی اول اعراض ہوتا ہے اگر معذرت و توبہ نہ کی حجاب ہو گیا۔ اگر پھر بھی اصرار رہا تو تفاسل ہو گیا اگر اب بھی استغفار نہ کی تو عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق و شوق کی تھی وہ سلب ہو گئی۔ یہ سلب مزید ہے اگر اب بھی اپنی بے ہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت و عداوت کہ زیادتی کے قبل اصل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہو گئی اس کو سلب قدیم کہتے ہیں۔ اگر اس پر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل سے گوارا کرنے لگا یہ تسلی ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت مبدل بہ عداوت ہو گئی نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْهَا (اللہ کی پناہ اس سے) اس لئے مستحبات معمولہ کو ترک کرنا سہل بات نہیں اس کا اثر بہت دور تک پہنچ جاتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ آدمی جس قدر مستحبات و نوافل زیادہ کرتا ہے وہ اسی قدر مقرب ہوتا ہے۔ پھر تقرب کے بعد حق تعالیٰ سے بے التفاتی کرنا سخت بات ہے حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرماتے ہیں عالم ظاہر عالم غیب کا نمونہ ہے پس جیسا ہمارا مذاق یہ ہے کہ جس کو اپنے سے تعلق زیادہ نہیں ہوتا اس کی بے التفاتی زیادہ ناگوار نہیں ہوتی اور تعلق بڑھا کر جو بے التفاتی و بے اعتنائی کرتا ہے اس پر زیادہ غصہ آتا ہے۔ ایسے ہی حق تعالیٰ کے ساتھ جن کو معمولی تعلق ہے ان کی غفلت و بے اعتنائی پر زیادہ قہر نہیں ہوتا اور جو تعلق بڑھا کر مقرب بن کر غفلت و بے التفاتی کا برتاؤ کرتے ہیں ان پر زیادہ قہر ہوتا ہے۔ پس جو لوگ مستحبات

و تو اقل پر موانظبت کر کے پھر ترک موانظبت اختیار کرتے ہیں وہ درباری بنکر دربار سے غیر حاضر ہوتے ہیں اور بادشاہ کا درباری اگر دربار سے بلا وجہ بلا عذر کے غیر حاضر ہونے لگے تو اس پر بہ نسبت غیر درباری کے زیادہ سخت ہوگا اور اگر ترک موانظبت علی المستحب سے گزر کر وہ فرائض و واجبات میں بھی کوتاہی کرنے لگے معاصی پر بھی اتماد کرنے لگے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقرب شاہی بن کر نافرمانی اور گستاخی کرنے لگے اور ظاہر ہے کہ مقرب کی گستاخی پر جس قدر عتاب ہوگا ایک غیر مقرب مثلاً دیہاتی یا گنوار کی گستاخی پر اتنا عتاب نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ ناگوار واقعات کا یہ اثر بہت سخت ہے کہ ان سے بعض اوقات اعمال میں تقلیل ہونے لگتی ہے لوگ مصائب کا حق صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ ایسے مواقع میں جزع و فزع نہ کیا جائے اور اسی کو کمال صبر سمجھتے ہیں اس پر کسی کی نظر نہیں کہ ناگوار واقعات کا یہ بھی ایک حق ہے کہ اس وقت اعمال سابقہ میں کمی نہ کی جائے۔ اس کو تو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معمولات ترک کرنے کا ضرر بہ نسبت جزع و فزع کے ضرر کے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ جزع و فزع کا اثر محدود و غیر متدہ ہے اور اس میں انسان کسی قدر معذور بھی شمار ہو سکتا ہے اور تقلیل اعمال کا ضرر متدہ ہے جو بہت دور تک پہنچتا ہے۔ اور اسی لئے مصیبت کے وقت معمولات پر جمار ہنا صبر کا جزو و اعظم ہے۔ اسی مضمون پر تنبیہ کرنے کے لئے میں نے اس آیت کی تلاوت کی ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہم کو مصیبت کے ہلکا کرنے کا ایک طریقہ بتلایا ہے جس پر عمل کرتے سے یہ اثر تقلیل فی الاعمال ظاہر نہیں ہو سکتا کیونکہ ناگوار واقعات سے اعمال میں تقلیل کا سبب فرط غم اور غلبہ حزن ہے بس اگر کسی تدبیر سے غم اور رنج کو ہلکا کر دیا جائے تو اس کا یہ اثر بھی ظاہر ہوگا قاعدہ ہے کہ ازالہ سبب سے مسبب کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس آیت سے اوپر بعض مصائب کا ذکر ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وَلْتَبَيُّوْا شُكُوْبِنِّیْ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْءِ وَنَقْصِیْنَ اِذَا مَوَالِیْ وَاَنْفُسِیْ وَالتَّمْرِاتِ**۔ (ترجمہ یہ ہے۔ اور البتہ ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے یعنی تم کو دشمنوں کی طرف سے اندیشہ اور خوف بھی پہنچے گا۔ اور جوع سے یعنی کسی وقت تم پر فاقہ بھی آئے گا اور اموال و نفوس اور ثمرات کے نقصان سے

یعنی کسی وقت تمہارا مال بھی ضائع ہوگا جانیں بھی ضائع ہوں گی اور ثمرات بھی ضائع ہوں گے۔ ثمرات کی ایک تفسیر تو پیداوار ہے مطلب یہ کہ کسی وقت تمہاری کھیتیوں اور باغات کی پیداوار پر آفت آئے گی اور گواہیوں میں یہ بھی آگئے تھے مگر چونکہ زمینداروں کے نزدیک یہ اعرالاموال (مالوں عزیز تر) ہیں اور مدینہ والے اکثر زمیندار تھے اس لئے ثمرات کو مستقلاً بیان فرمادیا اور ایک تفسیر ثمرات کی اولاد ہے کیونکہ وہ ماں باپ کے جگر کے ٹکڑے ہیں اسی لئے اولاد کو ثمرات القواد (دلوں کا پھل) کہا جاتا ہے اور گودہ نفوس میں داخل ہو سکتے ہیں مگر یہاں بھی تخصیص کی وہی وجہ ہوگی جو ثمرات بمعنی پیداوار کو اموال کے بعد ذکر کرنے کی وجہ تھی یعنی چونکہ اولاد اعرالنفوس (جانوں میں زیادہ عزیز) ہیں اور ان کے مرنے کا غم زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کو جدا بیان کر دیا کہ کسی وقت تمہاری اولاد بھی ہلاک ہوگی۔ اس میں ایک تو یہ بتلادیا کہ تم پر یہ واقعات وارد ہوں گے، دوسرے یہ بھی بتلادیا کہ ان واقعات سے ہم تمہارا امتحان لیں گے یہی ایک لفظ ایسا ہے کہ اگر اور بھی کچھ نہ ہوتا تو اسی سے مصیبت ہلکی ہو گئی کیونکہ امتحان کا لفظ سننے ہی مخاطب کو فکر ہو جاتی ہے کہ مجھے اس امتحان میں پاس ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ میں فیل ہو جاؤں اور قاعدہ ہے کہ انسان امتحان کے وقت اپنے حواس و عقل کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے پس پسینہ کہ یہ واقعات بطور امتحان کے آئیں گے ہر شخص اس کی کوشش کرے گا کہ ان مواقع میں اپنے عقل و حواس کو مجتمع رکھے از خود رفتہ نہ ہو جائے کیونکہ امتحان کے وقت بدحواس ہو جانے سے آدمی فیل ہو جاتا ہے۔ اور مصیبت کے وقت عقل و حواس قائم رکھنا بھی اس کے اثر کو بہت کم کر دیتا ہے پس لَسْبَلُوْا شَكُوْا (ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے) میں اس پر تشبیہ کر دی گئی ہے کہ مصائب کے وقت بدحواس نہ ہونا چاہیے بلکہ ان کو امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ پھر اس میں صیغہ جمع متکلم اختیار فرمایا جس سے عظمت ابتلا پر دلالت ہے کیونکہ معلوم ہو گیا کہ یہ امتحان حق تعالیٰ خود لیں گے اور جیسا ممتحن عظیم الشان ہوتا ہے ویسا ہی امتحان بھی عاۃً مہتمم بالشان ہوتا ہے گو واقع میں حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان عظیم نہ ہو آسان اور سہل ہی ہو مگر مخاطب کو

بتلا دیا کہ وہ ابتلاءِ عظیم کے لئے تیار رہے اور اس میں بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ پہلے سے ہم کو مطلع فرمادیا کہ تم کو ایسے ایسے واقعات پیش آئیں گے اس صورت میں تکلیف کی کلفت تو ہوگی مگر دفعۃً جو ایذا پہنچنے کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو پہلے سے کہہ دیا جائے کہ تمہارا اپریشن کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس کو اپریشن کی تکلیف تو ہوگی مگر دفعۃً کلفت پہنچنے کا صدمہ نہ ہوگا۔

کیونکہ پیشگی اطلاع سے وہ اس کے لئے تیار رہے گا لوگ آیت لَا تَقْنَطُوا (ناہیدمک) کو آیت رحمت سمجھتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ہر آیت سے یہی رحمت ٹپکتی ہے چنانچہ اس آیت میں کتنی بڑی رحمت کا مضمون ہے کہ ہم کو مصائب کے لئے پہلے سے تیار کر دیا۔ تاکہ وقت پر بدحواس نہ ہو جائیں بلکہ یوں کہیں کہ هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ (یہ وہ جس کا وعدہ کیا ہے ہم سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچا ہے) کہ یہ تو وہی بات ہے جس کا وعدہ ہم سے خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے کر دیا تھا اور یہ بھی خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ انسان کی مرضی کے موافق سب رے کام نہیں ہیتے بلکہ بعض واقعات ناگوار اور خلاف طبع بھی اس کو پیش آتے ہیں۔ اگر سب کام اس کی مرضی کے موافق ہو کرتے تو یہ ہلاک ہو جاتا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ تو اپنے لئے راحت ہی تجویز کرتا۔ اور راحت کا خاصہ ہے بیفکری اور غفلت پس دوامِ راحت سے یہ غفلت میں پڑ جاتا اور معاصی پر دلیر ہو جاتا اور یہ اس کے لئے سراسر ہلاکت ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے سب کام اپنی مرضی پر رکھے ہیں، ہماری مرضی پر نہیں رکھے پس جب کہنی ہم غفلت وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں اُدھر سے کسی ناگوار واقعہ کا ایک تازیانہ لگا دیا جاتا ہے جس سے کچھ دنوں تک غفلت کا علاج ہوتا اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ طاعون وغیرہ کے زمانہ میں ساہا سال کے بے نمازی بھی نمازی ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو گونہ آخرت کی فکر ہو جاتی ہے گویہ واقعات ہم کو ناگوار ہوتے ہیں مگر ان میں ہمارے واسطے حکمت اور منتعت رکھی ہوئی ہے اگر حق تعالیٰ ہماری مرضی کے موافق ہی سب کام کیا کریں تو

ہم کو آخرت کی طرف کبھی توجہ نہ ہو۔ پس ناگوار واقعات کا پیش آنا بھی بڑی رحمت ہے جیسے استاد کی شفقت یہ ہے کہ کبھی کبھی بچہ کے ایک دو قمیچے مار دیا کرے ورنہ وہ تو بدشوق ہے اگر یہ کبھی اس کو کبھی ہاتھ بھی نہ لگاوے گا تو بچہ بالکل خراب ہو جائے گا نہ پڑھے گا نہ لکھیگا نہ بے جا حرکتوں سے باز آئیگا بلکہ سر پر چڑھ جائے گا۔ استاد کی شان میں بھی گستاخی کرنے لگا اس حالت میں آپ خود ہی یہ رائے دیتے ہیں کہ استاد کو تنبیہ و تادیب سے کام لینا چاہیے۔ اور اس کے حق میں اس کو شفقت سمجھتے ہیں۔ پھر اسکو کیا وجہ ہے کہ ناگوار واقعات میں حق تعالیٰ کی رحمت میں اعتقاد نہ ہو یہاں شاید سامعین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ غافلین کو ناگوار واقعات پیش آنے کی تو یہ حکمت ہے مگر کالمین کو ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں وہ تو بدشوق نہیں ہیں جس سے ان کو تنبیہ کی ضرورت ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ اہل اللہ کالمین کو بھی ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اس شبہ کا جواب اسی آیت میں لفظ **لَتَبْلُوَنَّكُمْ** سے نکلتا ہے کیونکہ اس میں اولاً حضرات صحابہ کو خطاب ہے جو سب کے سب کالمین ہیں اور ان سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو ان واقعات سے آزمائیں گے معلوم ہوا کہ کالمین پر ایسے واقعات بطور تنبیہ اور تادیب کے نہیں آتے بلکہ بطور امتحان کے پیش آتے ہیں حق تعالیٰ ناگوار واقعات سے ان کی محبت و عشق کا امتحان فرماتے ہیں اور حق تعالیٰ کو خود امتحان کی کوئی ضرورت نہیں ان کو ہر شخص کی حالت خوب معلوم ہے۔ بلکہ اس امتحان سے دوسروں کو گھلانا منظور ہے مثلاً ملائکہ وغیرہ کو کہ دیکھو ہمارے بندے مصائب میں بھی کیونکر ہم کو چاہتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں مگر پھر بھی وہ ہماری محبت سے نہیں ہٹتے۔ اور تکلیف کو عین راحت سمجھتے ہیں۔ پس اب اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ کالمین پر ایسے واقعات کیوں آتے ہیں۔ نیز لفظ **لَتَبْلُوَنَّكُمْ** ہم تم کو ضرور آزمائیں گے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کالمین کو مصائب سے کلفت بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس آیت کے مخاطب حضرات صحابہ ہیں جو سب کے سب کامل ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان پر یہ واقعات بطور امتحان کے آتے ہیں۔ ایک مقدمہ

تو یہ ہوا اب اس کے ساتھ ایک مقدمہ یہ ملا کہ بدون احساس کلفت کے امتحان نہیں ہو سکتا اور یہ بالکل ظاہر اور بدیہی بات ہے جس شخص کو ناگوار واقعات سے کچھ بھی کلفت نہ ہو اس کے حق میں ان کو امتحان نہیں کہا جاسکتا امتحان ہمیشہ اسی چیز سے ہوا کرتا ہے جس کا دوسرے پر بار پڑے اور اس کو بار کا احساس بھی ہو۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو ثابت ہو گیا کہ مصائب سے کا ملین کو بھی کلفت ہوتی ہے اتنا فرق ہے کہ کا ملین کو صرف جسمانی کلفت اور طبعی رنج ہوتا ہے اور دنیا داروں کو جسمانی کلفت بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی اور طبعی رنج بھی ہوتا ہے اور عقلی بھی کیونکہ اہل دنیا کو طول اہل کی وجہ سے بہت چیزوں کے ساتھ توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اموال کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مال سے یہ کام نکالیں گے کھیت کی پیداوار سے توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مرتبہ غلہ بیج کر فلاں کام کریں گے۔ پھر ان کے خلاف ظہور میں آتا ہے تو ان کو سخت کلفت ہوتی ہے۔ اسی طرح اولاد کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ لڑکا کا پڑھ کر امتحان میں پاس ہوگا تو یوں نوکر ہوگا یوں ہمیں کما کر دے گا پھر وہ مر گیا تو افسوس ہوتا ہے کہ ہائے یہ بچہ تو پاس ہونے والا تھا اب ددر ہو گیا طبعی رنج تو مفارقت کا ہوتا ہی ہے مگر دنیا داروں کو ان امیدوں کے باطل ہو جانے سے عقلی رنج بھی ہوتا ہے اور گوزبان سے نہ کہیں مگر دل میں یہ وسوسہ اکثر کے ذہن میں آجاتا ہے کہ یہ واقعہ بے محل اور قبل از وقت ہوا اور دنیا داروں کو کسی چیز سے توقع وابستہ نہیں ہوتی اس کو خدا کے سوا کسی سے کچھ امید نہیں ہوتی اس کو کسی ناگوار واقعہ میں خلاف حکمت ہونے کا وہم بھی نہیں ہوتا اس لئے اس کو عقلی رنج ایسے موقع پر ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہتا ہے ۵

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود : (جو کچھ وہ بادشاہ کرے پسندیدہ ہو)

ہاں طبعی رنج ان کو بھی ہوتا ہے اور اتنا رنج تو ہوتا چاہیے ورنہ پھر امتحان کیسے ہوگا اور مصائب میں طبعی رنج موجب نقص نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کاہل ہوگا آپ اپنے صاحب زادہ کی وفات پر فرماتے ہیں۔ اِنَّا بَقَرًا قَدْ يَارِ اِبْرَاهِيْمُ

کَمَحْزُونٍ (اے ابراہیم تمہاری جدائی میں ہم غمگین ہیں)

معلوم ہوا کہ صاحبزادہ کی وفات سے طبعی رنج آپ کو بھی ہوا اور وہ صرف مفارقت کا رنج تھا۔ انسان کو ایک جانور کے چند روز پالنے سے اس کے ساتھ انس ہو جاتا ہے اور اس کی مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے۔ پھر بھلا اولاد کی مفارقت کا صدمہ تو کیونکر نہ ہو یہ تو طبعی بات ہے جو طبیعت انسانہ کا خاصہ ہے پس جو کامل بشر ہوگا اسے صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ ضرور ہوگا ہاں کامل کو عقلی صدمہ نہ ہوگا۔ شاید کسی کو بعض بزرگوں کے ایسے واقعات سے کہ ان کو اولاد کے مرنے پر رنج نہیں ہوا بلکہ وہ ہنستے تھے یہ شبہ ہو کہ یہ حالت زیادہ کمال کی ہے اور ظاہر میں یہ لوگ ان لوگوں سے کامل معلوم ہوتے ہوں گے جو ایسے مواقع پر رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہیں سو یہ شبہ لغو ہے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہو سکتا جب آپ کو ایسے واقعات سے رنج ہوا تو رنج ہونا نقصان کی دلیل نہیں بلکہ عاقل یہ کہے گا کہ زیادہ کامل وہی شخص ہے جس کو رنج ہوا۔ اور پھر حدود سے متجاوز نہ ہوا کیونکہ وہ واقعہ ایسا ہی ہے جس سے رنج پیدا ہونا چاہیے۔ تو جس نے رنج کا احساس کیا معلوم ہوا کہ اس کے حواس کامل اور درست ہیں۔ اور پھر حدود پر قائم رہا تو معلوم ہوا کہ عقل و دین بھی کامل ہے اور جس کو صدمہ کی بات سے صدمہ ہی نہیں ہوا اس کے حواس درست ہونے میں کلام ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حالت وغیرہ کی وجہ سے اس کے حواس بشریہ معطل میں اسی لئے اس کو ایسی بات سے رنج نہیں ہوا جس سے طبعی طور پر رنج ہونا چاہیے تھا۔ اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ ڈاکٹر نے دو شخصوں کا اپریشن کیا ایک کو تو کلور فارم سنگھیا یا وہ تو آپریشن کے وقت بے حس و حرکت پڑا رہا نہ چیخا نہ چلا یا نہ ہاتھ پیر ہلائے اور دوسرے کو بدون کلور فارم سنگھائے اپریشن کیا اس نے ایک چیخ ماری مگر ہاتھ پیر بالکل نہیں ہلائے ظاہر میں نادان کو پہلا شخص کامل معلوم ہوگا۔ مگر حقیقت شناس دوسرے کو کامل کہے گا اور سمجھے گا کہ پہلے کے تو حواس معطل تھے اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے نہ زخم کی تکلیف کا احساس ہوا اس کا حرکت نہ کرنا کمال نہیں، کمال دوسرے



شخص کا ہے کہ اس کے حواس درست تھے۔ اس کو زخم نشتر کی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا اور پھر ضبط سے کام لیا ہاتھ پیر نہیں ہلائے صرف ایک چیخ مار کر دم بخود رہ گیا اسی طرح سمجھے کہ ایسے اولیا کو توحق تعالیٰ نے کلورا فارم سنگھا کر مصیبت کا نشتر لگا یا ہے اس لئے ان کو مصیبت کے اثر کا احساس ہی نہیں ہوا اور وہ ہنستے رہے اور انبیاء کو کلورا فارم نہیں سنگھایا کیونکہ ان میں ضبط و تحمل کی طاقت ہے وہ بدون بیہوشی کے بھی مستقل مزاج رہتے ہیں گو تکلیف کا احساس ہوتا ہے کلفت و رنج طبعی کا بھی اثر ہوتا ہے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں بیٹتے پہاڑ کی طرح جھے رہتے ہیں وہ اولیا ناقص ہیں جن کو صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ بھی نہ ہوگا کامل وہ ہے جس کی حالت انبیا علیہم السلام کے مشابہ ہو اس لئے کاملین کو رنج ہوتا ہے اب سمجھے کہ یہاں کلورا فارم کیا چیز ہے وہ غلبہ حال ہے جس سے بعض دفعہ احساس معطل ہو جاتا ہے انبیاء اور اولیا کاملین پر ایسا غلبہ حال نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو شاذ و نادر ہوتا ہے اکثر مستطین سوک پر غلبہ حال زیادہ ہوتا ہے۔ غرض لَنْبَلُوْا تَكُوْمُوْنَ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین پر طبعی رنج و کنت کا اثر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ناگوار واقعات میں ان کے لئے امتحان و ابتلا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے اس اشارہ کی تائید ہو گئی اس تقریر سے یہ بات تو معلوم ہو گئی ہوگی کہ اس وقت مجھ کو اصل مقصود تقلیل اعمال کے ضرر پر تنبیہ کرنا ہے اور یہ بتلانا منظور ہے کہ بعض دفعہ جو کسی سبب سے ہم لوگ معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں یہ حالت خطرناک اور قابل اصلاح ہے تعین مضمون سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون کچھ اس آیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس کا بیان قریب قریب ہر آیت میں موجود ہے کیونکہ قرآن مجید میں جا بجا استقامت علی الاعمال کی تاکید ہے احادیث بھی اس سے بھری ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے استقیموا اولن تحصوا الاعمال پر استقامت کرو اور ہرگز کوتاہی نہ کرو اور ارشاد ہے ان احببنا الاعمال الی اللہ ما یرئو علیہ یرئو اللہ کے نزدیک وہ اعمال ہیں جن پر آدم کیا جائے مگر تعین آیت کی وجہ یہ ہوئی کہ آج کل مسلمانوں پر مصائب کا چار طرف سے ہجوم ہے نیز یہ مہینہ بھی محرم کا ہے جو مصیبت کا مہینہ مشہور ہے جس کا منشا حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ (وَرَضَاهُ وَرَضِيَ عَنْهُ مَنْ يُحِبُّهُ رَضِيَ) اور اس شخص سے بھی راضی جو ان کے محبت رکھتا ہے)

کی شہادت کا واقعہ ہائلہ ہے جو درحقیقت ایک صدمہ جانکاہ ہے مگر جہالت کے سبب ہم لوگوں نے اس میں حدود سے تجاوز کر لیا ہے جس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ لوگوں نے اس زمانہ میں نکاح و شادی کو ناگوار اور مکروہ سمجھ لیا چنانچہ ہمارے ایک عزیز کی شادی ذی الحجہ کی تیس تاریخ کو قرار پائی تھی جس میں محرم کی چاند رات کا ہونا تو متیقن تھا اور یہ بھی احتمال تھا کہ شاید کسی جگہ آج ہی محرم کی پہلی ہو تو لڑکی کے ولی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی کہ تاریخ شادی کے لئے بھلا یہی دن رہ گیا تھا مگر انہوں نے اتنا گرم کیا کہ شادی میں گو خود شریک نہیں ہوئے لیکن اجازت نکاح دیدی اور اپنی طرف سے اپنے ماموں صاحب کو بھیجا۔ ہم نے کہا کہ اس خیال کو توڑنا چاہئے اور اسی دن نکاح کیا مگر کئی سال تک مستورات کو فکر رہا کہ دیکھئے کوئی بات ناگوار پیش نہ آجائے اگر لڑکی کا ذرا بھی کان گرم ہوا تو اس کے ولی ہی کہیں گے کہ یہ اس تاریخ میں نکاح ہونے کی نحوست ہے مگر بھلا اللہ کوئی ناگوار بات پیش نہیں آئی اور دونوں میاں بی بی خوش و خرم ہیں، صاحب اولاد بھی ہیں حق تعالیٰ نے کھلی آنکھوں دکھلا دیا کہ عوام کا اس زمانہ کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے۔ نصوص میں جا بجا اس کی تصریح ہے کہ نحوست و سعد کا سبب زمانہ وغیرہ نہیں نہ کوئی دن منحوس ہے نہ کوئی مہینہ نہ کسی مکان میں نحوست ہے نہ کسی انسان میں بلکہ اصل نحوست اعمال معصیت میں ہے مگر افسوس اس نحوست سے اجتناب کا کسی کو اہتمام نہیں بلکہ اسے خود بخود اپنے ساتھ لپیٹتے ہیں دوسرا اثر اس واقعہ سے یہ لیا گیا کہ اس تذکرہ کا اعادہ ہر سال ہوتا ہے چنانچہ محرم میں جا بجا شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں مجالس عزاء قائم کی جاتی ہیں اور اس واقعہ کو سن کر لوگ بے اختیار روتے ہیں، بعضے بری طرح نوجہ کرتے ہیں پھر شہداء کی یادگار میں تعزئے اور علم نکالے جاتے ہیں۔ نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حالت بھی خلاف شرع اور قابل اصلاح ہے کیونکہ ان تمام افعال کا خلاصہ تجددِ غم و اظہارِ حزن ہے حالانکہ تجددِ غم و اظہارِ حزن مرضی خداوندی کے بالکل خلاف ہے مرضی حق یہ ہے کہ رنجِ طبعی کو اس کی حد سے نہ بڑھایا جائے اور اپنی طرف سے غم بڑھانے کا

۱۷ یہ واقعہ احقر جامع کی شادی کا ہے ۱۲

کوئی سامان نہ کیا جائے بلکہ حق تعالیٰ نے تو رنجِ طبعی کے کم کرنے کے بھی سامان کئے ہیں چنانچہ وہ باتیں تسلیم فرمائی ہیں جن کے استحضار سے رنجِ طبعی بھی کم ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں وَكَيْسِرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ ان صابریں کو بشارت دیدیجئے جو مصیبت پہنچنے کے وقت یہ کہتے ہیں إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اس جملہ میں ایسا مضمون سکھلایا گیا ہے جو رنج و غم کی بنیادیں اکھاڑنے والا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی واقعہ سے صدمہ جب ہو کر آتا ہے جب وہ خلاف مرضی واقع ہوا ہو اور کوئی واقع خلاف مرضی جب ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شق تجویز کر لیں کہ یوں ہونا چاہیے جب اس کے خلاف دوسری شق ظاہر ہوتی ہے تو وہ ناگوار اور خلاف مرضی ہوتی ہے چنانچہ کسی عزیز کی موت پر ہم کو صدمہ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ یہ ہم سے کبھی جدا نہ ہو ہمیشہ پاس ہی رہے حق تعالیٰ نے انا للہ میں تجویز کا استیصال کر دیا ہے فرماتے ہیں کہ تم کو یہ مضمون پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہم خدا کی ملک ہیں خدا تعالیٰ ہمارے مالک ہیں اور ہم ان کے مملوک ہیں اور مملوک کی ہر چیز مالک کی ہوا کرتی ہے تو ہماری چیز بھی خدا ہی کی ملک ہے اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلیہ یہ ملا لو کہ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے غلام کو کسی تجویز کا حق نہیں۔ جب تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے تو ہمارا کسی عزیز کی مفارقت پر اس لئے غم کرنا کہ ہم نے اس کے متعلق یہ تجویز کر رکھا تھا کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہے بڑی غلطی ہے آپ تجویز کرنے والے ہوتے کون ہیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ گھر کی مالکہ نے الماری میں برتنوں کو ایک خاص ترکیب سے رکھ دیا ہو جو ماما کی ترکیب کے خلاف ہے مثلاً مالکہ نے نیچے کے برتنوں کو اوپر رکھ دیا اور اوپر والوں کو نیچے رکھ دیا اب ماما اس ترکیب کو دیکھ کر نالہ و شیون کرنے لگے کہ ہائے میری تجویز کے خلاف کیوں ہوا۔ تو بتلائیے آپ اس کو احمق کہیں گے یا نہیں یقیناً ہر شخص اسے پاگل کہے گا آخر کیوں۔ اسی وجہ سے تاکہ تجویز کا حق مالکہ کو ہے ماما کو کسی تجویز کا حق نہیں پھر حیرت ہے کہ آپ کی ادنیٰ سی ملک تو ایسی ہو کہ اس کے

سامنے دوسروں کا حق باطل ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی حقیقی ملک کے سامنے آپ کی تجویز باطل نہ ہو یقیناً اگر خدا تعالیٰ کو مالک حقیقی سمجھا جاتا ہے تو آپ کو اور کسی کو تجویز کا حق نہ ہونا چاہیے پس سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ نے عالم کے دو درجے بنائے ہیں۔ آسمان اور زمین جیسے الماری کے دو درجے اور نیچے ہوتے ہیں جس میں انھوں نے بعض ارواح کو اوپر کے درجہ میں رکھا ہے۔ یعنی آسمان میں۔ اور بعض کو نیچے کے درجہ میں رکھا ہے یعنی زمین میں پھرو کبھی اس ترتیب کو بدل کر اوپر کی روحوں کو نیچے بھیج دیتے ہیں۔ اور نیچے کی روحوں کو اوپر رکھ دیتے ہیں اور وہ مالک ہیں ان کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے۔ اس میں ہم غلاموں کا اس لئے نالہ و شیون کرنا کہ ہائے ہماری تجویز کے خلاف کیوں کیا گیا حاکم ہے خوب سمجھ لو کہ انتقال کی حقیقت بالکل ایسی ہی ہے جیسے الماری کے ایک تختہ کے برتنوں کو نیچے سے اوپر کر دیا جائے اور اوپر سے نیچے کر دیا جائے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں آدمی مر کر بالکل معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ دنیا سے جو کہ نیچے کے تختہ ہے آخرت میں پہنچ جاتا ہے۔ جو اوپر کا تختہ ہے (اور یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مردہ کو مٹی میں گاڑ دیا جاتا ہے اور اس سے شاید کسی کو اس پر شبہ ہو کہ آخرت میں پہنچنے کو اوپر کے تختہ پر جانا کیسے کہا گیا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو نہیں گاڑا جاتا بلکہ ایک بے جان لاشہ اور جہاد محض کو گاڑا جاتا ہے وہ آدمی تھوڑا ہی ہے وہ تو صورت آدمی ہے کیونکہ آدمی اصل میں روح کا نام ہے اور روح کو مٹی میں نہیں گاڑا جاتا بلکہ اس کو اوپر بلا لیا جاتا ہے۔ اور یہ جو روایات میں آتا ہے کہ پھر روح کو جسم میں واپس کیا جاتا ہے تو یہ واپسی عالم برزخ میں ہوتی ہے اس گڑھے میں نہیں ہوتی۔ قبر حقیقی عالم برزخ ہے جو دنیا و آخرت کے درمیان ہے اور یہ قبر جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے اسی عالم برزخ سے ایک قسم کا تعلق رکھتی ہے اس کی حقیقت نہیں ۱۲ جامع، پس حق تعالیٰ اپنی مسلوک چیزوں میں تصرف مارا نہ کرتے رہتے ہیں کبھی کسی کو نیچے بھیج دیا کبھی کسی کو اوپر بلا لیا مگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ نہیں سب نیچے ہی رہیں بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر حق تعالیٰ اس کے جواب میں یہ تجویز فرمائیں کہ اچھا پھر ہم بھی اوپر کی روحوں میں بھیجے تو پھر کیا ہوگا، بس یہ ہوگا کہ سب کے سب اوت نیوت رہ جائیں گے کسی کے بھی اولاد نہ ہوگی مگر آپ کو

اس پر بھی چین نہیں اگر کسی کے اولاد نہ ہو تو وہ اولاد کے لئے ایسی گرد چھانتا ہے جس کی حد نہیں یوں تمنا کرتا ہے کہ کچھ ہو جائے چاہے چوہے کا بچہ ہی ہو جائے۔ بس آپ کی تجویز کا حاصل یہ ہے کہ اوپر کی روہیں تو نیچے آتی رہیں مگر نیچے کی روہیں اوپر نہ جائیں۔ صاحب خدا کی رحمت ہے کہ انہوں نے ہماری اس تجویز کو پورا نہیں کیا ورنہ دنیا میں رہنے کو بھی جگہ نہ ملتی سوچ لو کہ جتنے آدمی علیہ السلام کے وقت سے اس وقت تک مر چکے ہیں رب زندہ رہتے تو کہاں ٹھکانا ملتا اس وقت جو ہر شخص اپنے اپنے گھر میں چین سے گذر رہا ہے اس کا یہی تو سبب ہے کہ بہت سے آدمیوں کو حق تعالیٰ نے اوپر بلا لیا ہے۔ ورنہ اگر داد سے پر داد سے سب زندہ ہوتے تو آج گھروں میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ پھر سمجھو کہ کسی چیز کے فوت ہونے کا صدمہ جب ہوا کرتا ہے جبکہ اس کا عوض بھی نہ ملے اور اگر عوض مل جائے اور عوض بھی اصل سے زیادہ مل جائے تو غم کم ہو جاتا ہے مثلاً ایک شخص سے پیسہ لے لیا جائے اور اشرافی دیدی جائے تو اس کو پیسہ چھیننے کا غم نہ رہے گا حق تعالیٰ نے اِنَّ الشَّيْءَ دَاجِلٌ رِّبِّمِ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں اسی مضمون پر متنبہ فرمایا ہے کہ مصیبت کے وقت تم یہ سمجھا کرو کہ ہم سب خدا تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں جو رحیم و کریم اور مہربان ہیں جن کی شان یہ ہے وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ کہ تم سے جو کچھ لیتے ہیں اس کا بدلہ بھی دیدیتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کو دنیا سے بلا لیا ان کو تو آخرت میں پہنچا دیا جس میں مسلمان کے لئے دنیا سے زیادہ راحت ہے تم اپنے مردوں کے ساتھ ایسا براگمان کیوں کرتے ہو کہ خدا نخواستہ وہ جہنم میں گئے ہوں گے جب ان کا خاتمہ اسلام پر ہوا ہے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ہمارے مردے راحت میں گئے ہیں اس خیال سے صدمہ کم ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم اگر دنیا کی راحتیں ان سے چھوٹی ہوئی دیکھتے ہیں تو آخرت کی راحتیں اس سے زیادہ پیش نظر ہوں گی یہ بدلاتو ان کو ملا اور ہم کو یہ بدلہ ملا کہ عزیز کی مفارقت سے جو طبعی رنج ہوا ہے حق تعالیٰ اس پر بہت بڑا ثواب دیں گے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسلمان کا لڑکا مرتا ہے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندے کے جگر کا لڑکا جھین لیا وہ کہتے ہیں ہاں خداوند فرماتے ہیں کہ پھر میرے بندے نے کیا کہا وہ عرض کرتے ہیں

خداوند آپ کی حمد کی اور شکر کیا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کہا ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو تو آپ نے دیکھا ایک چیز لے کر حق تعالیٰ نے آپ کو کتنی بڑی چیز دی۔ آخرت میں جب حساب و کتاب ہوگا اس وقت آپ کو اس کی قدر ہوگی وہاں نہ یہ اولاد کام دے گی جس کے لئے آپ روتے ہیں نہ بیوی اور ماں کام دے گی وہاں ثواب ہی کام دے گا یَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اخِيهِ وَاُمِّهِ وَاَبِيهِ وَاَصْحَابَتِهِ وَاَبْنَيْهِ لِكُلِّ امْرٍءٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَانُ يُعْنِيهِ (جس روز آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا ان میں ہر شخص ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور کی طرف متوجہ نہ ہونے دے گا) احادیث میں مصیبت کے ثواب کی بہت تفصیل ہے اس کو دیکھنا چاہیے۔ پس اِنَّا لِلّٰهِ رَاجِعُونَ (ہم اسی طرف جانے والے ہیں) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہم سب خدا کے پاس جائیں گے اور وہاں ہم کو مصیبت کا اجر ملے گا اور جو مر گئے ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کے پاس گئے ہیں جہاں ان کو دنیا سے زیادہ راحت ہے پھر صدمہ کی کیا بات ہے۔ اسی مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے تعزیت کے طور پر عرض کیا تھا۔ جب ان کے والد حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا چنانچہ کہتا ہے ۵

اَهْبِدْ فَكُنْ بِكَ صَابِرِينَ فَاِنَّمَا صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاسِ

آپ صبر کیجئے تاکہ ہم بھی آپ کو دیکھ کر صبر کریں کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کا تابع ہے اگر بڑے بھی بے صبری کرنے لگیں تو پھر چھوٹوں کا کیا حال ہوگا۔ سبحان اللہ کیونکر صبر کی تعلیم دی ہے۔ پھر کہتا ہے ۵

خَيْرٌ مِنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهُ وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنْكَ لِلْعَبَّاسِ

یعنی آپ کے لئے وہ اجر و ثواب حضرت عباس کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے جو ان کے وصال پر صبر کرنے سے آپ کو ملیگا اور حضرت عباس کے لئے اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ بہتر ہیں۔

پس خدا تعالیٰ نے ان کو وہ جگہ دی جو ان کے لئے بہتر تھی اور آپ کو وہ چیز دی جو آپ کے لئے بہتر تھی۔ پھر غم کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بڑھ کر کسی نے تعزیت نہیں کی غرض اِنَّ اللّٰهَ وَاَنْتَا لِلّٰهِ رَاٰجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) میں دو جملے ہیں پہلے جملے میں حق تعالیٰ کی مالکیت کو ظاہر کر کے بندوں کی تجویز کا استیصال کیا گیا ہے پھر جب ہم پہلے سے کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز ہی نہ کریں گے تو کوئی واقعہ ہمارے خلاف مرضی نہ ہوگا کیونکہ خلاف مرضی ہونے کا بنا تجویز ہی تھی جب وہ نہ رہی تو اب جو کچھ بھی ہوگا خلاف مرضی نہ ہوگا دوسرے جملے میں عوض ملنے پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے استحضار سے رہا سہا غم اور بھی ہلکا ہو جائے گا کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ جس کلفت کا عوض اس سے زیادہ مل جائے اس پر رنج نہیں ہو اگر تا حزن عقلی تو ان دونوں مضمونوں کو پیش نظر کر لینے سے کبھی نہیں رہ سکتا البتہ مفارقت کا طبعی غم اس کے بعد رہ سکتا ہے سو گو طبعی غم پر مواخذہ نہیں اور نہ وہ دفعۃً زائل ہو سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کے کم کرنے کا بھی سامان کیا ہے چنانچہ اِنَّ اللّٰهَ رَاٰجِعُوْنَ (اور ہم اللہ کے پاس جانے والے ہیں) میں اس کا بھی سامان موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہم کو جو موت عزیز سے مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے تو غور کر لیا جائے کہ یہ صدمہ نفس مفارقت پر نہیں بلکہ اعتقاد مفارقت دائمہ اس کا سبب ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب یہ ہمیشہ کے واسطے ہم سے جدا ہو گیا اگر یہ خیال ذہن میں نہ جمے تو نفس مفارقت سے زیادہ صدمہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں بھی بعض دفعہ اس سے مفارقت ہوتی تھی چنانچہ کبھی ہم کو سفر پیش آتا تھا کبھی عزیز کو سفر پیش آتا تھا جس میں مہینہ دو مہینہ اور بعض دفعہ سالہا سال کی مفارقت ہوتی تھی مگر یہ اس لئے گوارا تھا کہ پھر ملاقات کی امید رہتی ہے تو اِنَّ اللّٰهَ رَاٰجِعُوْنَ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس مفارقت کو دائمی مفارقت نہ سمجھو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں جانے والے ہو جہاں یہ عزیز گیا ہے اور وہاں اس سے ملاقات ہو جائے گی پس یہ مفارقت ویسی ہی چند روزہ مفارقت ہے جیسی دنیا میں کبھی سفر وغیرہ سے پیش آیا کرتی تھی ایک دن یہ مفارقت ختم ہو کر مبدل بہ وصال ہو جائیگی۔

اور قاعدہ ہے کہ جس فراق کے بعد وصال کی یقینی امید ہو وہ زیادہ گراں نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدرآباد ایک شخص کو اپنے یہاں کسی اعلیٰ ملازمت پر بلا لیں اور اس کے بھائی کو مفارقت کا صدمہ ہو نظام اس کے صدمہ کی خبر سن کر خط لکھیں کہ گھبراؤ نہیں ہم تم کو بھی بلا لیں گے تو غور کر لیجئے کہ نظام کے اس خط سے غمگین بھائی کا صدمہ فوراً زائل ہو جائے گا یا نہیں یقیناً پہلا سنا تو ہرگز نہ رہے گا۔ البتہ اب اس فکر میں پڑ جائے گا کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں اور جب تک مفارقت ریگی اس وقت تک گن گن کر دن گزارے گا اور امید وصال میں یہ فراق کے دن خوشی سے گزار دے گا پس ہم کو بھی کسی عزیز کی وفات پر یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ مفارقت چند روزہ ہے ایک دن خدا تعالیٰ ہم کو بھی بلا لیں گے جیسا اسے بلا یا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کُلُّ اَلْیَسَارِ اِجْعُوْنَ (ہر شخص ہمارے پاس آنے والا ہے) پھر حیرت ہے کہ نظام حیدرآباد کے تو اس کہنے سے کہ ہم تم کو بھی بلا لیں گے مفارقت کا غم جاتا رہے اور خدا تعالیٰ کے فرمانے سے ہلا کا بھی نہ ہو غرض ان نصوص سے معلوم ہوا کہ فنا شریعت کا مقصود یہ ہے کہ صدمہ کے وقت ہمارے زخم پر مرہم لگا دیں چنانچہ حزن عقلی کے استیصال کا اور حزن طبعی کی تخفیف کا ہر طرح مکمل سامان کر دیا ہے مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا دل ہر وقت زخمی رہے اس لئے ایسے سامان کرتے ہیں جن سے غم تازہ ہو اور صدمہ کی یاد دہانی ہو جیسے بچہ چاہا کرتا ہے کہ زخم پر جو کھرنڈ آ گیا ہے اس کو نوچ کر کھجلاوے تاکہ مزا آوے مگر اس کا انجام یہ ہے کہ زخم بڑھ جاتا اور بعض دفعہ ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے اسی لئے اسی لئے باپ یہ چاہتا ہے کہ کھرنڈ جمار ہے تاکہ زخم جلدی اچھا ہو جائے شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ جب حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ایسی رحمت ہے کہ وہ ہمارا غمگین رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ حزن و غم کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر صدمہ بھجتے ہی کیوں ہیں پوری رحمت تو یہ ہوتی کہ صدمہ اور رنج بھجتے ہی نہ۔ جو بعد میں اس کے ازالہ کی فکر کی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ رنج اور صدمہ بھجنے میں حکمتیں ہیں اس لئے بھجتے ہیں مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس حکمت کے لئے رنج صدمہ بھیجا جاتا ہے اس حکمت کو حاصل کرو رنج



ہی کو لے کر نہ بیٹھا جاؤ جیسے استاد بچے کو طمانچہ یا قمچی اس لئے لگاتا ہے تاکہ سبق یاد کر لے  
یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ طمانچہ اور قمچی ہی کے سبق بتا لے اگر وہ سبق جلد ہی ہی یاد کر لے گا تو  
پھر استاد شفقت سے اس کو پیار کر کے گا چوٹ کی جگہ کو سہلائے گا اور اگر سبق مقصود  
کو اس نے یاد نہ کیا بلکہ مار ہی کو سبق بنا لیا تو یقیناً اب استاد کا غصہ بڑھے گا۔ اسی  
طرح یہاں سمجھو کہ یہ ناگوار واقعات ہماری تہنید اور اصلاح کے لئے بھیجے جاتے ہیں  
جن سے مقصود یہ ہے کہ ہم چوکنے ہو کر اعمال کی اصلاح کر لیں یہ مقصود نہیں کہ بس  
رات دن ناگوار واقعات ہی کا سبق رٹتے رہیں اور زخم کو نوچتے رہیں اور اس میں پڑ کر  
اصل مقصود کو بھول جائیں میں بقسم کہتا ہوں اور اس سمجھنے سے زیادہ کوئی ذریعہ تسلی کا  
نہیں کہ ناگوار واقعات میں حکمتیں ہوتی ہیں اور اہل اللہ کو مصیبت کے وقت تعین کے  
ساتھ ہر واقعہ کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے گواجمالاً اعتقاد تو سب کو ہے مگر اہل اللہ  
کو بالتعین معلوم ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ میں ہمارے واسطے یہ حکمت تھی ان کو بیماری میں  
پجوری میں اور دشمن کی ایذا میں اور ہر ناگوار معاملہ میں کھلی حکمت نظر آتی ہے واقعہ کے  
ساتھ ہی ان کے دل میں کوئی کھلتا ہے کہ یہ معاملہ اس حکمت کیلئے کیا گیا ہے۔ بس وحی  
تو نہیں آتی نہ آواز سنائی دیتی ہے باقی سب کچھ ہوتا ہے رات دن ان کے قلب پر۔  
انفال الہیہ کی حکمتیں منکشف ہوتی رہتی ہیں پھر کیا ممکن ہے کہ ان کو ناگوار واقعات سے  
عقلی ناگواری ہو ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کو مصائب میں بھی عشق محبت کی ترقی ہوتی ہے،  
حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے کیونکہ وہ اس کی حکمت اور منفعت کو کھلی آنکھوں  
دیکھتے رہتے ہیں۔ واللہ اگر کسی وقت تمام دنیا ان کی مخالفت ہو جائے جب بھی ان کی کبت  
حق تعالیٰ کے ساتھ کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی رہے گی گو خاص احباب اور بعض اقربا بھی  
ان کو چھوڑ دیں کیونکہ ان کو اس میں بھی حکمت نظر آتی ہے ایک کھلی حکمت تو یہ ہے کہ  
اس وقت عارف کی نظر مخلوق سے بالکل ہٹ جاتی ہے اور اس کا دل دنیا سے سرد ہو کر  
ہمہ تن خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس کو بجز ذات حق کے کسی سے امید نہیں رہتی  
اور دنیا کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ حقیقت وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں

۱۰ گر گریزی بر امید راحتی ہم از ابخا پیشت آید آفتی  
 ۱۱ بیچ کنجے بے دو بے دم نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست  
 ۱۲ اگر تم فرصت کی امید پر گریز کرتے ہو ممکن ہے کہ اس وقت بھی تم کو کسی آفت کا  
 سامنا ہو جائے

۱۳ رکونی گوشت بغیر دوڑ دھوپ اور دام کے نہیں سوائے تعلق مع اللہ کے آرام نہیں  
 مصائب و آرام اور احباب کی بے مردتی سے سالک کو اس حقیقت کا پورا انکشاف ہو جاتا  
 اور وہ ہمہ تن خلوت مع اللہ میں مشغول ہو جاتا ہے خلوت گاہ سے مراد یہ نہیں کہ چلہ کشی  
 کرے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کو ذات حق کے سوا کسی سے تعلق اور ربط نہ رہے جس کو  
 یہ دولت حاصل ہو جائے وہ ہر دم خلوت میں ہے گو بظاہر مخلوق کے ساتھ ہو۔ اور  
 جس کو ربط قلب باللہ حاصل نہ ہو چاہے وہ چلہ کشی بھی کرے خلوت سے محروم ہے  
 ہاں یہ دولت حاصل ہوتی ہے اول خلوت اختیار کرنے ہی سے اس لئے اہل اللہ  
 بتدی سلوک کو چند روز یا چند ماہ پوری خلوت کراتے ہیں کہ اختلاط مع المخلوق سے  
 باکل روک دیتے ہیں جیسے طبیب مسہل کے دن مریض کو خلوت کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ ہمہ  
 تن دستوں کے تصور میں مشغول رہے۔ اختلاط اور بات چیت میں مشغول ہونے سے دستوں  
 کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کا حاصل ہونا یکسوئی پر  
 موقوف ہو اس کے لئے خلوت کا حکم ضروری ہے مگر لوگ اطباء پر تو اعتراض نہیں کرتے  
 صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی میں کہتا ہوں کہ  
 بدعت وہ ہے جو دین سمجھ کر اور ثواب کے اعتقاد سے اختیار کی جائے اور اگر کسی مباح  
 کام کو جو شرعاً ممنوع نہ ہو علماً اختیار کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔ پس صوفیہ پر یہ  
 اعتراض صحیح ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ چلہ کشی کو دین سمجھ کر  
 ثواب کے اعتقاد سے اختیار کرتے ہیں بلکہ وہ تو محض علماً اس کو اختیار کرتے  
 ہیں اور یہ جواب تو علی سبیل التذلل ہے ورنہ میں کہتا ہوں کہ خلوت اور عزالت  
 گریہی کا ثبوت شریعت میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی سے پہلے

جس حرام میں عزالت اختیار کی ہے احادیث میں آتا ہے کہ آپ ہفتہ عشرہ کے لئے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر غار حرا میں رہا کرتے تھے یہی تو چلہ کشی ہے (اور گو یہ واقعہ قبل نبوت کا ہے۔ مگر حضرات صحابہ نے بعد نبوت کے اس کو نقل فرمایا ہے اور کسی نے اس پر ازکار نہیں کیا اور نہ یہ تنبیہ کی کہ یہ صورت اب ممنوع ہے لہذا تقریر صحابہ سے اس کا شرعاً مستحسن ہونا ثابت ہو گیا اور اگر غور کیا جائے تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تقریر ہے کیونکہ اس واقعہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے اور غالب یہ ہے کہ انہوں نے آپ سے سکر بیان کیا ہے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فعل کو بلا ازکار کے بیان فرمایا تو اس پر تقریر نبوی بھی پائی گئی نیز یہ تو آپ کو معلوم تھا کہ میرے اس فعل کا سب کو علم ہے اس پر بھی آپ نے نکیر نہیں فرمایا یقینی تقریر ہے (جامع) اور بعد میں ایسی خلوت اس لئے اختیار نہیں فرمائی کہ پھر ضرورت نہ رہی مگر بعد میں خلوت طویلہ کی ضرورت نہ رہی تھی مطلق خلوت کی کالمین کو بھی ضرورت رہتی ہے حق تعالیٰ نے نبوت کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص وقت خلوت مع الحق کے لئے مقرر کرنے کا حکم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے **وَإِذَا فَرَغْتَ، فَأَنْصَبْ وَرَأَىٰ رَبَّكَ فَارْغَبْ** کہ جب آپ (تبلیغ احکام وغیرہ سے) فارغ ہو جایا کریں تو (عبادت میں) محنت کیا کریں اور (اس وقت) صرف اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو کریں یعنی گو آپ ہر وقت عبادت ہی میں رہتے ہیں اور تبلیغ وغیرہ میں بھی آپ کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف رہتی ہے مگر وہ توجہ بواسطہ ہے جس میں کسی قدر مخلوق کی طرف بھی التفات ہوتا ہے (گو وہ درجہ مرآة میں ہی ہو مگر توجہ دوسری طرف ہے تو) اس کام فارغ ہو کر ایک وقت عبادت کا ایسا مقرر کیجئے جس میں بجز ذات حق کے کسی طرف مطلق التفات نہ ہو **وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ** میں جار مجرور کو فعل سے مقدم کرنا مفید ہے اس لئے اس سے یہ مضمون مستفاد ہوا کہ اس وقت خدا ہی کی طرف راغب رہیں اور کسی طرف التفات نہ ہو ایک مقام پر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقت خلوت کی تعیین بھی فرمادی ہے کہ وہ کون سا وقت ہونا چاہیے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ **يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ مَثَلُ قَوْمِ اللَّيْلِ إِلَّا قَلِيلًا يَنْصَفُونَ**

أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا إِنَّا سَنُلْقِيْكَ عَلَيْكَ  
 قَوْلًا تَقِيْلًا رَاتٍ نَّاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَسَدٌ وَطَاءٌ وَأَقْوَمٌ قِيْلًا رَاتٍ لَكَ فِي النَّهَارِ  
 سَبْحًا طَوِيْلًا وَادُّ كُرْسُومًا رَبِّكَ وَتَبِمَثَلِ النَّبِيِّ تَبْتِيْلًا رَاتٍ رَجْمٌ :- اے کپڑوں  
 میں پسٹنے والے رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف یا اس نصف سے کسی قدر  
 کم کر دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں بیشک  
 رات کا اٹھنا خوب مؤثر ہے کچلنے میں اور بات خوب نکلتی ہے بیشک تم کو دن میں بہت  
 کام رہتا ہے اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان آیات میں حق تعالیٰ نے رات کا آخری حصہ خلوت کے لئے  
 مقرر فرمایا ہے خواہ نصف اخیر ہو خواہ ثلث اخیر یا اس سے بھی کم و بیش اور اس کی وجہ  
 یہ بتلائی ہے کہ آپ کو دن میں بہت کام رہتا ہے اس میں خلوت کاملہ کا موقع نہیں مل  
 سکتا۔ اس لئے رات کو اٹھ کر تلاوت قرآن مع الترتیل اور ذکر اللہ میں مشغول ہوا کیجئے اور  
 اس میں تیل کامل یعنی پوری یکسوئی کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ پھر درمیان میں اس وقت کی  
 فضیلت بھی بیان فرمائی ہے کہ رات کے اس حصہ میں عبادت کرنے سے نفس پر مجاہدہ  
 کامل ہوتا ہے۔ اور زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ ٹھیک ٹھیک ادا ہوتی ہے یعنی  
 زبان و قلب دونوں متوافق ہوتے ہیں (میں کہتا ہوں کہ ان آیات سے صوفیہ کی  
 چند عادات کی اصل نکلتی ہے اور وہ عادات یہ ہیں۔ (۱) طالبین کے لئے ہر ایک کے  
 مناسب کوئی طریقہ ذکر متعین کر دینا۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے  
 تہجد کی نماز میں تلاوت قرآن مع الترتیل اور اس کے بعد ذکر اللہ کو متعین فرمایا ہے۔  
 إِنَّ الْأَصْلَ فِي الْكَلَامِ التَّاسِيْسُ فَيَكُونُ ذِكْرِي قَوْلِي وَادُّ كُرْسُومًا رَبِّكَ غَيْرُ  
 تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ (اس لئے اصل کلام میں تاسیس ہے اس لئے ذکر وادُّ كُرْسُومًا رَبِّكَ  
 میں تلاوت قرآن کے علاوہ) (۲) طالبین کے لئے وقت ذکر متعین کر دینا (۳) اور اس  
 وقت میں فرصت و فراغ کی رعایت کرنا (۴) طالبین کو ذکر میں یکسوئی کی تاکید کرنا اور  
 دراصل تعین ذکر و تعین وقت و فراغ و غیرہ اسی یکسوئی حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ کیونکہ

شیخ اگر کوئی ذکر متعین نہ کرے تو طالب کا ذہن مختلف اذکار کی طرف چلیگا کہ یہ کروں یا وہ کروں ایسے ہی کسی کو دو تین وقت فرصت کے ملتے ہوں تو اس کو ان میں بھی یہ تردد رہے گا کہ کونسا وقت نہ زیادہ بہتر ہے کس کو ذکر کر کے لئے خاص کروں شیخ کی تعیین کے بعد یہ تردد زائل ہو جاتے ہیں اور ذکر میں یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے جو لوگ معمولات صوفیہ پر جلدی سے بدعت کا الزام لگا دیتے ہیں ان کو قرآن و حدیث میں کافی غور کرنے کے بعد زبان سے بات نہ کہنا چاہیے۔ اگر کامل غور و خوض سے کام لیا جائے تو محققین صوفیہ کے تمام معمولات و احوال کی اصل قرآن و حدیث سے مل جائے گی جس کی دلیل حضرت حکیم الامت کا رسالہ حقیقۃ الطریقہ اور رسالہ مسائل السلوک ہے اور ایک رسالہ التشریف جدید تصنیف ہوا ہے جس میں احادیث کثیرہ سے محققین طریق سے اصول و فروع کی تائید کی گئی ہے باقی جہد صوفیہ کی رسوم کا کوئی ذمہ دار نہیں نہ ان کی تائید ہم کو مطلوب ہے (۱۲ جامع) جب حضور سلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک خاص وقت میں خلوت کی ضرورت تھی تو اور تو کس شمار میں ہیں آپ سے زیادہ کون کامل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اہل اللہ ہمیشہ ایک خاص وقت خلوت کا مقرر فرماتے ہیں جس میں سوائے حضرت حق کے کسی طرف توجہ نہ ہو اور یہ حل ہو ۵

دہ رائے کہ داری دل درو بند  
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند  
(جس محبوب سے تمھارا دل تعلق ہو جائے تو پھر تمام جہان سے آنکھ بند کر لو)  
اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ۵

سنت سے سنا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر وقت اشراق تک مراقبہ میں مشغول رہتے تھے اور یہی طریقہ حضرت مرشدی سید مولانا خلیل احمد صفا دامت برکاتہم کا ہے اور حضرت سیدی حکیم الامت دام مجدیم علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر جنگل کی طرف تہنا تشریف لے جاتے ہیں جس میں کامل خلوت کے ساتھ مشغول ذکر رہتے ہیں۔ ایک بار فرمایا کہ مجھے تو حق تعالیٰ اس وقت میں یعنی سیر صحرا ہی میں بہت کچھ عطا فرمادیتے ہیں ۱۲ جامع

بفراغ دل زمانے نظر سے بجا رہے۔ یہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے  
 ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار و گیر شاہی سے بہتر ہے۔  
 فراغ دل کے ساتھ تھوڑی دیر متوجہ ہو جاتا بھی بہت بڑی دولت ہے اس لئے ساکین  
 مستبجین کو بھی ایک وقت خاص مقرر کرنا چاہیے خواہ دن پندرہ ہی منٹ ہو جس میں  
 غیر کا خیال بالکل نہ آوے۔ بلکہ اپنا خیال بھی نہ آوے کیونکہ توجہ الی اللہ کے وقت اپنا  
 خیال بھی غیر ہے اسی کو حضرت قلندر فرماتے ہیں ۷

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دھم

گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دھم

(یعنی مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا چہرہ انور نہ دیکھنے دوں)

اور ان کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سُننے دوں)

مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی طرف متوجہ ہونے کے وقت آنکھ اور کان سب کو معطل  
 کر دیتا ہوں جملہ اعضا سے بے خبر ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں اور اس  
 کے لئے سب سے اچھا وقت تہجد کا ہے اہل اللہ نے ہمیشہ تہجد کا اہتمام کیا ہے حضرت  
 رات کی بہت ہی قدر کرتے ہیں آجکل عام لوگ شب قدر کا تو اہتمام کرتے ہیں اور  
 راتوں کا نہیں کرتے مگر وہ حضرات ہر رات کو شب قدر ہی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ۷

اے خواجہ چہ پڑسی ز شب قدر نشانی

ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

(اے صاحب تم شب قدر کی نشانی کیا دریافت کرتے ہر رات شب قدر ہے اگر قدر جانو)

ادریات یہ ہے کہ شب قدر کی فضیلت کا اصل سبب کیا ہے اس کو دیکھنا چاہیے احادیث  
 سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اس رات میں غروب آفتاب سے طلوع فجر تک اہل عالم  
 پر توجہ خاص فرماتے ہیں سو وہ توجہ خاص ہر رات میں ہوتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ  
 شب قدر میں تمام رات اور اول درجہ میں ہوتی ہے اور بقیہ راتوں میں نصف و ثلث  
 اخیر میں اور دوسرے درجہ میں ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کی قلیل توجہ بھی بڑی دولت ہے

کما قال تعالیٰ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ وَصَرَ حُوا فِيهَا لِكُونَ التَّنْكِيرُ لِلتَّقْلِيلِ  
 (حق تعالیٰ کی تھوڑی سی توجہ بھی بہت بڑی ہے تصریح کی ہے کہ رضوان کا نکرہ لانا تقلیل کیلئے ہے)  
 گو کثیر توجہ اس سے بھی بڑی ہے لیکن قابل قدر تو دونوں ہیں۔ اس لئے اہل الشہرات  
 کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ہاں شب قدر کی اوروں سے زیادہ قدر کرتے ہیں کہ اس میں وہ  
 دولت قابل قدر اور زیادہ ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہ ہونا چاہیے کہ اور راتوں کی  
 بے قدری کی جائے لیکن اگر کسی سے بوجہ کثرت مشاغل کے رات کو اٹھنے کا اہتمام نہ ہو سکے  
 تو وہ دن میں یا اول شب میں کوئی وقت خلوت کا مقرر کر لے (خواہ بعد نماز فجر یا بعد  
 عصر یا بعد مغرب یا بعد عشاء یا اور جس وقت میں جس کو فرصت ہو ۱۲) یہ مضمون اس شعر  
 کی شرح میں یہاں تک پہنچ گیا۔ ع

جز بخلوت گاہ حق آرام نیست (سوائے تعلق مع اللہ آرام نہیں ہے)

اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ مصائب و آلام میں حکمتیں ہیں جن کو اہل الشہرہ کے ساتھ  
 سمجھ جاتے ہیں پس اب یہ اشکال رفع ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو ازالہ حزن و تخفیف غم کا  
 اس قدر اہتمام ہے تو اول ہی غم کیوں دیا تھا۔ میں نے بتلا دیا کہ انھوں نے بعض حکمتوں کی  
 وجہ سے ہم کو غم دیا ہے اور مقصود حق یہ ہے کہ ہم ان حکمتوں کو سمجھ کر ان کے مقتضایا پر عمل کریں  
 نہ یہ کہ اسی غم کا سبق پڑھتے رہیں اور اسی کو لے کر بیٹھ جائیں جیسا کہ رسوم محرم میں لوگوں  
 نے یہی طرز اختیار کیا ہے پس محرم میں جو لوگ شہادت نامے پڑھتے ہیں یہ مقصود حق کے  
 بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں تجدید غم ہے اور حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ واقف غم  
 سے سبق حاصل کر کے پھر اس کو کم کیا جائے نہ یہ کہ ہر سال تازہ کیا جائے اور سبق حاصل  
 کرنے کے لئے اس کی اجمالی یاد گو بلا قصد ہو کافی ہے جس میں نہ تفصیل واقعات پڑھنے  
 کی ضرورت ہے نہ ماہ محرم کی تخصیص کی ضرورت ہے نہ کسی پر اظہار غم کی ضرورت ہے نہ  
 سامان اظہار کی ضرورت ہے اور اجمالی قصد سب کو معلوم ہے کہ حضرت امام مع اپنے  
 خاندان کے میدان کر بلا میں یزید کی جماعت کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے اور سب  
 یہ تھا کہ آپ بوجہ فسق یزید کے اس کی بیعت قبول نہ فرماتے تھے اور جماعت یزید آپ کو

بیعت پر مجبور کرتی تھی۔ آپ کے نزدیک یزید کو خلافت سے معزول کرنا واجب تھا۔ اسی کا سامان کرنے کے لئے آپ کو فوج جارہے تھے کہ وہاں جماعت یزید کا مقابلہ ہو گیا اور جن لوگوں نے امداد کا وعدہ کیا تھا وہ سب اپنی بات سے پھر گئے آپ اپنی بات پر جسے رہے آخر کار آپ کو شہادت نصیب ہوئی۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ دین کے کام میں اگر ایک شخص اپنے نزدیک حق پر ہو تو اسے کسی کی مخالفت کا خوف نہ کرنا چاہیے۔ چاہے سارے مسلمان اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور کچھ لوگ جان و آبرو کے بھی دریغ ہو جائیں دین کے مقابلہ میں اس کی پروا نہ کرنا چاہیے آخر موت ایک دن آئے ہی گی پھر دین پر جم کر آجائے تو اس سے کیا بہتر ہے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق کا مدار کثرت رائے پر نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت شخص واحد ہی کی رائے حق پر ہو۔ چنانچہ جس وقت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت یزید سے انکار کیا ہے اس وقت تمام صحابہ اور تابعین کی رائے ان کے خلاف تھی۔ سب نے یزید کی بیعت کو قبول کر لیا تھا۔ اور اکثر نے امام حسین کو ارادہ خروج سے منع بھی فرمایا اور خیر خواہانہ نصیحت بھی کی تھی۔ مگر حضرت امام چونکہ اپنی رائے کو انشراح صدر کے ساتھ صحیح سمجھے ہوئے تھے اس سے نہ ہٹے اور اسی پر جان دیدی۔ کیا آج کسی کا منہ ہے جو یوں کہہ سکے کہ امام کی رائے غلط تھی کیونکہ کثرت رائے ان کے خلاف تھی یہ کثرت رائے کی شاخ آجکل ہی نکلی ہے سلف میں بجز صورت اجماع کے جس میں سب کا اتفاق ضروری ہے محض کثرت کا کوئی اعتبار نہ تھا چنانچہ مسائل فقہیہ میں بکثرت ایسے مسائل موجود ہیں جن میں ایک امام تمام عالم سے تفرّد کرتا ہے اور کوئی اس کی رائے کو کثرت رائے کے خلاف ہونے کی وجہ سے غلط نہیں کہتا۔ اگر کوئی اس کا رد بھی کرتا ہے تو جواب میں احادیث یا نصوص پیش کرتا ہے محض کثرت رائے کی آڑ کوئی نہیں پکڑتا۔ پھر مخالفین کی جواب میں وہ متفرد بھی احادیث و نصوص پیش کر دیتا ہے اور اس کے مقلد یہ دیکھ کر کہ ہمارے امام کے پاس بھی اپنی رائے کی ثبوت یہ نصوص شرعیہ موجود ہیں اس کی تنہا رائے کو قبول کر رہے ہیں اور اس کے موافق عمل کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ حنفیہ کے نزدیک قضاء، قاضی ظاہر اور باطناً نافذ ہے جو تمام ائمہ



مذاہب کے خلاف ہے۔ دارالحرب میں حربی کافر کے ساتھ معاملہ رہا جائز ہے جس میں جسد ائمہ کا حنیفہ سے خلاف ہے اگر تفرّد دلیل غلط ہے اور کثرت رائے دلیل صواب ہے تو ان مسائل میں آپ نے امام ابوحنیفہ کی تقلید کو کیوں نہیں ترک کر دیا (اگر واقعہ امام حسینؑ میں کوئی یہ کہے کہ اس وقت بھی بہت لوگ امام کی رائے سے موافق تھے مگر خوف کی وجہ سے موافقت ظاہر کرتے تھے سوا دل تو یہ غلط ہے کیونکہ حضرات صحابہ و تابعین کی شان یہ ہے لَا يَخَافُونَ فِي اللَّهِ لَوْمَةً لَّائِيَةً) ملامت کرنے والوں کی ملامت سے دین کے بارہ میں نہیں ڈرتے) وہ اظہار حق میں کسی سے کیا ڈرتے امام کی شہادت کے بعد یزید کے منہ پر ایک صحابی نے ایسی کوری کوری سستانی تھی کہ یزید ہونٹ چاٹتا رہ گیا تھا۔ کیا ان حضرات پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خوف کی وجہ سے امام کا ساتھ نہ دیا۔ نہیں بلکہ ان کو وہ حقیقت امام کی رائے ہی سے اختلاف تھا اور اگر مان لیا جائے کہ خوف کی وجہ سے صحابہ و تابعین نے ساتھ نہیں دیا تھا تو اس سے ان لوگوں کو پوری سند ملتی ہے جن کو آپ آجکل ڈرپوک کہتے ہیں اور یہ مشہور کرتے ہیں کہ یہ جمہور کے ساتھ خوف کی وجہ سے شریک نہیں ہوتے وہ آپ کے اس الزام کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر کے ان صحابہ کے طرز عمل کو دلیل میں پیش کر دیں گے جنھوں نے آپ کے نزدیک خوف کی وجہ سے ایک امر واجب میں امام حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا تھا۔

نیز وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم جو ہم کو منفرد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ ہماری رائے کے ساتھ بہت علماء کو موافقت ہے جو خوف عوام و لعن و طعن جبلا کے خوف سے اپنی موافقت ظاہر نہیں کرتے جیسا کہ صحابہ و تابعین کے خوف کی وجہ سے امام کی موافقت ظاہر نہ کی تھی۔ اور جو علماء تمہارے ساتھ ہیں ان میں بھی بعض افراد دل سے ہماری رائے کو صحیح جانتے ہیں مگر خوف یا طمع کی وجہ سے تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اور یہ محض الزامی جواب نہیں بلکہ اگر تفتیش و انصاف سے کام لیا جائے تو اس کا صدق واضح ہو جائے گا۔

(بقیہ ان شاء اللہ تعالیٰ آمین)

غرض آپ امام حسین رضی اللہ عنہ کو متفرد مانیں یا غیر متفرد ان کا دعویٰ ہر طرح سیدھا ہے۔  
جامع (ایک سبق اس واقعہ سے یہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ کابلیں کا بھی امتحان  
ہوا کرتا ہے۔ اور ان کو بھی تکلیف پیش آیا کرتی ہے جس سے ان کے درجات بلند ہوتے  
ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون دلی ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور  
حد درجہ محبوب تھے جن کے بارہ میں پیشین گوئی ہے۔ سَيِّدَ اشْبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ (اہل  
جنت کے جوانوں کے سردار ہیں) مگر دیکھ لیجئے ان کو بھی کیسا امتحان و ابتلا پیش آیا اور گو کوئی  
شخص اپنے محبوب کو تکلیف نہیں دے سکتا مگر درحقیقت اہل اللہ کے لئے ان واقعات میں  
کلفت جسمانی سے زیادہ روحانی راحت و لذت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے یہ کلفت  
جسمانی کچھ نہیں معلوم ہوتی اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم چاہو تو یہ جسمانی کلفت تم کو نہ دی  
جائے تو وہ کبھی اس کو گوارا نہ کریں گے اور یوں کہیں گے

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سلامت ہو

کہ اس پر آپ خنجر آزمائیں)

صاحب محبت تو وہ چیز ہے کہ اس میں بعض لوگ ادنیٰ ادنیٰ محبوبوں کے لئے خوشی  
کے ساتھ جان فدا کر دیتے ہیں حالانکہ جان دینے کے بعد وہ محبوب ان کو اس جان نثاری  
کا کچھ صلہ بھی نہیں دے سکتا۔ تو پھر یہ کیونکر خیال میں آ سکتا ہے کہ عاشقان الہی کو جان  
دینے میں کچھ بھی روحانی پریشانی ہوتی ہوگی جبکہ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم رضائے محبوب  
کے لئے جان دے رہے ہیں اور یہ بھی یقین ہے کہ مرنے کے بعد وہ اس کا صلہ بھی بہت کچھ دیں گے  
شہادت کا صلہ اتنا عظیم الشان ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت کے رہنے والوں  
میں کوئی ایسا نہیں جو دوبارہ دنیا میں آنا چاہے سوا شہید کے کہ وہ شہادت کا صلہ دیکھ کر تمنا کریگا  
کہ میں دوبارہ دنیا میں جاؤں اور پھر شہید ہوں پھر جاؤں اور پھر شہید ہوں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرنے کے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

جیسے کامل فرماتے ہیں وَ دَوِّتُ أَنْ أُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ أُحْيَى ثُمَّ أُقْتَلَ ثُمَّ أُحْيَى  
 ثُمَّ أُقْتَلَ ثُمَّ أُحْيَى۔ رپتد کرتا ہوں اس بات کو کہ اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں  
 پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں  
 صاحبو شہادت میں کچھ تو لذت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں بار بار اس کی تمنا فرماتے  
 ہیں آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیا گذرتی ہوگی جو یہ بات آپ کی زبان پر آئی درنہ  
 آپ تو بڑے صنایط تھے (شہید جب جان دینے کے لئے بڑھتا ہے تو زبان حال سے حق تعالیٰ  
 کی جناب میں یوں کہتا بجاتا ہے ۔

بجرم عشق تو ام می کشند و غوغا ییست

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ییست

(یعنی وہ محبوب حقیقی سے عرض کرتا ہے کہ لوگ آپ کے عشق و جرم میں مجھے قتل کر رہے  
 ہیں۔ ذرا آپ بھی ایک نظر یہ تماشا دیکھ لیجئے۔)

پھر چونکہ مسلمان کو یقین ہے کہ حق تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ تو محبوب کے سامنے اس  
 کے نام پر جان دینے کی اسے کیا کچھ لذت آتی ہوگی اس کو وہی جان سکتا ہے (جامع)  
 شہادت کی فضیلت کے لئے کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ شہید کے رب گناہ معاف  
 ہو جاتے ہیں اور وہ پاک صاف ہو کر خدا کی جناب میں جاتا ہے تو جس کو خدا سے محبت  
 و عشق ہو گا وہ کیونکر اس کا مستحق نہ ہوگا۔ حقیقی شہادت کی تمنا ہر قلب مسلم میں ہے اور  
 جس کے دل میں اس کی آرزو نہیں اس کے ایمان میں نقص ہے۔ مگر ہاں کسی موقع پر پیش قدمی  
 کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ موقعہ شہادت حقیقی کا موقعہ ہے جس میں شرعاً جان دینا  
 مطلوب ہے اور اگر شرعاً کسی موقعہ پر شہادت کے شہادت ہونے میں شبہ ہو جاوے  
 وہاں عارف کبھی جان نہ دے گا۔ بلکہ ایسے موقعہ پر وہ اپنی جان کی حفاظت کرے گا۔ گو  
 اس صورت میں لوگ اس کو ملامت بھی کریں بزدل اور ڈرپوک جو چاہیں کہیں اس کی  
 کچھ پروا نہ کرے گا کیونکہ وہ حقیقی شہادت کا طالب ہے جس سے سوائے رضائے حق  
 و اعلائے کلمۃ اللہ کے کچھ مقصود نہ ہو۔ پھر جہاں رضائے حق حاصل ہونے ہی میں شبہ ہو

وہاں محض مخلوق کی نظریں بہا در اور جبری بننے کے لئے وہ کبھی اقدام نہ کرے گا کیونکہ اس کا مشروب تو ہے۔

گرچہ بدنامی است نزد عاقلان

ماننی خواہیم تنگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے ہم تنگ و نام کے خواہشمند نہیں ہیں)

اور وہ یوں کہتا ہے۔

عاشق بدنام کو پروائے تنگ و نام کیا

اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

عاشق کی ناکامی محرومی کی ناکامی نہیں ہوتی بلکہ طلب ترقی کی وجہ سے وہ اپنے کو ناکام

و نامراد سمجھتا رہتا ہے وہ کسی حالت پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ جتنا وصال سے کامیاب ہوتا

ہے اس سے آگے ترقی کا طالب ہوتا ہے اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اس لئے ناکام

کہہ دیا اور اس طریق میں یہ ناکامی ہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اپنے کو کامیاب

سمجھ کر کسی خاص حالت پر قناعت کرے اور طلب کی پیاس کو بجھا دے وہ اس

طریق میں ناکام ہے۔ خوب سمجھ لو۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت امام کے واقعہ میں جو سبق ہمارے

لئے ہے اس کے واسطے گاہے گاہے اجمالی یاد کافی ہے تفصیلی واقعات کی کچھ ضرورت

نہیں اور اجمالی واقعہ سے کوئی مسلمان نا آشنا نہیں۔ پھر اس کے لئے خاص طور پر

ہر سال مجلسیں منعقد کرنا اور اس میں اظہار غم کے طور پر یہ واقعہ دل خراش پڑھنا

اور مسلمانوں کے دلوں کو تازہ غم دے کر زخمی کرنا اور شہدار پر نوحہ و ماتم کرنا بالکل

خلاف عقل و خلاف مقصود ہے حق ہے۔

عہ لطیفہ :- ایک سرحدی کابلی محرم کے زمانہ میں ہندوستان آیا تو اس نے تعزیر و علم وغیرہ

نکلے ہوئے دیکھے اور اس کے پیچھے کچھ لوگوں کو ماتم و نوحہ کرتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ کیا قصہ

ہے۔ لوگوں نے کہا تم کو معلوم نہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اس مہینہ میں شہید ہوئے ہیں۔

صاحبو! میں کہہ چکا ہوں کہ صدمہ اس واقعہ میں ہوتا ہے جو بتلا کے خلاف مرضی ہو تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ واقعہ ان حضرات کے خلاف مرضی ہوا اور وہ شہادت کے طالب نہ تھے ہرگز نہیں۔ تو جب وہ شہادت کے طالب تھے تو اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ اس کے لئے نوہ و ماتم کیسا۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان حضرات شہدار کو وہ مراتب و منازل عطا نہ فرماتے جو اب حاصل ہوئے۔ کیا آپ کے نزدیک ان حضرات کو اس واقعے سے اجر نہیں ملا۔ اور بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر آپ کے سلف دین کے لئے ایسی جان نثاری اور جانفروشی نہ کرتے تو آج آپ کو اس کے لئے ہمت کیونکر ہوتی اور اگر یہ نظیریں آپ کے سامنے نہ ہوتیں تو ایسے مواقع میں دین کے لئے جان دینے کو تمہارے دل کیسے بڑھتے۔ قاعدہ ہے کہ نظائر سے انسان کی ہمت بلند ہوتی ہے اور سلف کے کارناموں کو یاد کر کے پچھلوں کو ان کے اتباع کا شوق ہوتا ہے اگر اس واقعہ کا ظہور نہ ہوتا تو یہ سبق ہم کو کیسے حاصل ہوتا جب اس واقعہ میں ہمارے لئے بھی حکمت ہے اور ان حضرات کا بھی یہ مطلوب تھا اور ان کو اس پر اجر بھی بہت بڑا ملا ہے۔ تو پھر کیا ہر سال اس قدر اظہارِ غم جو آجکل کیا جا رہا ہے منتشر حق کے خلاف نہ ہوگا۔

شائد اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ پھر کیا اس واقعہ کے وقوع کے وقت بھی غم نہ کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ بات تو اس وقت بھی تھی۔ یہ واقعہ تو اس وقت بھی ان کے لئے باعثِ اجر تھا اور شہادت ان کی مطلوب تھی اور اس وقت بھی ہمارے لئے اس میں حکمت تھی۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس وقت کا غم کرنا غیر اختیاری ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵ کا) سرحدی نے کہا وہ تو تیرہ سو برس پہلے شہید ہو چکے ہیں کیا ہندوستان میں اب خبر آئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ بہت ہی غافل ہیں کہ تیرہ سو برس کے واقعہ پر آج غم کرنے بیٹھے ہیں اور مثنوی میں ایک ایسی ہی حکایت ایک شاعر کی جو حلب میں زمانہ محرم میں آیا تھا لکھی ہے۔ واقعی مقتضائے عقل تو یہی ہے کہ مرت واقعہ کے وقت غم کیا جائے سالہا سال تک غم کو لیکر بیٹھنا بقول اس سرحدی کے غفلت ہی کی علامت ہے ۱۱ جامع

قاعدہ ہے کہ ظہور حادثہ کے وقت طبعی غم بلا اختیار ہوا کرتا ہے۔ اور امر غیر اختیاری میں انسان معذور ہے۔ لیکن جب طبعی غم کی حد گزر جائے اس کے بعد غم کو لے کر بیٹھنا یہ مذموم ہے۔ بس اب اس کی حکمتوں پر نظر کرنا چاہیے۔ اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے۔ مثلاً ایک شخص ڈاکٹر سے خود کہے کہ میرا اپریشن کر دو۔ اس کے لئے وہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اس کی خوشامد بھی کرتا ہے مگر اپریشن کے وقت اس کے منہ سے آہ اور چیخ بھی نکلتی ہے کیا آپ اس شخص کو اس آہ پر کچھ ملامت کریں گے ہرگز نہیں آخر کیوں محض اسی وجہ سے کہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔ بس اسی طرح یہاں سمجھئے کہ گو وقت وقوع بھی اس واقعہ کی حکمتیں عقلا رکی پیش نظر ہوتیں مگر اس وقت غیر اختیاری غم بھی ساتھ ساتھ ہوتا اور اس میں وہ معذور ہوتے۔ لیکن اب جو ہم رنج صدمہ ظاہر کرتے ہیں یہ عقلی غم ہے طبعی نہیں اور اس کی ممانعت ہے۔ جیسے مثال مذکور میں اپریشن ختم ہونے اور زخم کے اچھا ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اپریشن کا غم کرتا رہے اور ہر سال اس پر ماتم کیا کرے تو اس کو یقیناً سب لوگ بے وقوف کہیں گے اور اس رنج و غم میں اُسے کوئی معذور نہ کہے گا۔ طبعی رنج و غم کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پوری ہو جائے پھر طبعی رنج نہ ہوگا بلکہ عقلی ہوگا فقہاء نے نصوص شرعیہ سے اس حد کو سمجھا ہے واقعی صوفیہ اور فقہایہ دونوں فرقے حکماء امت ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں میں باہم جدال و نزاع ہے جس کی وجہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ ان دونوں جماعتوں میں غیر محقق بھی ہوتے ہیں۔ ان ناقصین میں نزاع ہوتا رہتا ہے ورنہ اگر دونوں محقق ہوں تو کبھی نزاع نہ ہو۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ تین روز کے بعد تعزیت کرنا پاس والوں کو ممنوع ہے ہاں جو لوگ باہر رہتے ہوں ان کو تین دن کے بعد بھی تعزیت کی اجازت ہے وجہ یہ ہے کہ تین دن میں طبعی غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد تعزیت کرنا اس کو بڑھاتا ہے۔ اب یاد دہانی سے غم تازہ ہوگا۔ اور شہری آدمی تین دن کے اندر اندر آسکتا ہے اس کو تین دن کے بعد تعزیت نہ کرنا چاہیے۔ ہاں مسافر کو اجازت ہے کیونکہ وہ تین دن کے اندر نہیں آسکتا تھا وہ تو بعد ہی میں پہنچے گا۔ اب اگر وہ آکر تعزیت نہ کرے تو طریقین میں بد مزگی

ہوگی صاحب واقعہ اپنے دل میں کہیگا کہ اس ظالم کو میری مصیبت سے غم ہی نہیں ہوا اس نے ایک حرف بھی تسلی کا نہ کہا اس لئے مسافر کو تین دن کے بعد بھی جب وہ آئے تعزیت کرنی چاہئے اور اس کی تعزیت سے صاحب واقعہ کا غم نہ بڑھے گا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص ضرورت کی وجہ سے اتنے دنوں کے بعد تعزیت کر رہا یہ پہلے نہ آسکتا تھا۔ فقہاء نے تین دن کی حد کو غالباً اس حدیث سے استنباط کیا ہو لا یصل المؤمن ان یتجرأ خاھا فوق ثلاثہ آیاتہ کوئی شخص اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ہجراں نہ کرے یعنی اگر کسی سے دنیوی معاملہ میں رنج و تکرار ہو گیا ہو تو تین روز تک تو بات چیت سلام کلام ترک کرنا جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں کیونکہ شارع علیہ السلام نے عادت انسانیہ سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ طبعی غم و غصہ تین دن میں کم ہو جاتا ہے اس کے بعد یہ تکلف بڑھانے سے رنج بڑھے گا۔ اگر اسباب زیادہ اختیار نہ کئے جائیں تو تین دن کے بعد رنج کا غلبہ باقی نہیں رہ سکتا تو جب تک طبعی رنج کا غلبہ تھا اس وقت تک شریعت نے بھی اس کو ترک کلام میں معذور سمجھا۔ جب غلبہ جاتا رہا اب یہ معذور نہیں۔ اب ترک کلام و سلام محض خبت نفس کی وجہ سے ہے اس کی اجازت نہیں۔ اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی رحمت فرمائی کہ تین دن تک ہجراں کی اجازت دیدی۔ اگر کوئی فلسفی ہوتا تو ایک دن کے لئے بھی ہجراں کو جائز نہ رکھتا اور یہ کہتا کہ ہجراں اتفاق و اتحاد باہمی کے خلاف ہے پس و تکرار کو جلد رفع کرنا اور فوراً صفائی کر لینا چاہئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جذبات نفس پر بڑی گہری نظر ہے۔ آپ نے تین دن تک ہجراں کی اس لئے اجازت دی کہ فوراً صفائی کرنا عادت دشوار اور نفس پر بہت گراں ہوتا ہے آپ نے ہمارے ادب پر گرانی اور دشواری ڈالنا گوارا نہیں فرمایا۔ دوسرے رنج و تکرار کے وقت چونکہ دونوں طرف نفس میں رنج و غصہ بھرا ہوگا تو فوراً صفائی کرنے سے یہ صفائی بیکار ہوگی۔ گو ظاہر میں دونوں بات چیت کرنے لگیں گے مگر دلوں میں سخت غبار ہوگا۔ اس حالت میں صفائی کرنے سے کینہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے جو غرض ہوتی یعنی اتحاد و اتفاق وہ مطلق حاصل نہ ہوگی۔ اس لئے آپ نے معاً صفائی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ تین روز تک ترک کلام و ہجراں سے دل کا غبار نکالنے کی

اجازت دیدی جب تین دن میں دل کا غبار نکل گیا اور غلبہ رنج فرو ہو گیا اب ملنے جلنے کا حکم دیا اس وقت صفائی سے نفع بھی ہوگا اور چونکہ غبار نکل چکا ہے اس لئے کینہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جذبات نفس کی جس درجہ رعایت ہے اس کی نظر نہیں مل سکتی (اور یہ حکم دنیوی رنج و تکرار کا ہے اور اگر کسی سے دینی معاملہ میں رنج ہو گیا ہو تو اس میں یہ حد نہیں بلکہ جب تک دوسرا شخص معصیت سے جو سبب ہجراں تھی تو بہ خالص نہ کرے اس وقت تک ہجراں کی اجازت ہے اور بعض مواقع میں واجب ہے ۱۲ جامع) اس حدیث سے تین دن کے بعد رنج کو لے کر بیٹھنے کی ممانعت ثابت ہوئی دوسری خرابی شہادت ناموں کے پڑھنے اور مجالس منعقد کرنے میں یہ تھی کہ اس میں اظہار غم ہے اور اظہار غم جائز نہیں اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے بعض صحابہ کو دیکھا کہ انھوں نے اپنی چادریں اتار دی ہیں اہل عرب کا لباس ازار و ردا تھا اس کو عربی میں حد کہتے ہیں مہذب لوگ قمیص بھی پہنتے تھے مگر زیادہ لوگ چادر اور لنگی ہی پہنتے تھے اس وقت القار و ردا (چادر اتارنا) غم کی علامت تھی جیسے آجکل بازو پر سیاہ کپڑا باندھنا لوگوں نے انگریزوں سے سیکھا ہے اور جو لوگ کمر پہنتے تھے وہ گریبان چاک کرتے تھے ان کے یہاں شق جیب علامت غم تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اتارے ہوئے دیکھ کر فرمایا الفعل الجاہلیۃ تاخذون اویاہل الجاہلیۃ تشبھون لقد هممت ان ادعوا علیکم دعویٰ توجعون فی غیر صورکم فاخذوا و ارددتہم و لہم یعود و الہ بعد اخرجہ ابن ماجہ کما فی المشکوۃ بسند ضعیف فیہ متروک و لکن تأیید معنایہ بحدیث لیس منا من شق الجیوب و دعایہ دعوی الجاہلیۃ ۱۲ جامع) ترجمہ - کیا تم جاہلیت کا طریقہ اختیار کرتے ہو یا اہل جاہلیت کے ساتھ مشابہت کرتے ہو۔ میرا مقصد ہوا تھا کہ تم پر ایسی بددعا کروں جس سے تمہاری صورتیں بدل جائیں اس وعید کو سکر صحابہ نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ اظہار غم ناجائز ہے حالانکہ چادر اتارنے میں کوئی زیادہ اظہار نہیں مگر آپ کو اتنا بھی ناگوار ہوا۔ پھر یہ رونا اور ماتم کرنا اور اس کے لئے



مجاس منعقد کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے جو سراپا اظہار ہے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صاحبزادہ کے واقعہ انتقال میں اَنَّا بَقْرًا اِقْلًا يَارَا بُرَا اِهْيُمُ لِمَحْرُ وُ نُؤُنَ رِمِّم تَحَارِے فراق میں اے ابراہیم غمگین ہیں، فرمانا سوا اتنا اظہار غم وقت ظہور واقعہ کے مضائقہ نہیں جس بیان اور شکایت الہی نہ ہو چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا اَلْعَيْنُ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ وَلَا نَقُولُ اَلَا مَا يَرْضَى رَبَّنَا یعنی آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں اور دل غمگین ہے مگر زبان سے وہی کہیں گے جس سے خدا راضی ہو رہا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر یہ فرمانا ہے

صَبَبْتُ عَلَى مَصَابِئِكَ لَوْ اَنَّهَا ۞ صَبَبْتُ عَلَى الْاَيَاتِ وَصِرْتَنَ كَيَالِيَا

(مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑی ہیں۔ اگر دنوں پر پڑتی تو وہ راتیں ہو جاتیں)

سوال تو بقاعدہ محدثین اس کا ثابت ہونا مشکل ہے کہ یہ اشعار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہیں (اہل سیر کی روایت ہے جس میں رطب و یابس سب بھرے ہوتے ہیں ۱۲ جامع)

دوسرے یہ غلبہ حال تھا، تیسرے اس میں کوئی شرکایت تھوڑا ہی ہے صرف صدمہ کی عظمت بتلائی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کے انتقال پر اَنَّا بَقْرًا اِقْلًا يَارَا بُرَا اِهْيُمُ لِمَحْرُ وُ نُؤُنَ رِمِّم تَحَارِے فرمایا تھا۔ رہا اس کو نظم میں فرمانا تو نظم و شعر اہل عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے ان کو نظم و نثر دونوں برابر ہیں۔ چوتھے یہ بھی تو خیال کیا جائے کہ وہ واقعی کیسا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال کیسی مصیبت عظمیٰ تھی اس وقت اگر دل پھٹ جاتا تو تعجب نہ تھا یہ بھی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا غایت تحمل ہے کہ انہوں نے دو چار باتوں ہی پر اکتفا کیا۔ پانچویں حضرات صحابہ کو انقطاع نزول وحی کا صدمہ زیادہ تھا کہ اب بار بار حق تعالیٰ کا کلام نازل نہ ہوگا۔ یہ نعمت ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔ سو مہن و فاقات پر اظہار غم نہ تھا بلکہ انقطاع برکات کا صدمہ بھی زیادہ تھا جس کو انہوں نے ظاہر کیا ہے۔

۱۳ اس پریشہ ہوتا ہے کہ کیا اس غم کا اظہار جائز ہے کیا یہ دوسرے غموں سے جن کے اظہار کی ممانعت ہے مستثنیٰ ہے (جامع)

اس کا جواب یہ ہے کہ غم دین کا ہے جو علامت ہے حب خالق کی بخلاف غم دنیا کے کہ علامت ہے حب خلق کی ۱۲ منہ

الغرض قواعد شرعیہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اظہار غم کی ممانعت ہے اس سے ان امور کا ممنوع ہونا بھی ثابت ہو گیا جو آجکل محرم میں کئے جا رہے ہیں اور جتنے قصے آجکل اس قسم کے ہوتے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ اہل مال و اہل دولت کو دراصل روپیہ خرچ کرنے اور نام پیدا کرنے کی خواہش ہوتی ہے اس کے لئے یہاں لے ڈھونڈے جاتے ہیں جو اہل دولت دنیا دار ہیں وہ تو اپنی اولاد کی بسم اللہ اور ختنہ اور شادی وغیرہ میں دل کے حوصلے نکالتے ہیں اور جو اولاد سے محروم ہیں وہ گدھے گدھیوں کی شادی کر کے حوصلے نکالتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی کی طرف ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں۔ ایک جگہ بندر بندر یا کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی اور جو اہل دولت دیندار ہیں انہوں نے دین کی صورت میں روپیہ خرچ کرنے کا بہانہ نکال لیا کسی نے مولود شریف اختیار کیا کسی نے محرم میں ماتم برہ پاکیا کسی نے گیا رھویں شریف نکالی کسی نے شب برات کا حلوا ایجاد کیا جو لوگ ربیع الاول میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر خوشی ظاہر کرتے ہیں کوئی ان سے یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی تو اسی مہینہ میں ہوئی ہے اس پر غم بھی تو ظاہر کرو، واقعی حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و وفات دونوں کو ایک مہینہ میں جمع کر کے اس حکمت کا اظہار فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو اس زمانہ میں نہ فرط غم ظاہر کرنے کا موقع بلکہ بموجب زمان ولادت ہونے کے نہ فرط سرور ظاہر کرنے کا موقع بلکہ بموجب زمان وفات ہونے کے بس جب یہ مہینہ آتا ہے تو خوشی اور غم دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں جس سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے یہ تو عوام کی حالت تھی۔ اب خواص کی سننے انہوں نے بھی اظہار شوکت و شان کے لئے بعض صورتیں نکالی ہیں مولویوں نے تو مدارس کے جلسے نکالے ہیں جن میں اکثر نام و نمود کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ کانپور میں ایک سال دو مدرسوں کا جلسہ تھا ہر ایک چاہتا تھا کہ اپنی کارروائی دوسرے سے زیادہ دکھلائے تو ایک مدرسہ والوں کے دوسرے مدرسہ کے طلبہ کو توڑ کر اپنے یہاں بلایا کہ تم ہمارے مدرسہ سے سنتا اور دستار لیتا دوسرے مدرسہ والوں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ان طلبہ کو برا بھلا کہا وہ اس ارادہ سے رک گئے تو پہلے مدرسہ والوں نے ایک طالب علم کو کسی بہانہ سے بلا کر کوٹھڑی میں بند کر دیا اور جلسہ کے وقت تک بند رکھا

تاکہ بھاگ نہ جائے اور دستار بندی کے وقت نکال کر اسے سند اور دستار دے کر اپنے مدرسہ کی طرف منسوب کر لیا پھر کہہ دیا کہ اب جاؤ جہاں چاہو۔ بھلا یہ دین ہے۔  
 واللہ بجز شہرت اور نام کے اس سے کچھ مقصود نہیں۔ پھر جلسوں میں رقمیں ایسی صرف ہوتی ہیں جو جلسہ کے لئے مخصوص نہیں ہوتیں لوگوں نے تو نہ معلوم کیا سمجھ کر چندہ دیا تھا اور یہاں وہ رقمیں جلسہ کے انتظامات میں صرف کی جاتی ہیں انھیں رقموں سے امر اور رؤسا کی بھی دعوت ہوتی ہے اور غربا کو بھی کھلایا جاتا ہے اور اس کو ہم سب کھاتے ہیں۔ اگر ان جلسوں کا منشاء محض دین ہوتا تو ان میں حدود شرعیہ کا بھی تو لحاظ ہوتا مگر کچھ نہیں ان کا منشاء بجز شہرت کے کچھ نہیں اس لئے حدود کی کچھ پروا نہیں۔ یہ تو مولویوں کی حالت تھی ختم یہ ہے کہ صوفیوں نے بھی جن کا مشرب اپنے کو مٹانا اور گننام کرنا ہے نام و نمود کی بعض صورتیں نکالی ہیں چنانچہ ہر سال جا بجاعس ہوتے ہیں جن میں چار طرف سے مدعیان تصوف کا ہجوم ہوتا ہے تاکہ لوگ جان لیں کہ عرس میں جتنے حضرات تشریف لائے ہیں یہ سب صوفی ہیں۔ پھر قوالی میں حال اور وجد سے تو اچھی طرح اپنے تصوف کو ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ ہاں ہمارے اندر بھی کچھ ہے۔ صاحبو! حقیقی صوفی کبھی ان طریقوں کو پسند نہیں کر سکتا علماء کے فتوے سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو یہ عرس وغیرہ اسباب شہرت ہونے کی وجہ سے خود طریقت کے بھی خلاف ہیں آہ اب مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب جیسے بے نفس کہاں ہیں جو شہرت و نام سے بھاگتے تھے اور اپنے کو مٹانا چاہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لباس ایسا موٹا جھوٹا ہوتا تھا کہ صورت سے کوئی نہ سمجھے کہ یہ بھی کوئی بڑے عالم یا شیخ ہیں مگر سے

نور حق ظاہر بود اندر ولی

نیک ہیں باشی اگر اہل ولی

دلی میں انوار الہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے

وہ کتنا ہی اپنے کو چھپاتے بھلا کہاں چھپ سکتے تھے پہچاننے والے پہچان ہی لیتے تھے تو پھر آپ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ جب کہیں سفر میں جاتے ساتھیوں کو نام ظاہر کرنے سے

منع فرمادیتے تھے کہ میرا نام کسی کو نہ بتلانا اگر کوئی مولانا ہی سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے تو فرماتے حافظ خورشید حسن، یہ مولانا کا تاریخی نام تھا اس لئے کذب بھی نہ ہوتا اور سائل کو پتہ بھی نہ چلتا کیونکہ یہ نام مشہور نہ تھا۔ لوگوں میں مشہور نام مولانا محمد قاسم ہی تھا۔ خورشید حسن سن کر سائل یہ سمجھتا کہ یہ کوئی اور شخص ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نہیں ہیں اور اگر کوئی پوچھتا کہ آپ کا وطن کہا ہے۔ فرماتے الہ آباد۔ بعض مخلصین کو شبہ ہوا کہ اس میں تو کذب ہو گیا تو مولانا سے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وطن الہ آباد کدھر سے ہو گیا۔ فرمایا کہ نانوتہ بھی تو خدا تعالیٰ ہی کا آباد کیا ہوا ہے تو لغتاً وہ بھی الہ آباد ہی ہے۔ مولانا تھے بڑے ذہین۔ بات بات سے ذہانت لپکتی تھی۔

غدر کے موقعہ میں مولانا نے ایک دفعہ عجیب ذہانت سے بچاؤ کیا۔ بعض لوگوں نے آپ کی شکایت کر دی تھی کہ یہ بھی غدر تھا نہ بھون میں شریک تھے تو تین روز تک آپ روپوش رہے۔ تین دن کے بعد آپ ظاہر ہو گئے۔ لوگوں نے کہا حضرت ابھی تک آپ کی تلاش جاری ہے اور وارنٹ موقوف نہیں ہوا ابھی کچھ دنوں اور چھپے رہیے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے قع پر تین ہی دن غار ثور میں روپوش رہے تھے بس سنت پر عمل کر لیا ہے اس سے زیادہ مدت تک مخفی رہنا زائد علی السنت ہے سبحان اللہ اتباع سنت اسے کہتے ہیں کہ روپوشی میں بھی اس کا لحاظ رہا کہ سنت سے زیادہ نہ ہو آجکل لوگ نوافل و تسبیحات ہی میں اتباع سنت کو منحصر سمجھتے ہیں کمال اتباع یہ ہے جو مولانا کے فعل سے ظاہر ہوا غرض تین دن کے بعد آپ علانیہ پھرتے تھے کئی مرتبہ گھر پر دوڑ آئی مگر آپ اپنی ذہانت سے بچ جاتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا چھتے کی مسجد میں تھے کسی نے مخبری کر دی اور فوراً دوڑ آگئی مولانا اس وقت جہاں بیٹھے تھے اس جگہ سے ذرا کھسک کر بیٹھ گئے۔ پولیس کے افسر نے صورت سے نہ پہچانا کہ یہی مولانا محمد قاسم ہیں کیونکہ لباس مولانا کا عالمانہ نہ ہوتا تھا عا میا نہ لباس پہنتے تھے اس نے سمجھا کہ یہ کوئی عالم نہیں معمولی آدمی ہے تو اس نے مولانا ہی سے پوچھا کہ یہاں مولانا محمد قاسم صاحب آئے تھے تو آپ نے اپنی پہلی جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ابھی تو یہیں تھے دیکھ لو۔ یہ کہہ کر اپنے

جوتے ہاتھ میں لے پولیس کے درمیان سے نکل گئے۔ بعد میں افسر پولیس کو معلوم ہوا کہ جس سے میں نے باتیں کی تھیں وہی مولانا محمد قاسم صاحب تھے وہ مولانا کی ذہانت پر بڑا حیران ہوا کہ جھوٹ بھی نہیں بولا اور صاف بچ بھی گئے۔ غرض اس ذہانت سے بچتے رہے مگر تین دن کے بعد روپوش نہیں ہوئے۔ خیر یہ تو مولانا کی ذہانت کا ایک لطیفہ تھا مجھے بتلانا یہ تھا کہ یہ حضرات شہرت سے کس درجہ بھاگتے تھے کہ صورت سے کوئی ان کو عالم یا شیخ نہ سمجھتا تھا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ رات کے وقت دیوبند سے نانوتہ جا رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر راستہ بھول گئے۔ کیونکہ رات کچھ باقی تھی تو آپ نے ایک شخص سے پوچھا کہ بھائی نانوتہ کا راستہ کدھر کو ہے اس نے کہا ارے تو کون ہے جو صبح ہی صبح نانوتہ کا نام لیتا ہے (مشہور ہے کہ صبح کو نانوتہ کا نام لینے سے دن بھر کھانا نہیں ملتا) فرمایا بھائی پھر کیا کہوں کہا پھوٹا شہر کہہ۔ آپ نے فرمایا اچھا بھائی پھوٹے شہر کا راستہ کس طرف کو ہے۔ اس نے بتلایا۔ کچھ دور چل کر پھر راستہ بھول گئے تو ایک شخص اور ملا اس سے پوچھا بھائی پھوٹے شہر کا راستہ کدھر کو ہے وہ کوئی نانوتہ کا رہنے والا تھا اس نے کہا ارے تو کون ہے جو ہمارے شہر کو پھوٹا شہر کہتا ہے۔ فرمایا پھر کیا کہوں نانوتہ کیوں نہیں کہتا فرمایا اچھا بھائی نانوتہ کا راستہ بتلا دے کہا یہ سامنے نانوتہ ہی تو ہے اس وقت مولانا نانوتہ میں پہنچ گئے تھے۔ مگر اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہ ہوا کہ میں گھر کے قریب آ گیا ہوں غرض راستہ میں جو بھی ملتا اور مولانا اس سے راستہ پوچھتے وہ بُرا بھلا ہی کہتا تھا۔ اور مولانا سب کی سنتے جا رہے تھے کسی کی بات کا بُرا نہ مانا۔ نہ کسی سے اپنا نام ظاہر کیا ورنہ اگر نام ظاہر کر دیتے تو ان اطراف کے سب لوگ آپ کو جانتے تھے نام سن کر وہ لوگ پیروں میں گر پڑتے مگر ان کو تو اس میں ہی مزا آتا تھا کہ یہ نفس ذلیل ہو۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی طلحہ رب کتابیں لے لیکر اندر چلے گئے پھر رب اپنے جوتے اٹھانے آئے تو دیکھا کہ مولانا نے ایک چادرہ میں رب کے جوتوں کو جمع کر رکھا ہے اور اٹھانا

چاہ رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر لوگوں کو وجد آنے لگا اور دیر تک قلوب پر اس کا اثر رہا بھلا آج تو کوئی ایسا کر کے دکھا دے کہ اپنے شاگردوں کے جوتے سمیٹنے لگے صابو حکایتیں بیان کر دینا اور بات ہے مگر کر کے دکھلانا اور بات ہے۔ مولانا کو لوگ خشک تھے بعضے متشدد کہتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی کی تربیت کرتے ہوئے مولانا کو دیکھا ہوگا اس وقت مولانا سیاست و تنبیہ فرما رہے ہوں گے وہ احمق سمجھا کہ بس یہ رات دن اسی حالت میں رہتے ہیں جیسے کوئی شخص کسی رحمدل حج کو خون کا مقدمہ فیصل کرتے ہوئے دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ حج تو بڑا خونی ہے ارے ظالم حج تو خونی نہیں بڑا مہربان ہے مگر افسوس تو اس کے پاس ایسے وقت گیا جب وہ ایک ڈاکو کے لئے سزائے موت تجویز کر رہا تھا اگر تو اس کے بڑنگہ پر جا کر ملتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کیسا مہربان ہے ایسے ہی سیاست و تربیت کے وقت کسی بزرگ کو سختی کرتے ہوئے دیکھ کر سخت مزاج سمجھ لینا بڑی حماقت ہے۔

اصلاح و تربیت میں تو ضرورت کی وجہ سے یہ حضرات سختی برتتے ہیں باقی فی نفسہ سخت مزاج نہیں ہوتے تمہیں فارغ اوقات میں ان حضرات سے ملنا چاہیے جب حقیقت معلوم ہوگی کہ تم خشک ہو یا وہ خشک ہیں۔ ایک سختی کی عادت تھی کہ جب اس کے یہاں کوئی مہمان آتا تو بڑی خاطر مدارات کرتا تھا مگر خصت کے وقت یہ کہہ دیتا تھا کہ مہربانی کر کے دوبارہ آپ یہاں نہ آئیں۔ لوگ اسے بدنام کرتے تھے کہ یہ بڑا ہی بخیل اور تنگ حوصلہ ہے جو مہمانوں سے یوں کہتا ہے پھر یہاں نہ آنا۔ ایک عاقل نے بھی یہ بات سنی اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص تو بڑا سختی اور عالی حوصلہ ہے آخر یہ بات کیا ہے اس کی تفتیش کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ خود اس سختی کا مہمان بنا اس نے خوب خاطر کی اس کے سارے کام ملنے ہاتھ سے کئے اس نے بھی کچھ تکلف نہ کیا اور اس کی ہر خدمت کو گوارا کرتا رہا کسی بات میں مزاحمت نہ کی کہ تم یہ کام کیوں کرتے ہو میں خود کر لوں گا جب چلنے لگا تو سختی نے کہا میری یہ درخواست ہے کہ آپ پھر بھی یہاں تشریف لائیں۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ میرے ساتھ اس نے وہ معاملہ نہیں کیا جو لوگوں میں مشہور ہے آخر اس سے ہی پوچھا کہ آپ کی نسبت جو یہ بات مشہور ہے کہ آپ مہمان سے چلتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ یہاں پھر نہ آنا۔

اس کی کیا اصل ہے میں اسی کی تحقیق کے لئے آیا تھا مگر میرے ساتھ آپ نے برعکس معاملہ کیا کہا وہ بات غلط نہیں بالکل صحیح ہے واقعی میں ایسا کہتا ہوں مگر اس کا راز یہ ہے کہ جو کوئی میرے یہاں مہمان بن کر آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی خدمت کروں اسے راحت پہنچاؤں مگر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جب میں کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اس سے روکتے ہیں کہ آپ تکلیف نہ کریں ہم خود یہ کام کر لیں گے مجھے اس تکلف سے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگ ایک تو مجھے خدمت سے محروم کرتے ہیں۔ دوسرے خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں کیونکہ بعضے کام صاحب خانہ جس سہولت اور عمدگی سے کر سکتا ہوں اجنبی اس طرح نہیں کر سکتا اور مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مہمان میری نظر کے سامنے تکلیف اٹھائے اور میں اس کو راحت نہ دے سکوں اس لئے میں کہہ دیتا ہوں کہ آپ پھر یہاں نہ آئیں اور تم نے کسی بات میں تکلیف نہیں کیا جس طرح میرا دل راحت پہنچانے کو چاہتا تھا تم نے مجھے ویسے ہی کرتے دیا کسی بات سے نہیں روکا اس سے میرا دل بہت خوش ہوا اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم پھر آؤ۔ دیکھئے اس غریب کے متعلق شہرت کیا تھی۔ اور حقیقت کیا نکلی تفتیش سے معلوم ہوا کہ اس کا وہ بات لوگوں سے کہنا بھی غایت کرم پر مبنی تھا وہ مہمانوں کو راحت پہنچانا چاہتا تھا اور مہمان اس کی راحت رسانی سے روکتے تھے۔ یہی حال مولانا گنگوہی قدس سرہ کا تھا کہ لوگ بیڈھنگا پن خود کرتے تھے اس سے مولانا کو تکلیف ہوتی تھی ورنہ اگر کوئی ڈھنگ سے مہمان ہوتا تو مولانا سے زیادہ خوش اخلاق کوئی نظر نہ آتا۔ یہ قاعدہ یاد رکھو کہ مہمان کو میزبان کے کام میں دخل نہ دینا چاہیے مصالح کی رعایت وہی خوب کر سکتا ہے مہمان کو ان مصالح کی اطلاع نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا کے یہاں ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ایسے وقت آئے کہ مولانا اس وقت درس حدیث میں مشغول تھے مولانا معمولی طور پر مزاج پررسی کر کے درس میں مشغول ہو گئے اور یہ بھی غایت کرم تھا کہ مولانا نے ان سے دو چار باتیں کر لیں۔ ورنہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر عظمت مولانا کے قلب میں تھی اس کا مقتضایہ تھا کہ اس وقت کسی سے ایک بات بھی نہ کرتے۔ صابو! اگر کوئی شخص اپنے محبوب کا خط پڑھتا ہو تو

کیا اس وقت وہ کسی سے بات کرنا گوارا کر سکتا ہے اس کو عشاق اپنے دل میں خود غور کر لیں لیکن مولانا نے تطیب قلب مسلم کے لحاظ سے اس وقت اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان کچھ باتیں کیں، پھر حدیث میں مشغول ہو گئے اس کی ان ڈپٹی صاحب نے یہ قدر کی کہ مولانا سے بدظن ہو گئے کہ یہ تو بہت روکھے ہیں کہ دو چار باتیں کر کے پھر التفات بھی نہ کیا غرض ان کو یہ طرز ناگوار ہوا۔ پھر اس کی انہوں نے اس طرح کسر زکالی کہ مولانا کو گورنمنٹ کی طرف سے کوئی خطاب دیا جانا بتویہ نہ ہوا تھا ڈپٹی صاحب سے بھی رائے لی گئی۔ انہوں نے اس کو روک دیا اور بڑے فخر سے اپنی کارروائی کو ظاہر کیا کہ مولانا ہم سے بے رخی کی تھی تو ہم نے بھی ان کو خطاب سے محروم کر دیا مولانا کو یہ خبر پہنچی تو بہت ہنسے، فرمایا کہ میں تو ان کی اس کارروائی سے ممنون ہوا کہ مجھے ایک بلا سے بچا دیا اگر میں خطاب لے لیتا تو درباروں میں جانا پڑتا۔ اگر نہ لیتا اور واپس کرتا تو اس میں حکومت کی توہین تھی تو میں تو خطاب کے پہنچنے سے ایک پریشانی میں مبتلا ہوں گا تاکہ کیا کروں خدا ان کا بھلا کرے کہ انہوں نے خطاب کو مجھ تک آنے ہی نہ دیا بالابالابا ہی واپس کر دیا۔ ہمارے حضرات اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کے مقرب بنیں اور درباروں میں شریک ہوتے پھریں اور اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کی توہین کریں۔ حکام کو برا بھلا کہیں۔ یہ تو آجکل ہی نیا دستور نکلا ہے کہ حکام کو بندر اور سور کہا جاتا ہے چاہے وقت پر کچھ بھی نہ ہو سکے صرف زبان ہی بہادر رکھے موقعہ پر یہ لوگ جو حکومت کے مقابلہ کرتے ہیں خود ہی بندروں کی طرح بھاگتے نظر آتے ہیں۔ پھر نہ معلوم یہ کونسی تہذیب ہے کہ حکام کو گالیاں دی جائیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ بہادر آدمی اپنے مقابل کو گالیاں نہیں دیا کرتا بلکہ قوت سے جواب دیا کرتا ہے۔ یہ طریقہ کمزوروں کا ہے کہ مقابل کو گالیاں دیکر اپنی زبان گندی کرتے ہیں۔ یاد رکھو اسلام نے یہ طریقہ ہم کو نہیں سکھایا۔ اسلام نے ہم کو تہذیب سکھائی ہے اور یہ طریقہ جو آجکل اختیار کیا گیا ہے تہذیب اسلامی کے بالکل خلاف ہے چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ حکومت کے خطاب کو واپس کر کے اس کی توہین کی جائے۔ غرض ایسے ایسے مخلص ہوں تو وہ شہرت سے



بھاگیں ورنہ ہم تو اکثر شہرت کے طالب ہیں۔ امام شعرانی نے اخلاص کی ایک علامت بیان فرمائی ہے۔ واقعی آب ذر سے لکھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اے عزیز اخلاص کی علامت یہ ہے کہ جو کام دین کا تو کر رہا ہے اگر تیری بستی میں اس کا کام کرنے والا کوئی دوسرا آجائے تو اس سے خوش ہو اور خدا کا شکر بجالا دے کہ اس نے ایک آدمی تیرا بوجھ ہلکا کرنے کو بھیجا اور اس کے آنے کے بعد تو اپنے شاگردوں اور مریدوں سے کہدے کہ اس سے جا کر مستفید ہوں اس سے فیض حاصل کریں۔ پھر تو اپنا کام اس کے حوالہ کر کے اطمینان سے خدا کی یاد میں مشغول ہو (بشرطیکہ وہ دوسرا شخص صاحب کمال اور قابل اطمینان ہو۔ اور اگر ناقص وغیر قابل اطمینان ہو تو ایسا نہ کرنا چاہیے مگر اس کے ساتھ عداوت و حسد بھی نہ کرنا چاہیے ۱۲ جامع) بتلائے ہمارے اندر ایسے کتنے افراد ہیں ہماری حالت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے سے جلتے ہیں اگر بستی میں کوئی واعظ ہے تو وہ دوسرے واعظ کے آنے سے جلتا ہے۔ کوئی شیخ ہے تو دوسرے شیخ سے جلتا ہے اگر کسی جگہ ایک مدرسہ ہے اور وہاں دوسرا مدرسہ قائم ہونے لگے تو پہلے مدرسہ والوں کو دوسرے سے حسد و عداوت ہو جاتی ہے پھر اس حالت کے ساتھ اخلاص کہاں۔ بس ہم لوگ اسی وقت تک مخلص ہیں جب تک بستی میں اکیلے ہیں ہمارے اخلاص کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب کوئی دوسرا کام کرنے والا ہمارے جیسا بستی میں آجاتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ مولویوں نے شہرت اور اظہار شان و شوکت کے لئے یہ سالانہ جلسے نکالے ہیں جیسے اہل دولت نے مولد شریف اور محرم و شب برات کی رسمیں نکالی تھیں۔

الغرض یہ سب حوصلے نکالنے کی باتیں ہیں۔ دیکھئے جو امور بدعت ہیں وہ چند روز میں اپنی حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ مولد شریف اول تو محض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوا تھا پھر قیام کی قید بڑھی پھر اس میں تعین تاریخ و ماہ کا اضافہ ہوا پھر مٹھائی تقسیم ہونے کی شاخ بڑھی۔ پھر گانے والے خوش الحان تجویز ہوئے جن میں اکثر امارد ہوتے ہیں اور بعض جگہ مرد و عورتیں سب شریک ہوتی ہیں اب وہ مولود کیا ہوا اچھی خاصی بیاہ شادی کی تقریب ہو گئی جس میں اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ بعض دفعہ

اس اہتمام میں نماز بھی قضا ہو جاتی ہے اور جماعت تو بہتوں کی فوت ہو جاتی ہے اور جو امور شرعیہ اصلہ ہیں ان میں حدود سے کبھی زیادتی نہیں ہوتی دیکھئے نماز روزہ تلاوت قرآن تہجد اور اشراق یہ دین کے اصلی کام ہیں۔ ان میں کبھی زیادتی نہیں ہوتی جس حالت پر تھے اب تک اسی حالت پر چلے آ رہے ہیں نیز امور بدعت کی یہ بھی علامت ہے کہ سخت پریشانی کے وقت میں حذف ہو جاتے ہیں اور جو دین کے اصلی کام ہیں وہ حذف نہیں ہوتے چنانچہ طاعون و میضہ کے زمانہ میں تہجد و سواں و چالیسواں سب حذف ہو جاتا ہے اور نماز جنازہ و کفن و دفن حذف نہیں ہوتا اگر کسی سال ربیع الاول میں طاعون و میضہ کا زور ہو جائے تو مجالس مولود بھی حذف ہو جائیں گی اور جو ہونگی بھی تو محض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا۔ مٹھائی اور حلوا اور گانا بجانا تو ضرور حذف ہو جائے گا کیونکہ یہ سب فرصت کی باتیں ہیں یہی دلیل ہے ان کے زائد اور فضول ہونے کی خیر یہ تو لطیفہ تھا میں دلائل سے بیان کر چکا ہوں کہ دلائل شرعیہ سے اظہار غم ممنوع ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے غم کو ترقی ہوتی ہے اور ترقی غم سے اعمال شرعیہ اور معمولات راتبہ میں خلل پڑ جاتا ہے اور اس کا ضرر بہت سخت ہے جس کو میں پہلے بتلا چکا ہوں حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان غم سے پریشان نہ ہوں چنانچہ اسی لئے پیشگی اطلاع فرمادی کہ ہم تم کو طرح طرح کی تکالیف سے آزمائیں گے تاکہ دفعۃً کلفت آنے سے پریشانی نہ ہو پہلے سے اس کے لئے آمادہ رہیں پھر چونکہ لَسْبَلُوْا نَكُودُ رِبْمَ تَمْبَارِ اضْرُور امتحان لیں گے، سے معلوم ہو گیا کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَ كَيْتَرُ الصَّابِرِيْنَ رَآپ صابریں کو بشارت دیدیجئے، اس جملہ سے معلوم ہو گیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابریں ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دیجایا کرتی ہے جو امتحان میں پاس ہوں اور اس سے بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بے صبری فیل ہونے کا سبب ہے پھر اس جگہ كَيْتَرُ میں بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ تو صابریں کو بشارت دیدیجئے  
تفصیل نہیں کی کہ کس چیز کی بشارت دے دیجئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ  
چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوش خبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل  
کر دی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا ان ہی میں بشارت کا حصہ ہو جائیگا  
اور جب اجمالاً کہہ دیا گیا کہ صابریں کو خوشی ہونے کی خبر دیدیجئے تو اس میں کسی چیز  
کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے جس سے تمام خوشی ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا  
کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گی اور یہ کام حق تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں  
کہ ہر شخص کی خواہش کو پورا کر دیں ورنہ انسان کو تو ایک بچہ ہر اسکتا ہے۔ چنانچہ  
ہمارے اس قصبہ میں ایک بچہ نے اپنے والدین کو بہر ادا یا تھا اس نے رونا شروع کیا  
اور صند کرنے لگا کہ میں تو فلاں چیز لوں گا والدین نے اس کا انتظام کر دیا۔ پھر صند  
کرنے لگا کہ میں تو وہ چیز کھاؤں گا وہ بھی لا کر رکھ دی۔ پھر صند کرنے لگا اور کوئی  
چیز مانگی وہ بھی لا کر دیدی جب ساری ضدیں پوری ہو گئیں تو کہنے لگا ہائے یہ چاند  
کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپاؤ۔ بس یہاں والدین عاجز ہو گئے اور دوچار  
ٹھانچے مار کر اسے خاموش کیا۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔

ایک دفعہ اکبر نے بیربل سے کہا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹیں بہت سخت

ہیں جن کا پورا کرنا مشکل ہے۔ راج ہٹ، تر یا ہٹ، بالک ہٹ۔ تو ان میں  
بادشاہ اور عورت کی ضد کا دشوار ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ دونوں  
عافل ہوتے ہیں ممکن ہے کسی وقت سوچ کر ایسی دشوار بات کہیں جو کسی سے  
پوری نہ ہو سکے مگر بچہ کی ہٹ کا پورا کرنا کیا مشکل ہے اس میں اتنی سمجھ کہاں  
جو سوچ سوچ کر دشوار باتیں نکالے اور دوسروں کو عاجز کر دے۔ بیربل نے  
کہا حضور سب سے زیادہ مشکل بالک ہٹ ہی ہے جس کے پورا کرنے کے لئے بڑی  
عقل درکار ہے۔ اکبر نے کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا اس کا امتحان ہونا چاہیے۔ بیربل  
نے کہا حضور پھر میں بچہ بنتا ہوں آپ میری ضدیں پوری کیجئے۔ کہا اچھا۔ چنانچہ

بیربل بچوں کی طرح رونے لگا۔ اکبر نے پوچھا کیوں روتا ہے کہا ہم تو کلہیا لیں گے اکبر نے فوراً ایک کلہیا منگا دی۔ وہ پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اکبر نے فیل خانہ سے ایک ہاتھی منگا دیا۔ وہ پھر رونے لگا کہا اب کیوں روتا ہے کہا اس ہاتھی کو کلہیا میں رکھ دو بس اکبر عاجز ہو گیا اور کہا اچھا اب ہم بچے بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو اس نے کہا بہت اچھا۔ اکبر کو اور کچھ تو سبق آتا نہ تھا۔ بیربل ہی کا پڑھا یا ہوا سبق دہرا دیا کہ ہم تو کلہیا لیں گے اس نے کلہیا منگا دی پھر کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اس نے بازار سے مٹی کا ایک ذرا سا ہاتھی منگا دیا پھر کہا اس کو کلہیا میں رکھ دو اس نے اٹھا کر رکھ دیا۔ بس خاموش ہو گئے۔ بیربل نے کہا حضور آپ نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی فرمائش پر اتنا بڑا ہاتھی منگا یا آپ کو ہاتھی بھی بچے کے مناسب منگانا چاہیے تھا میں کہتا ہوں کہ اکبر نے بیربل ہی کا سبق دہرا دیا تھا اس لئے بیربل نے اسے جلدی ہی پورا کر دیا اگر وہ تمہارے بھون کے اس بچے سے سبق لیتا تو بیربل کے باپ سے بھی یہ ضد پوری نہ ہوتی کہ ہائے چاند کیوں نکل رہا ہے اسے چھپاؤ۔ غرض بَشَرِ كَا عَمُوْمِ قَدْرَتِ كے عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اس میں بجائے نَبَشَرِ (ہم بشارت دیتے ہیں) صیغہ منکلم کے (بشر صیغہ) امر اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ بشارت جو واسطہ زیادہ موثر ہوتی ہے وہ اس کی یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ہم سے خود تکلم فرماتے تو غلبہ جلال و ہیبت ایسا ہوتا کہ اس غلبہ کے سامنے لذت بشارت حاصل نہ ہوتی۔ اور جنت میں ہمارے قوی بڑھ جائیں گے وہاں ہم کو اس ہیبت و جلال کا تحمل ہو جا تو تکلم بلا واسطہ مفید ہوگا۔ باقی دنیا میں تکلم بلا حجاب کا ہم کو تو کیا تحمل ہوتا حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو بھی تحمل نہ ہوا ان سے بھی حجاب کے ساتھ کلام ہوا ہے اور ایک دفعہ بے حجاب ہونے کی تمنا کی تھی تو دیکھنے سے پہلے ہی غلبہ انوار سے بے ہوش ہو گئے بعض لوگ تَجَلَّى رَبُّهُ (تجلی ڈالی ان کے پروردگار نے) سے وقوع رویت سمجھ گئے ہیں یہ غلط ہے اور دھوکا اس سے ہوا کہ اردو میں تجلی کے معنی رویت مشہور ہو گئے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں تجلی کے معنی ظہور ہیں اور یہ فعل حق تعالیٰ کا ہے رویت موسیٰ علیہ السلام کا فعل ہے تو حق تعالیٰ

کا فعل تو واقع ہوا کہ وہ ظاہر ہوئے لیکن اس سے موسیٰ علیہ السلام کے فعل رویت کا وقوع کیونکر لازم آیا قرآن میں جو ان کا فعل مذکور ہے وہ *وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا* (موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے) ہے رویت کا کہیں ذکر نہیں بلکہ اس سے پہلے *لَنْ تَرِنِي* (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتا) مذکور ہے جو نفی موبد کو مفید ہے اور قابل نسخ نہیں (کیونکہ نفی موبد میں نسخ نہیں ہوا کرتا *كَمَا ثَبَّتَ فِي الْأُصُولِ* (جیسا کہ اصول میں ثابت ہے) لیکن یہ تائید محض دنیا کے اعتبار سے ہے کیونکہ آخرت میں وقوع رویت ہوگا ۱۲ جامع) بعض لوگوں کو اس سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ آیت میں تجلی کا ذکر پہلے اور خرو و صعق کا ذکر بعد میں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خرو و صعق کا سبب تجلی تھی تو شبہ ہوتا ہے کہ تجلی مقدم اور خرو و صعق لاحق تھا تو لازم آیا کہ موسیٰ علیہ السلام تجلی کے بعد بے ہوش ہوئے تجلی کے ساتھ بے ہوش نہیں ہوئے تو رویت پائی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ تجلی و خرو و صعق و تاخر ذاتی تھا اور زماناً مقارنت تھی تقدم و تاخر ذاتی کے لئے زماناً تقدم و تاخر لازم نہیں جیسا کہ اہل علم اس کو جانتے ہیں۔ پس تجلی کے سبب خرو و صعق ہونے سے دونوں کے مقارنت فی الزمان کی نفی نہیں ہوتی خوب سمجھ لو بہر حال دنیا میں انبیاء علیہم السلام کو بھی بلا حجاب کے کلام الہی کا تحمل نہیں ہوا۔ تو ہم کیا تحمل کر سکتے ہیں۔ مگر حجابات انبیاء و حجابات غیر انبیاء میں فرق ضرور ہے۔ ان کے لئے کم حجاب ہیں کیونکہ ان میں دوسروں سے زیادہ تحمل ہے اور ہمارے لئے زیادہ حجابات ہیں کیونکہ ہمارے اندر تحمل کم ہے اس لئے بشارت بواسطہ کو اختیار فرمایا کیونکہ ہم لذت بشارت کو اس صورت سے ادراک کر سکتے ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ مقرر کر کے بھی *صِيغَةُ بَشِيرٍ* اختیار فرمایا یہ نہیں کہا *وَقُلْ لَهُمْ أَنَا بَشِيرٌ هُمْ* (اور ان سے کہہ دیجئے کہ ہم ان کو بشارت دیتے ہیں) یعنی واسطہ کے بعد بھی صیغہ تکلم نہیں فرمایا تاکہ لوگ بے فکری سے سن لیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ بادشاہ پس پردہ ہوا اور تکلم اپنی زبان پر کر رہا ہو کہ جہاں پناہ یوں فرماتے ہیں جب بھی جلال کا غلبہ ہوتا ہے گو اس قدر نہ ہو جتنا تکلم بلا حجاب میں ہوتا اور اگر وہ

پس پردہ ملبیجے کر وزیر سے یوں کہے کہ تم ان لوگوں سے یوں کہدو تو اس صورت میں جلال کم ہو جاتا ہے گو  
اس وقت بھی وزیر کا کلام بادشاہ ہی کا کلام ہوگا مگر چونکہ وہ اپنی زبان پر تکلم کر رہا ہے بادشاہ  
کی زبان پر تکلم نہیں کر رہا اس لئے جلال کا اثر کم ہو جاتا ہے اسی طرح یہاں حق تعالیٰ نے حضور  
صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ رکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کون جن کی شان یہ ہے رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ  
کہ آپ ہمارے ہی میں سے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں کوئی اجنبی اور غیر شخص نہیں اور اپنے  
ہم جنس و ہم قوم سے انس بھی زیادہ ہوتا ہے فیض بھی زیادہ ہوتا ہے اس کو بھی ہمارے حال پر  
زیادہ شفقت ہوتی ہے تو ان وسائل کا اثر ایسا ہے جیسے گرمی کی ٹوئس کی ٹی کے اندر ٹھنڈی  
ہو کر آیا کرتی ہے کہ یہ حجابات خس کی ٹی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ حالت ہو جائے جو حدیث  
میں وارد ہے لَا حَرْقَتْ سَبَّحَاتُ وَجْهِهِ مِمَّا نَقَّحُوا إِلَيْهِ يُعْضِرُ (البتہ جل جاتے ہیں تمام پردے  
جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے) غرض جملہ بَشِيرِ الصَّابِرِينَ (صابرین کو آپ بشارت دیکھے)  
میں یہ بھی بتلا دیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے کون ہیں اور یہ بھی بتلا دیا کہ پاس ہونے کا طریقہ کیا  
ہے پھر ساتھ ساتھ ان کو انعام ملنے کی بشارت بھی دیدی اور عموم بشارت کے انعام و جزا کی عظمت اور  
اپنے عموم قدرت کو بھی واضح کر دیا پھر صیغہ امر اختیار کر کے بشارت بواوسط کا زیادہ مفید و موثر ہونا بھی  
بتلا دیا (پھر چونکہ عادت یہ ہے کہ کسی علم و فن میں امتحان دینے والی جماعت کو اسی شخص کے ہاتھ سے  
انعام دلواتے ہیں جو اس فن میں کامل و ممتاز ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابرین کے لئے واسطہ  
بشارت بنا کر یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ آپ اکمل الصابرین ہیں اور تحمل مصائب میں سب سے بڑھے ہوئے  
ہیں گمنا و ددنی الحدیث اُذِيتُ فِي اللَّهِ مَا لَمْ يُؤْتَا أَحَدًا ۱۲ جام) مجھ کو اتنی ایذا پہنچائی  
گئی ہے کہ کسی کو اتنی اذیت نہیں پہنچائی گئی (قرآن کے ایک ایک لفظ میں اتنی دلائل اور  
اس قدر رعایتیں اعجاز قرآن کی دلائل میں آگے فرماتے ہیں الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ  
قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

وہ ایسے لوگ ہیں جب ان پر کوئی مصیبت  
پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی مملوک ہیں  
اور ہم اسی کے پاس جانے والے ہیں ۲

یہ جملہ یا تو صفتِ ماوراء ہے اور مطلب یہ ہے کہ بشارت جن صابریں کے لئے ہے ان کی یہ خاص مدح ہے یا صفتِ مقیدہ ہے کہ صابریں میں جن کی یہ شان ہے صرف انہی کے لئے بشارت ہے۔ بہر حال اس سے ہر مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چراغ گل ہو جانے پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ روشنی نعمت ہے واقعی رات کو اندھیرے مکان میں جب چراغ روشن کیا جاتا ہے تو جان میں جان آتی ہے اندھیرے گھر سے وحشت سی معلوم ہوتی ہے اس لئے آپ نے چراغ گل ہونے پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ کر روشنی کا نعمتِ عظمیٰ ہونا اور اندھیرے کا مصیبت ہونا ظاہر کر دیا۔ مگر آج کل اِنَّا لِلّٰہِ بہت بدنام ہو گیا ہے۔ لوگوں نے اس کو مردوں کے لئے خاص کر لیا ہے۔ گنگوہ میں ایک لڑکا ہر بات پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا کرتا تھا تو ایک بڑھیا نے کہا بچے خدا سے خیر مانگ تو ہر بات پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ کے کس کو مارے گا۔ شاید بڑھیا کو اپنی ہی فکر ہوئی ہو گی کہ بس سب سے زیادہ میری عمر ہے کہیں اِنَّا لِلّٰہِ سن کر ملک الموت گھر میں نہ آگھسیں اور مجھے سب سے زیادہ عمر والی دیکھ کر اپنے ساتھ لیجائیں اسی طرح لا حول بھی بہت بدنام ہے۔ کانپور کا ایک قصہ ہے کسی نے دوسرے کو دود سے دیکھ کر سمجھا کہ یہ فلاں شخص ہے پاس پہنچا تو اور تھا اس نے اپنی غلطی پر لا حول پڑھ دی۔ وہ دوسرا شخص اس کے سر ہو گیا کہ تم نے مجھ کو شیطان کہا وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ میں نے تم پر لا حول نہیں پڑھی اپنی غلطی پر پڑھی ہے مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ بہت مشکل سے اس نے سچیا چھڑا یا۔ سورۃ یسین بھی بہت بدنام ہے اس کو بھی لوگوں نے مردوں کے لئے خاص کر لیا ہے حالانکہ حدیث شریف میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے۔ اس سورت کے دم کرنے سے بڑے مہلک امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے مگر جب کسی مریض پر یہ سورت دم کرتا ہوں تو آہستہ پڑھتا ہوں کہیں زور سے پڑھنے میں وہ بیمار یا اس کے گھر والے یہ نہ کہیں کہ مارنے کو آیا تھا۔

دہلی میں ایک دفعہ مومن خاں شاعر تراویح میں قرآن سنتے تھے ایک ڈوم بھی

ان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا وہ مومن خاں سے چند روز کے بعد کہنے لگا کہ خان صاحب جب وہ سورت آدے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھ سے ایک دن پہلے کہدینا تاکہ میں اس دن نہ آؤں اس کے سننے سے آدمی مر جاتا ہے مومن خاں نے وعدہ کر لیا چند روز کے بعد اس نے یہ بات پھر یاد دلائی تو مومن خاں نے مذاق میں کہدیا کہ وہ سورت تو پڑھی بھی گئی مجھ کو کہتا یاد نہیں رہا۔ بس وہ ڈوم یہ سن کر بہم ہی تو گیا کہ ہائے وہ سورت پڑھی گئی اور وہم کی وجہ سے اس کی روح تھلیل ہو گئی اور دو تین دن میں مر گیا۔ یہ محض اس کے وہم کا اثر تھا اس سورت کا اثر نہ تھا۔ ورنہ آج کل لوگ کیوں نہیں مر جاتے ایک شخص نے کسی گاؤں میں جا کر حافظ ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ پورا حافظ نہ تھا کہیں کہیں سے کچھ سورتیں یاد تھیں۔ رمضان میں اپنے قرآن سنایا اور جتنا یاد تھا وہ چند روز میں سنا کر کہدیا کہ قرآن ختم ہو گیا مٹھائی بانٹو۔ اور مجھے نذرانہ دو۔ گاؤں والے اس کے جھوٹ یا سچ کو کیا سمجھتے مگر ایک شخص کو ان میں سورہ لیسین یاد تھی اس نے کہا حافظ جی آپ نے یہ کیسا ختم کیا سورہ لیسین تو پڑھی ہی نہیں تو وہ کیا کہتا ہے کہ بے وقوف تو زندوں پر لیسین پڑھو نا چاہتا ہے، اے وہ تو مردوں پر پڑھی جاتی ہے اگر میں تراویح میں اسے پڑھ لیتا تو تم سب مر جاتے۔ گاؤں والے بہکانے میں آگئے اور التامعہ ہن ہی کو دھمکانے لگے کہ تو ہمیں مارنا چاہتا ہے جو زندوں پر لیسین پڑھواتا ہے۔ اسی جہالت کا یہ اثر ہے کہ لوگ سوائے مواقع موت کے اور کسی جگہ اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے سے رکتے ہیں حالانکہ (حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان پر کوئی مصیبت آوے وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ پڑھے تو حق تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناتے ہیں اور جب کبھی اس مصیبت کو یاد کر کے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھے گا تو وہی ثواب ملے گا جو صدمہ اولیٰ کے وقت ملا تھا ۱۲ جامع) میں بتلا چکا ہوں کہ اِنَّا لِلّٰہِ کا مضمون ایسا ہے کہ اس کو مستحضر رکھنا غم کو بہت ہلکا کر دیتا ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے افسوس لوگوں نے مرہم کو نشتر سمجھ لیا ہے یہ محض جہالت ہے اس خیال کو دل سے نکال کر مصیبت کے موقع میں اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنا چاہیے اور اس کے مضمون میں غور کرنا چاہیے۔ اِنَّا لِلّٰہِ



غم پاس کو بھی نہ رہے گا اور ہلکا تو ضرور ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ نے یہ دوسرا سامان کیا ہے تخفیف حزن کا کہ رنج و غم کے موقعہ کے لئے ایسا مراقبہ ہم کو تعلیم کیا ہے جو غم کو ہلکا کرتا ہے تاکہ عبر آسان ہو جائے اور ہم مصیبت کے وقت صابرین میں داخل ہو کر امتحان میں پاس ہو جائیں اور صابرین کے لئے جس انعام کی بشارت ہے اس کے مستحق ہو جائیں۔

اب صبر کی حقیقت سنئے تاکہ وہ علوی رفیع ہو جائے جس میں عام طور پر لوگ مبتلا ہیں کیونکہ تمہید میں معلوم ہو چکا ہے کہ لوگ صرف جزع و فرزع نہ کرنے کو صبر سمجھتے ہیں اور مداومت اعمال کو صبر میں داخل نہیں سمجھتے ان کے نزدیک بے صبری فقط جزع و فرزع کا نام ہے۔ حالانکہ مصیبت کے وقت اعمال میں کوتاہی اور کمی کر دینا بھی بجزیرگی میں داخل ہے اور اس کا انجام جزع و فرزع سے بھی اشد ہے اس کے لئے اول صبر کے معنی سمجھنے چاہئیں تو صبر کہتے ہیں لغت میں جس کو یعنی رکنے کو اور اصطلاح شرع میں صبر کے معنی جس النفس ہیں یعنی نفس کو روکنا۔ عربی میں صبر کا استعمال مختلف صلوات سے ہوتا ہے اور صلوات سے لفظ کے اصل معنی کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایک لفظ کا استعمال مختلف صلوات سے ہوتا ہے تو لوگوں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا اصلی صلہ کونسا ہے اور عارضی صلہ کونسا ہے اسی لئے حقیقت میں خلط واقع ہو جاتا ہے لفظ صبر کی حقیقت بھی بعض لوگوں پر اسی لئے مخفی ہو گئی کہ وہ اس کا استعمال مختلف صلوات سے دیکھتے ہیں چنانچہ کبھی لازم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسے ایک شاعر کا قول ہے اَصْبِرْ لِكُلِّ مُصِيبَةٍ وَتَجَلِدِ (صبر کر ہر مصیبت پر اور جمار ہے) کہیں صلہ فی سے آتا ہے جیسے وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی اور بیماری میں کہیں عن سے آتا ہے جیسے حدیث مشرف میں ایک منافق کا قول آتا ہے

۱۔ اس تقریر سے حکیم الامتہ دام مجدکم کا تبحر عربیت میں اور وسعت نظر طرق کلام میں اور مذاق صحیح فہم حقائق الفاظ میں بخوبی واضح ہے میں نے بہت غور کیا کہ صبر کا کوئی صلہ ان صلوات مذکورہ کے سوا اور بھی ہے مگر نہیں ملا ۴ جامع۔

جو غرور وہ تبوک میں اس نے کہا تھا رَاتِيْ اِمْرًا لَا اَصْبِرُ عَنِ النَّسَاءِ (میں ایسا آدمی کہ عورتوں سے صبر نہیں کر سکتا) کہیں علی سے آتا ہے جیسے وَ اَصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ رَاوِر تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر) کہیں بار سے آتا ہے جیسے وَ اَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے) کہیں مع سے آتا ہے جیسے وَ اَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو اپنے رب کی عبادت صبح و شام کرتے ہیں) یہ تو وہ حروف ہیں جو بطور صلہ کے لفظ صبر کے ساتھ مستعمل ہوتے ہیں اور بعض حروف ایسے بھی ہیں جو اس کے ساتھ مستعمل ہیں مگر ان کو صلہ صبر نہیں کہا جا سکتا جیسے وَ اَصْبِرْ كَمَا صَبِرُوا وَاُولَئِكَ الْعَزْمُ مِنَ الرَّسُوْلِ (تو آپ صبر کیجئے جیسا اور ہمت والے رسولوں نے صبر کیا ہے) اور وَ اَصْبِرْ حَتّٰی يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ (اور صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں) کیونکہ کاف اور حتی ہر فعل کے بعد مستعمل ہو سکتے ہیں جن سے مقصود تشبیہ اور بیان غایت ہوتا ہے اور تشبیہ اور غایت ہر فعل کیلئے ہو سکتی ہے اس لئے ان کا استعمال بطور صلہ کے نہیں بلکہ صلوات وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی صلہ عن و علی ہیں باقی صلوات باعتبار خصوصیات مقام کے ظروف ہیں اور وجہ عن و علی میں حصر کی یہ ہے کہ صبر کا مدخول یا مامور بہ ہے یا منہی عنہ ہے کیونکہ صبر کے معنی حبس کے ہیں بس کبھی کسی بات کے اوپر حبس ہوتا ہے کبھی کسی بات سے حبس ہوتا ہے جس بات کے اوپر روکا جائے وہ مامور بہ ہے اور جس بات سے روکا جائے وہ منہی عنہ ہے حبس کے یہی دو محل صلی ہیں اس کے سوا اور کوئی حالت اصلی نہیں بس جہاں صبر کا استعمال بدون علی و عن کے معلوم ہوتا ہے وہاں یہ اصلی صلہ مقدر ہوگا مثلاً وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاسِ اِذَا الضَّرَّاءُ (وہ لوگ مستقل رہنے والے ہیں تنگدستی میں اور بیماری میں) کی اصلی تقدیر یہ ہے -

الصّٰبِرِيْنَ عَلَىٰ اِحْكَامِ اللّٰهِ وَالْمُحْتَرِمِيْنَ عَنِ مَعَاصِيَتِهِ فِي الْبَاسِ وَالضَّرَّاءِ  
واللہ تعالیٰ کے احکام پر مستقل رہنے والے ہیں اور گناہوں سے تنگدستی اور بیماری میں

اور احترام کرنے والے ہیں) اور **وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ** (آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں) کی اصل یہ ہے **وَاصْبِرْ عَلَىٰ حُكْمِ اللَّهِ حَالَ كَوْنِكَ جَالِسًا مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ** (اور آپ مستقل رہیں اللہ کے حکم پر اس حال کہ آپ بیٹھنے والے ہوں ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں) اور **وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ** (اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے) کی اصل یوں تھی **وَاصْبِرْ عَلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ وَمَا صَبْرُكَ عَلَيْهِ تَأْتِيًا بِشَيْءٍ إِلَّا بِاللَّهِ** (اور صبر کیجئے اللہ کے حکم پر اور تمہیں آپ کا صبر کرنا قائم کسی چیز کے ساتھ بجز اللہ تعالیٰ کے) اسی طرح ہر جگہ غور کر لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں یہ لفظ **عَنْ** و **عَلَىٰ** کے بغیر استعمال ہوا ہے وہاں اصلی صلہ مقدر ہے اور جو حرف جر مذکور ہے وہ صبر کا صلہ نہیں بلکہ کسی فعل محذوف کا صلہ ہے اور زیادت تعمق سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کا اصلی صلہ صرف ایک ہی ہے یعنی **عَلَىٰ** اور **عَنْ** بھی اصلی صلہ نہیں بلکہ عارضی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ صبر فی نفسہ مامور بہ ہے اور مامور بہ میں اصل افعال وجودیہ ہیں نہ کہ ترک پس صبر کا مدخول اصلی فعل مامور بہ ہی ہونا چاہیے اور اس کے مناسب صلہ حروف **عَلَىٰ** ہی ہے نہ کہ **عَنْ** اور جہاں صبر کا صلہ **عَنْ** آیا ہے وہاں گویا ہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدخول صبر منہی عنہ ہے مگر تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی ایک نہ ایک مامور بہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ ترک کی دو قسمیں ہیں ایک ترک عدمی وجودی اور یقیناً ترک عدمی متعلق صبر نہیں ہو سکتے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ صبر مامور بہ ہے اور اس میں اجر ثواب کی بشارت دی گئی ہے پس لازم ہے کہ اس کا مدخول ایسی شے ہو جس پر ثواب مل سکے اور ترک عدمیہ پر اجر نہیں ہے اور نہ چاہیے کہ قیامت میں ہر شخص مسلم کے حسنات غالب اور سیئات مغلوب ہوں کیونکہ ہر وقت میں انسان کرتا ایک کام کو ہے اور ہزاروں گناہوں کو ترک کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کھانا کھا رہا ہے اس وقت وہ زنا اور

غیبت اور چوری ڈاکہ ظلم وغیرہ سے بچا ہوا ہے۔ پانی پیتا ہے تو اس وقت بھی وہ ہزاروں گناہوں کو ترک کئے ہوئے ہے، سوتا ہے اس وقت بھی وہ دنیا بھر کے فضول اور لغو کاموں سے الگ ہے یا فرض کر لو کہ ایک شخص کسی گناہ کا مرتکب ہے، تو وہ اس وقت ایک گناہ کے سوا باقی تمام گناہوں سے بچا ہوا ہے تو چاہیے کہ ہر گناہ کے ساتھ اس کے نامہ اعمال میں ہزاروں نیکیاں بھی لکھی جائیں اور اس صورت میں حسنات کا سیئات پر غالب ہونا لازم ہے کہ ایسا کوئی شخص نہ نکلے گا جس کے سیئات غالب ہوں حالانکہ یہ نصوص قرآنیہ کے خلاف ہے پس ثابت ہوا کہ ترک عدمیہ پر کوئی اجر نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں ترک غیر اختیاری ہے نہ کہ اختیاری اور ثواب امور اختیاریہ پر ملتا ہے نہ کہ غیر اختیاریہ پر (قانون یہی ہے گو حق تعالیٰ کسی کے ساتھ اپنے فضل سے اس کے خلاف بھی معاملہ کر سکتے ہیں مگر اس سے قاعدہ پر نقص وارد نہیں ہو سکتا) جامع) جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب میں کہتا ہوں کہ جہاں صبر کا صلہ عن ہوتا ہے وہاں متعلق صبر ترک وجودی ہو گا نہ کہ ترک عدمی اور ترک وجودی بھی مامور بہ کی ایک فرد ہے پس گو بعض جگہ مدخول صبر منہی عنہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ بھی مامور بہ ہے مثلاً اس منافق کے قول میں *جَوْلَا أَصْبِرُ عَنِ النِّسَاءِ* (میں عورتوں سے صبر نہیں کر سکتا) وارد ہے اس کی اصل یہ ہے *لَا أَصْبِرُ عَلَى كَفِّ النَّظْرِ عَنِ النِّسَاءِ* (میں عورتوں سے نظر روکنے سے صبر نہیں کر سکتا) اس جگہ مدخول صبر کف النظر ہے جو کہ ترک وجودی ہے اور یہ حقیقت میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے *وَقُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ* اور آپ مسلمانوں سے کہہ دیجئے اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اس میں غض بصر کا امر ہے اور یہی کف النظر ہے پس کف النظر کا مامور بہ ہونا ثابت ہو گیا۔ لہذا یہ بات محقق ہو گئی کہ صبر کا اصلی صلہ علی ہے عن بھی اصلی صلہ نہیں بلکہ یہ بھی خصوصیت مقام کے لحاظ سے بطور نظر کے آتا ہے۔ جب صبر کا اصلی صلہ متعین ہو گیا تو معلوم ہوا کہ مافیہ الصبر جسے محل صبر بھی کہتے

ہیں اور ما علیہ الصبر اور عین الصبر ایک ہی چیز ہے یعنی عمل۔ اب اس کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور ثابت ہو گیا کہ صبر کے معنی جلس النفس علی الاعمال ہیں یا جلس النفس علی احکام اللہ ہیں یعنی نفس کو اعمال طاعات و احکام الہیہ پر جمانا اور روکے رکھنا اس میں سب اعمال آگئے جن میں ترک و وجود یہ بھی آگئے پس حقیقت صبر استقامت علی الاعمال ہے اور اس میں ترک منہیات بھی داخل ہے لہذا یشیر الصّابرون صابرین کو بشارت دیدہ بجئے کا حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ مصائب میں اعمال طاعات پر جمے رہتے ہیں ان کے لئے بشارت ہے پس صبر کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ مصائب میں جزع فزع کو ترک کر دے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ناگوار واقعات میں بھی اپنے معمولات پر مستقل رہے اور منہیات سے بچا رہے پس یہ کتنی بڑی غلطی تھی کہ لوگوں نے صبر کے مفہوم اصلی کو تو اسکی حقیقت سے خارج کر دیا اور اس کی ایک فرد یعنی جزع فزع نہ کرنے میں اس کو منحصر کر دیا حالانکہ جس طرح مصیبت کا یہ حق ہے کہ اس وقت جزع فزع نہ کرے یہ بھی ایک بڑا حق ہے کہ اعمال میں تقلیس و اختلاط نہ ہونے پائے بدون اس کے حقیقت صبر کا وجود نہیں ہو سکتا اور جو شخص ایسے وقت میں اعمال میں کوتاہی کرنے لگے وہ صابر کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہو سکتا لہذا مصائب میں اہتمام اعمال کی سخت ضرورت ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کی بالکل پروا نہیں بس جہاں کوئی ناگوار بات پیش آئی اب ذکر بھی ناغہ ہے اور تہجد بھی رخصت ہے تلاوت قرآن بھی ندارد ہے اور جماعت کا اہتمام بھی قوت ہے اس وقت انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس مصیبت کے بعد معمولات کی پابندی شروع کر دوں گا۔ مگر یہ اس کی غلطی ہے کیونکہ ممکن ہے اس کے بعد دوسری مصیبت آجائے پھر یہ کہو گے کہ اس کے بعد پابندی کروں گا ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی حادثہ ہو جائے تو تم اسی امروزہ فرد میں رہو گے اور عمر بھر پابندی نصیب نہ ہوگی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۷

گر گریزی بر امید راحتے ہم آبتجا پیشت آید آفتے  
 راگر فرصت اور راحت کی امید پر گریز کرتا ہے اس وقت بھی ممکن ہے کہ تجھ کوئی آفت کا سامنا ہو جائے

صاحب اس طرح عمر گزر جائے گی اور آپ کو فراغ کا وقت نہ ملے گا پس اگر پابندی چاہتے ہو تو ہمت کر کے مصیبت ہی میں کام شروع کر دو کام کا خاصہ ہے کہ وہ بخود بخود فراغ پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ۵

بیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

رکونی گوشہ بے دوڑ دھواور دام سے خالی نہیں ہے سوائے تعلق مع اللہ آرام در راہینے  
انسان چاہتا ہے کہ ذکر اللہ اور اعمال طاعات سے پہلے فراغ و راحت قلب حاصل ہو جائے  
تو پھر ان میں مشغول ہوں مولانا فرماتے ہیں کہ فراغ و راحت اس کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں  
سکتا پس جس چیز کے تم منتظر ہو اس کا ذریعہ وہی ہے جس کو تم چھوڑے ہوئے ہو اور  
اس کے بغیر تمہارا فراغ و راحت کو طلب کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں  
یوں کہے کہ دریا میں اس حال سے کیونکر جاؤں میں تو ناپاک اور وہ صاف شفاف اور پاک  
نہیں مجھے پاک ہو کر دریا میں جانا چاہیے تو دریا اس سے یہ کہے گا کہ مجھ سے دور رہ کر تو پاک  
ہو ہی نہیں سکتا پاک ہونے کی تو یہی صورت ہے کہ تو اسی حال سے میرے اندر چلا آ اسی  
ہمارا یہ خیال خام ہے کہ غم سے خالی ہو کر ذکر و طاعات میں مشغول ہوں گے صاحب غم سے خالی  
ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ آپ اسی حالت میں کام شروع کر دیں وہ خود سارے غموں کو  
دور کر دے گا واللہ مصیبت کے وقت ذکر و طاعات ہی سے غم ہلکا ہوتا ہے اور ان میں کمی  
کر کے اور زیادہ پریشانی بڑھتی ہے آجکل میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں  
پر مصائب کا نزول ہو رہا ہے اور نہ معلوم یہ کب تک زائل ہوں آجکل لوگوں کو اس کی  
وجہ سے تشویش ہے اور زیادہ وقت اسی قسم کی باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ معمولات کی پابندی  
بالکل فوت ہو گئی ہے جو لوگ اسی قسم کی باتوں میں مشغول ہیں انہوں نے تو معمولات سابقہ  
کو بالائے طاق رکھ ہی دیا ہے مگر جو لوگ فضول باتوں سے الگ بھی ہیں دیکھتا ہوں  
کہ وہ بھی تشویش سے خالی نہیں ہیں ان کے معمولات میں بھی خلل واقع ہو رہا ہے اور جو  
ہمت کر کے معمولات کی پابندی پر جمے ہوئے بھی ہیں ان کا بھی بعض دفعہ پریشانی کی  
وجہ سے کام میں دل نہیں لگتا۔ مجھے خود اپنے اندر یہ بات محسوس ہوتی ہے اور میں نے تجربہ

کیا ہے کہ جب مجھے کسی بات پر عمل دشوار ہوتا ہے تو میں اسی کے متعلق بیان کر دیتا ہوں اس سے مجھے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے یہ مضمون میں نے اپنی اصلاح کی غرض سے بھی اختیاً کیا ہے اور یہ بھی مقصود ہے کہ اگر کسی اور کو یہ بات پیش آرہی ہو تو وہ بھی اپنی اصلاح کر لے اور سامعین میرے واسطے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ مجھے مصائب میں ایسا استقلال عطا فرمائیں کہ تشویش سے معمولات فوت نہ ہوں اور ہمیشہ کی طرح دل جمعی سے پورے ہوتے رہیں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے اوپر سے ان مصائب کو دور فرمائیں اور جس حکمت کے لئے یہ بھیجے گئے ہیں اس کا اثر ہمارے اندر ظاہر ہو۔ کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ناگوار واقعات میں حکمت ہوتی ہے جس سے بتلا کو سبق لینا چاہیے یہ بڑی غلطی ہے کہ حکمت کو چھوڑ کر واقعہ ہی کو سبق بنا لیا جائے جیسا ہم لوگوں نے کر رکھا ہے کہ بس رات دن اسی کے تذکرہ میں رہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ مصیبت ہم پر کیوں نازل ہوئی ہے اگر ہماری حالت میں کوئی نقص ہے تو اس کی تلافی کر کے حالت کو درست کرنا چاہیے تاکہ پھر حق تعالیٰ کا فضل و کرم متوجہ ہو اور یہ تازیانہ عبرت ختم ہو مگر افسوس ناگوار واقعات سے سبق لینے کی ہم کو عادت ہی نہیں بس یہ سبق سیکھ رکھا ہے کہ مصیبت کو مشغلہ بنا لیتے ہیں چنانچہ طاعون و ہیضہ کے زمانہ میں بعض لوگوں کو اسی کا شغل ہو جاتا ہے کہ آج اتنے مکے کل اتنے مرے اصلاح اعمال پر بہت کم توجہ ہوتی ہے یہی طریقہ ہم نے آج کل اختیار کر رکھا ہے کہ سوائے اخباری باتوں کے اور کچھ مشغل ہی نہیں رہا جہاں بیٹھتے ہیں پس یہی باتیں ہیں اور اسی کا تذکرہ، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ رفع مصیبت کی تدبیر نہ کریں نہیں جس طرح طاعون و ہیضہ کے لئے حفظاً یا تقدم کا اہتمام جائز ہے اور بیماری کی دوا دار و مسنون ہے اسی طرح ہر مصیبت کی تدبیر جائز ہے اگر کچھ تدبیر کرنی ہو شوق سے کرو مگر کیا وہ باتیں جو ہم رات دن کرتے ہیں یہ بھی تدبیر میں داخل ہیں ہرگز نہیں بلکہ ان سے بجز مشغلہ کے اور کچھ مقصود نہیں آجکل جو ہر مجلس میں باتیں ہوتی ہیں وہ تدبیر کی باتیں نہیں محض دل بہلانے کا مشغلہ ہے لوگوں کو اس میں مزہ آتا ہے کہ ادھر ادھر کی نئی باتیں کی جائیں چنانچہ آجکل یہ تازہ واقعہ ہندو مسلمانوں کے فساد کا ظاہر ہوا ہے لوگوں نے

اسی کی باتوں کو مجلس آرائی کا ذریعہ بنالیا۔

میں تدبیر کو منع نہیں کرتا۔ تدبیر کریں مگر کون وہ لوگ جو اہل تدبیر ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر عامی نتھو خیرا مدبر نہیں ہو سکتا تدبیر کرنے والے خاص خاص لوگ ہوتے ہیں نہ کہ ہر شخص۔ اس لئے یہ کہتا غلط ہے کہ یہ باتیں تدبیر کے لئے ہوتی ہیں اگر تدبیر کرنی ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک باطنی ایک ظاہری، باطنی تدبیر تو یہ ہے کہ اس وقت مصیبت کے حقوق شرعیہ کو ادا کرنا چاہیے شریعت نے مصیبت کے وقت صبر کی تعلیم دی ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال طاعات پر استقلال و پابندی ہو اور جزع فزع و اظہارِ غم سے احتراز ہو جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اور میں بتلا چکا ہوں کہ غم زائل ہونے میں ذکر اللہ و اعمال طاعات کو بڑا دخل ہے مگر افسوس آجکل اس طرف کسی کو بھی توجہ نہیں ان واقعات میں اعمال کا تو خون ہی ہوتا ہے اور جزع فزع و اظہارِ غم بھی بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی تحریکات میں شریعت سے بہت کچھ سجاوڑ کیا گیا کفریات و معاصی میں بہت لوگ مبتلا ہوئے اور صاف کہا جاتا تھا کہ یہ وقت مسائل کی بحث کا نہیں کام ہونا چاہیے۔ افسوس وہ اسلامی کام ہی کیا ہوا جس میں خدا تعالیٰ کو ناراض کیا گیا اس کے علاوہ سڑکوں اور گلیوں میں اسلام کا نوحہ اشعار میں پڑھا جاتا تھا یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو محرم میں شہادت نامہ والوں نے اختیار کر رکھا ہے آجکل واعظوں اور تقریروں میں بھی یہی سبق رہ گیا ہے کہ دل خراش الفاظ میں اسلام اور مسلمانوں نے ضعف کو ظاہر کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مصائب میں مسلمانوں کو استقلال و ثبات کے ساتھ رہنا چاہیے کسی طریقہ سے اظہارِ غم کر کے اپنی کمزوری کو طشت ازبام نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس سے غیر قوم کے حوصلے بلند ہوتے اور مسلمان انکی نظروں سے گر جائیں چنانچہ یہ نتائج بد اس حرکت کے اب ظاہر ہو رہے ہیں مگر افسوس اس مفسدہ پر کسی کی بھی نظر نہیں پس سب سے پہلا کام اس وقت ہمارے ذمہ یہ ہے کہ معمولات سابقہ میں کمی نہ کریں خدا کی یاد اور طاعت میں جس طرح پہلے مشغول تھے اسی طرح اب بھی مشغول رہیں اور جزع فزع و اظہارِ غم سے کلی اجتناب کریں اور کوئی کام خلاف شریعت نہ کریں یاد رکھو معمولات میں کمی کر کے اور اعمال میں حدود شریعت کے تجاوز کر کے کبھی مصیبت زائل نہیں ہو سکتی چاہے تم کتنی ہی تدبیر کرو۔ اس حالت سے غم کو ترقی اور پریشانی میں زیادتی



ہی ہوگی۔ دوسری صورت تدبیر ظاہری کی ہے اس کی آسان اور سہل صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنا بڑا بنا لو اور بڑا ایسے شخص کو بناؤ جس کی ذہانت اور تقویٰ پر پورا اعتماد ہو کہ یہ کسی مصیبت یا پریشانی میں شریعت سے تجاوز نہ کرے گا نیز اس کی عقل و تدبیر پر بھی اعتماد ہو ایسے شخص کو بڑا بنا کر اس سے پریشانی ظاہر کر دو اور بے فکر ہو جاؤ پھر وہ جو کچھ بتلاوے اس کے موافق عمل کرو۔ تم تدبیریں نہ کرو وہ خود تدبیر کریگا تم اپنے دینی اور دنیوی کام میں بے فکری سے لگے رہو اور سارا بوجھ اس کے اوپر ڈال دو۔ اور چونکہ وہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے اور خدا نے اس کو عقل و تدبیر بھی کامل دی ہے وہ اس بوجھ سے گھبرائے گا نہیں بلکہ اپنے متبعین سے یوں کہیگا

من غم تو می خورم تو غم مخور

من بہ تو مشفق ترم از صد پیر

(میں تیرا غم کھاتا ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

اس صورت میں مسلمانوں کا نہ کوئی دینی کام بند ہو گا نہ دنیوی سب کام اپنے قاعدہ سے چلتے رہیں گے۔ اور اگر کوئی بات حکام وقت سے کہنے کی ہو تو اپنے بڑوں سے مشورہ کر کے حکام کو اطلاع کر دو۔ اب جو کام ان کے کرنے کا ہے وہ خود کریں گے۔ اگر پھر بھی تم پر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو وقت پر صبر کرو اور اگر کوئی ہنگامہ ہو جاوے تو تم کو لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو۔ اور اپنی حفاظت کرو اس صورت میں غالب تو یہ ہے کہ دوسرا بھی ظلم سے باز آجائے گا اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہو جاؤ گے اس میں بھی مسلمان کا نفع ہے۔ شہادت وہ چیز ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے لئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔

اللَّهُمَّ ارْزُقْ شِيعِي شَهَادَةً رَفِيًّا سَبِيلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي مُبَيِّنًا

(رَسُوْلِكَ)

(اے اللہ مجھ کو اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما اور میری موت اپنے رسول کے شہر میں کر)

(پیشکش محل کراچی)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تمنا کیا کرتے تھے وَدِدْتُ اَنْيْ اُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْيٰى (محبت رکھتا اس بات کو کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں)

میں اوپر تفصیل کے ساتھ اس کی فضیلتیں کسی قدر بیان کر چکا ہوں مگر اتنی بات پھر کہے دیتا ہوں کہ جان دینا اسی وقت شہادت ہے جب شریعت کے موافق ہو۔ ورنہ خودکشی ہے۔  
تو ظاہری تدبیر کی یہ صورت ہے مگر افسوس آج کل ہر مسلمان متفکر نظر آتا ہے یہ خود رانی کا نتیجہ ہے ان کے سر پر کوئی بڑا نہیں ہے نہ کسی کو بڑا بناتے ہیں۔ اس لئے ہر کس خود تدبیر کرنا چاہتا ہے اور ایرا غیر انتھو خیر تدبیر کے اہل نہیں تو پریشانی ہی پریشانی بڑھتی ہے ہمارے اندر اتفاق و اتحاد نہیں اس لئے ہمارا کوئی مرکز نہیں اور بدون کسی مرکز کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ پہلی تحریکات میں ہم کو شرکت کے لئے کہا جاتا تھا ہم نے کہا کہ شرکت کے لئے کچھ شرائط ہیں جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کوئی بڑا اور سردار ہو اور وہ اس شان کا ہو کہ اگر کوئی اس کے حکم کی مخالفت کرنا چاہے تو قوت سے اس کو دبا سکے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدون اتفاق و اتحاد یا ہی کے کوئی کام نہیں چل سکتا اور جس طرح کسی اہم کام کے لئے حدود اتحاد کی ضرورت ہے بقدر اتحاد کی بھی ضرورت ہے اور بقدر اتحاد بدون کسی سردار کے نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص ایسا بھی تو ہونا چاہیے جو اپنی قوت و شوکت سے اس اتحاد کو قائم رکھ سکے بس وہ قہری وحدت ہو ورنہ ارادی وحدت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان تحریکات میں آپ نے جن لوگوں کو بھائی بنایا تھا انہوں نے دشمنی کا برتاؤ شروع کر دیا۔ وہ ارادی اتحاد تھا۔ جب انہوں نے چاہا زائل کر دیا

۱۔ مراد تحریکات خلافت ہیں اس کے بعد دوسری تحریکات انسداد فتنۃ ارتداد کی پیدا ہوئیں جو اس وعظ کے وقت ابتدائی حالت میں تھیں ۱۲ جامع

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خبری نامہ ضرور تحریر کریں۔

تو یہ اتحاد جو بدو ن کسی سردار کے ہولہ لڑکوں کی یاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لڑکے آپس میں دوستی کرتے ہیں اور ذرا ذرا اسی بات پر کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ آج سے یاری کٹ کر دی یہ تو نئے بھائیوں کا حال ہوا اور جو پہلے سے قدیم بھائی تھے یعنی مسلمان ان کو اصحابِ تحریکات نے قاسق اور ڈرپوک بنا کر ان سے بائیکاٹ کر کے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بائیکاٹ نہیں بلکہ بھائی کاٹ ہے کیونکہ اس کی زیادہ تر مسلمانوں ہی پر مشق کی گئی ہے تو اب ان کے ہاتھ سے دونوں جلتے رہے۔

وہی قصہ ہو گیا کہ جہانگیر نے نور جہاں کو بچپن میں شادی سے پہلے ایک موقع پر دو کبوتر دیئے تھے کہ ان کو اپنے ہاتھ میں لئے رہ میں ابھی آتا ہوں اس کے ہاتھ سے ایک کبوتر نکل گیا۔ جہانگیر نے جو واپس آ کر ایک ہی کبوتر دیکھا، پوچھا دوسرا کہاں گیا۔ نور جہاں نے کہا جہاں پناہ اڑ گیا۔ جہاں گیر نے غصہ سے کہا کہ کیسے اڑ گیا۔ نور جہاں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا جہاں پناہ ایسے اڑ گیا۔ بس جہانگیر اس ادا پر فریفتہ ہو گئے اور زبان حال سے یہ کہنے لگے۔

درون سینہ من زخم بے نشاں زدہ

بھیر تم چہ عجب تیر بے کماں زدہ

(میرے سینے کے اندر تو نے زخم بے نشاں کے مارا ہے حیرت میں ہوں کیسا

عجیب تیر بے کماں تو نے مارا ہے)

اور آخر کار نور جہاں سے نکاح کر لیا۔ واقعی دل کے آنے کا بھی کوئی قاعدہ نہیں بعض دفعہ ذرا اسی بات پر دل آجاتا ہے تو جس طرح ایک کبوتر تو اتفاقاً اڑ گیا تھا ایک کو نور جہاں نے خود چھوڑ دیا۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں کو ہندوؤں نے تو اتفاق کر کے چھوڑا اور انہوں نے اپنے قدیم بھائیوں سے نفاق کر کے انہیں خود چھوڑ دیا اب دونوں ہاتھ خالی رہ گئے ردایاں بھی اور بایاں بھی کیونکہ قدیم بھائی اصحابِ الیمین تھے۔ اور جدید بھائی اصحابِ الشمال (جامع)

افسوس مسلمان مصائب کے وقت سیاسیات میں دوسری قوموں کی دست نگری کرتے ہیں حالانکہ سیاست میں بھی شریعت کے مکمل احکام ان کے پاس موجود ہیں اور اسلامی سیاست تو وہ چیز ہے جس سے دنیا بھر کے سیاست داں سبق لیتے ہیں مگر مسلمان ہیں کہ دوسروں کے محتاج ہیں۔ بس وہ حال ہے سے

یک سب پر نا ترا بر فترق سر  
تو ہی جوئی لب ناں در بدر

اور یہ حال ہے سے

تا بز نوئے میاں قعر آب  
وز عطش و ز جوع گشتستی خراب

یعنی جیسے ایک شخص کے سر پر روٹیوں سے بھرا ہوا ٹوکرا رکھا ہو۔ اور وہ بھوک کی حالت میں اس سے بے خبر ہو کر ہائے بھوک ہائے بھوک کہتا پھرے یا ایک شخص گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہو۔ اور ہائے پیاس ہائے پیاس گاتا پھرے یہی حال آج کل مسلمانوں کا ہے۔ یہ اپنے گھر کے جواہرات سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی کوڑیوں کے محتاج ہیں مسلمانوں نے بڑی غلطی کی کہ ان تحریکات میں شریعت کی تعلیم کو بالکل چھوڑ دیا و اللہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم شریعت کو اختیار کر لو تو تشویش تمہارے پاس بھی نہ ہوگی گو تشویشنا واقعات کیسے ہی پیش آئیں کیونکہ متبع شریعت کا مذاق یہ ہوتا ہے سے

ہمہ شہر پر زخو باں منم و خیال ما ہے  
چہ کنم کہ چشم بدخونہ کند بکس نگا ہے  
رتام شہر حسینوں سے بھرا پر طا ہے میرا خیال ایک محبوب کی طرف ہے جسم بدخو کو کیا کروں  
کہ اس کے علاوہ کسی پر نظر نہیں کرتی

اس کی نظر ہر واقعہ میں ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اس کے سوا کسی پر نظر نہیں ہوتی وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے پھر تشویش کسی بس اس کو تو یہ فکر رہتی ہے کہ حق تعالیٰ راضی رہیں۔ پھر دنیا میں جو چاہے ہوتا رہو چاند سورج بھی نکلیں یا نکلیں اسے اسکی پروا نہیں ہوتی۔ اس کا تو مذاق یہ ہوتا ہے سے

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار

بگذارند و خصم طرہ یارے گیرند

ترجمہ :- (بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی کی طرف متوجہ ہو جاؤ) اور وہ یوں کہتا ہے :-

بفراغ دل زمانے نظرے بمانہ روئے  
 بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے  
 ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی داروگیر شاہی بہتر ہے  
 خاقانی اسی کو فرماتے ہیں :-

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاتانی  
 کہ یک دم با خدا بودن باز ملک سلیمانی  
 (تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک گھڑی خدا کے ساتھ مشغول  
 ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے)

واللہ جب تھوڑی دیر عارف کو حق تعالیٰ کا حضور بے کیف میسر آجاتا ہے اس کی وہ لذت ہوتی ہے جو تمام نعموں کو کا فور کر دیتی ہے پھر اس کے پاس پریشانی کہاں اس شخص کو مصیبت کے وقت یہ فکر تو ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں کہیں ناراضی کی وجہ سے تو یہ سزا نہیں دی۔ پھر جب اعمال و حالت قلب میں غور کر کے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ناراض نہیں ہیں تو اب اس کا دل قوی اور منشرح ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی کلفت میں اس کو راحت نظر آتی ہے اور گو وعدہ تو نہیں مگر وقوع اکثر یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہری واقعات تشویش سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور باوجود قلت جماعت و قلت سامان کے غالب و فائز رہتے ہیں (کہانی الحدیث لا یزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضربہم من خالفہم و لا یری لا یضربہم فی الدین خلاف من خالفہم و لو اضربوا ضرا نیہا ہم احیاناً ۱۲ جامع)

اور اگر بالفرض کبھی ان کو ناکامی بھی ہو تو اتباع شریعت کی برکت سے معاملہ الٹا نہیں پڑتا کہ قہر کی سی صورت ہو جائے آجکل تو مشکل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں پر بھی زیادتی کرنے لگتے ہیں

بھلا عورتوں اور بچوں نے کیا قصور کیا پھر اس غلطی کی وجہ سے معاملہ ہم پر ہی الٹ جاتا ہے اور قہر کی سی صورت بن جاتی ہے۔ ان تشویش ناک واقعات میں جھوٹ اور مبالغہ اور تجاوز حد و بہت ہی ہوتا ہے۔ جس سے دین برباد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی تحریر کا میں ہمارے ہی بھائیوں نے بعض مسلمانوں کی طرف ایسے جھوٹ الزامات عائد کئے ہیں کہ کوئی مسلمان ان کا مصداق ہرگز نہیں ہو سکتا خصوصاً وہ مسلمان جس کی حالت کا عرصہ دراز تک تجربہ بھی کر لیا گیا ہو پھر ان باتوں کا انجام فساد ذات البین ہوا کہ دوستوں اور بھائیوں میں عداوت اور بغض پیدا ہو گیا اور فساد ذات البین وہ بلا ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **رَأَيْتُمْ فَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَإِنَّهُمَا رَهَى الْحَالِيَةَ لَا أَقُولُ تَحْلُقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلُقُ الدِّينَ** یعنی مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرماتے ہیں کہ فساد ذات البین کو اپنے سے دور رکھو کیونکہ یہ مونڈنے والی چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ یالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے یا درکھو مصائب میں حد و شرع سے تجاوز کرنا اعلیٰ درجہ کی بے صبری ہے صابر وہی ہے جو ایسے مواقع میں شریعت پر جما رہے اور کوئی کام خلاف مرضی حق نہ کرے ایسے ہی صابرین کے لئے بشارت ہے اور انہی لوگوں کی فضیلت احادیث و قرآن میں بیان کی گئی ہے آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ** یعنی صابرین پر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی اس میں صابرین کے لئے دوسری بشارت ہے جو بلا واسطہ سائی گئی ہے۔ **بَشِيرِ الصَّابِرِينَ** (آپ صابرین کو بشارت دیدیجئے) میں بشارت بواسطہ تھی یہ بلا واسطہ ہے اور یہ مبنی ہے اس قاعدہ پر کہ تاکید سے تائیس اولیٰ ہے بعض علمائے نے اس کو **بَشِيرِ الصَّابِرِينَ** ہی کا بیان سمجھا ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ مستقل کلام ہے ماقبل کا بیان نہیں کیونکہ دونوں مستقل آیتیں ہیں پس ظاہر یہی ہے کہ دونوں کا مفہوم بھی مستقل ہو بیان کہنے میں یہ آیت مضمون سابق کی تاکید ہوگی اور مستقل ماننے میں تائیس ہے اس لئے یہی اولیٰ ہے پس میرے ذوق میں **بَشِيرِ الصَّابِرِينَ** میں بواسطہ بشارت ہے اور اس جملہ میں بلا واسطہ بشارت ہے۔ بہر حال اس میں بتلایا

گیا ہے کہ صابرین پر خاص و عام دونوں طرح کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ خاص رحمت تو آخرت میں ہوگی اور رحمت عامہ کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے صابرین کو صبر و استقلال کا ثمرہ دنیا میں بھی حق تعالیٰ اٹھلی آنکھوں دکھلا دیتے ہیں بشرطیکہ صبر کی حقیقت صحیح طور پر موجود ہو جس کو میں مفصل بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ایک تیسری بشارت تو ایسی بیان فرمائی ہے کہ وہ جزا تو ہر مومن صابر کو ضرور ہی حاصل ہے یعنی وَ اُوْدُ لِعٰثِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ کہ یہی لوگ راہِ صواب پر چلنے والے ہیں صاحب جو شخص ناگوار واقعات میں شریعت پر کامل طور پر جمارہتا ہے گو ظاہر میں اس کو کیسی ہی کلفت ہو۔ مگر دل میں اس کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ خدا کے فضل سے میں حق پر ہوں۔ دیکھئے میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص تو وہ ہے جو اپنے نزدیک صحیح راستہ پر چل رہا ہے مگر راہ میں کچھ کانٹے اور گڑھے بھی اس کو تنگ کرتے ہیں اور ایک شخص راستہ بھولا ہوا ہے اور اسے جا بجا باغات اور عمدہ عمدہ پھل ملتے جاتے ہیں غور کر کے دیکھ لیجئے کہ ان دونوں کی حالت میں فرق ہے یا نہیں بخدا زمین آسمان کا فرق ہوگا جو شخص ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اس کے قلب میں سکون و اطمینان ہوگا وہ کانٹوں اور گڑھوں کو بھی اطمینان سے طے کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ راستہ یہی ہے۔ اور جو شخص راستہ بھولا ہوا ہے اس کے قدم پر پیر کا اٹھانا بھاری ہو جائے گا اور جتنے نئے نئے باغات اور پھل پھلواریاں اُسے راستہ میں نظر آئیں گی اتنی زیادہ وحشت ہوگی کہ اے اللہ میں کدھر نکل آیا یہ باغات تو میرے راستہ میں کبھی نہ آتے تھے آج یہ کیا معاملہ ہے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ متبع شریعت کو اگر کوئی کلفت بھی پیش آتی ہے تو وہ گھبراتا نہیں کیونکہ وہ راستہ کو دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ مقصود کا راستہ یہی ہے اگر کسی وقت اس کو جان پر بھی خطرہ آتا ہے جب بھی یہ مسرت اس کا دل بڑھاتی رہتی ہے کہ بحمد اللہ میں خدا کے راستہ میں جان دے رہا ہوں اور جو شخص خدا کا مجرم ہے حدود سے گذر گیا ہے اس کو جان دیتے ہوئے یہ خوشی ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔ میں منزل مقصود یعنی جنت پر نہ پہنچوں گا بلکہ نہ معلوم کہاں جا کر گروں گا۔ اس لئے ہدایت پر ہونا واللہ بڑی بشارت ہے اور

یہ وہ جزا اور وہ نعمت ہے جو صابر مومن کو دنیا میں ضرور ہی حاصل ہوتی ہے۔

مجھے ہدایت کا نعمت ہونا ایک بار سفر میں بھونبی محسوس ہوا عرصہ ہوا کہ میں ایک بار سہارنپور سے براہ لکھنؤ کا پنورہ کا ارادہ کر کے ریل میں سوار ہوا میرے ایک دوست بابو صاحب بھی اسی گاڑی میں آکر پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے جب گاڑی چل پڑی تو آپس میں باتیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے کہا میرٹھ جاؤں گا۔ میں نے کہا ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جاتے ہوں افسوس ہے کہ یہ گاڑی تو میرٹھ نہ جائے گی۔ یہ تو لکھنؤ جائیگی اب یہ سن کر جوان کی حالت ہوئی کچھ نہ پوچھئے وہ سخت پریشان ہوئے۔ اور بار بار ادھر ادھر دیکھتے تھے۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہتا اور وہ جھلاکتے تھے کہ میاں تمہیں دل لگی سو جھی ہے یہاں خود ہی پریشانی ہے کہ میں نے یہ بڑی غلطی کی۔

سردی کا موسم تھا ان کو اس لئے اور بھی فکر تھی کیونکہ وہ بالکل بیک بینی و دوگوش تھے جنٹلمین سردی کا سامان ساتھ لیکر سفر کرنے کو عیب سمجھتے ہیں بلکہ لوٹا بھی ساتھ نہیں لیتے اس بھروسہ پر رہتے ہیں کہ جہاں پیاس لگے گی اسٹیشن پر پانی مل جائے گا پانی لیں گے نماز کی تو انھیں ضرورت ہی نہیں مگر بعض دفعہ جب اسٹیشن پر پانی نہیں ملتا اور پیاس لگتی ہے تو ان کا بُرا حال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار سفر میں ایک جنٹلمین صاحب نے ایک اسٹیشن کے قریب مجھ سے لوٹا مانگا کہ میں اس میں پانی لے سکتا ہوں میں نے لوٹا دے دیا اس میں کچھ پانی موجود تھا مگر جنٹلمین صاحب نے اسے پھینک دیا کیونکہ اسٹیشن قریب آنے والا تھا اتفاق سے وہاں جو اترے تو پانی نہ ملا اب آپ بڑے کھسیا نے ہوئے اور خود ہی کہنے لگے



کہ بڑی حماقت ہوتی میں نے پھلا پانی بھی پھینک دیا۔ یہ واقعی یہ لوگ اپنے کو اصولی سمجھتے ہیں یہ ناک بھی اصولی نہیں ہاں وصولی تو ہیں کہ رقیس وصول کرنا خوب جانتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی اصول ہے کہ بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑ دیں تو وہ بالخصوص بھی اسی مذاق کے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور ان کے ساتھ کوئی کپڑا نہ تھا۔ کیونکہ یہ بھی آجکل اصول میں داخل ہے

خلاصہ یہ کہ ان کو کسی طرح بشارت و اطمینان حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ مجھ میں اور ان میں اس وقت کس بات کا فرق ہے میں مطمئن کیوں ہوں اور یہ بے چین کیوں ہیں۔ بس اس کے سوا کچھ فرق معلوم نہ ہوا کہ میں راہ پر تھا اس لئے مطمئن تھا اور وہ بے راہ تھے اس لئے بے چین تھے اس وقت معلوم ہوا کہ واقعی راہ پر ہوتا بھی بڑی اطمینان بخش دولت ہے بے راہ گو ظاہر میں کتنا ہی سامان رکھتا ہو اس کے دل کو اطمینان و سکون حاصل نہیں ہو سکتا پس *أُولَٰئِكَ هُمُ الّٰهُتَدٰوْنَ* (اور یہی لوگ راہ پر ہیں چلنے والے) حقیقت میں بڑی بشارت ہے اور راہ پر ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو خود محقق ہوں کہ راستہ کو دیکھ رہا ہو یا کسی محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دیدے جیسا کہ ظاہری راستہ پر چلنے کی بھی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو خود سوا نکھا ہو کہ آنکھوں سے راستہ کو دیکھتا ہو اور جو خود اندھا ہو تو کسی سوا نکھے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر منزل پر پہنچ سکتا ہے یہی قاعدہ طریق حق کا ہے۔ واقعی محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے آدھا غم تو فوراً ہی ہلکا ہو جاتا ہے۔

میں نے خود بخبر کیا ہے کہ بیماری میں محقق طبیب کی صورت دیکھنے ہی سے آدھا مرض جاتا رہتا ہے اسی طرح محقق عارف کے پاس جانے اور اس کی تسلی بخش باتوں کے سننے سے آدھا مرض تو خود زائل ہو جاتا ہے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عارف کی محض صورت دیکھنے ہی سے مرض جاتا رہتا ہے مولانا فرماتے ہیں ۷

اے لقاء تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قبل و قال

آپ کی زیارت ہی ہر سوال کا جواب ہے آپ سے بلا شک و شبہ مشکل حل ہوتی ہے اور محقق کی علامت یہ ہے کہ اس کی باتوں سے دل کو تسلی اور اطمینان ہوتا ہے غیر محقق کی باتوں سے اطمینان نصیب نہیں ہوتا جیسے سفر میں اگر آپ کے ساتھ کوئی ایسا رہنا ہو جس کو واقع میں راستہ معلوم نہیں تو اس کی باتوں سے آپ تاڑ لیتے ہیں کہ یہ واقف طریق نہیں ہے۔ تاواقف کی باتیں کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی ہوتی ہیں جن سے سمجھنے والوں کو اس کا ناواقف ہونا خود بخود معلوم ہو جاتا ہے اور واقف کی باتیں دل میں گھر کر لیتی ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ ناواقف کو اپنی باتوں پر خود ہی اطمینان نہیں تو دوسرے کو اس سے اطمینان کا فیض کیسے پہنچے اور جاننے والا جو کچھ کہتا ہے اطمینان سے کہتا ہے تو دوسرے پر بھی اس کے اطمینان کا اثر پڑتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں -

وعدہ باشد حقیقی دلپذیر و وعدہ ہا باشد مجازی تا سہ گیر

(حقیقی وعدہ سے دل کو یقین ہوتا ہے مجازی وعدہ سے اطمینان نہیں ہوتا)

پس راہ پر ہونے کی صورت یہ ہے کہ کسی محقق سے تعلق پیدا کرو۔ جہی آپ کو مصائب میں کمال صبر کی دولت حاصل ہو سکتی ہے اور اسی وقت آپ کو یہ بشارتیں صلوات و رحمت ہدایت کی حاصل ہو سکتی ہیں پس اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور خلاصہ و عطا پھر بیان کئے دیتا ہوں کہ مصائب میں شریعت نے ہم کو صبر کی تعلیم کی ہے مگر صبر فقط ترک جزع و فرع کا نام نہیں۔ بلکہ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ کسی حال میں کسی مامور بہ میں خلل نہ آوے اور جو دینی معمولات پہلے سے اختیار کر رکھے ہیں ان پر مصیبت میں بھی دوام رکھا جاوے اگر اس طرح صبر کیا جاوے تو یہی ہر مصیبت اور ہر غم کا علاج بھی ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور ہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین والحمد للہ رب العالمین و صلے اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ

اجمعین

## شریعت اور طریقت

اس پر فتن زمانہ میں مجملہ دوسری عام غلطیوں کے ایک اہم اور بڑی غلطی علم تصوف کے فہم میں ہوئی، کسی نے قول فعل کی بے قیدی کا نام تصوف رکھ لیا۔ کسی نے چند ظاہری رسوم کو تصوف کا نام دیدیا۔ اور کسی نے صرف کثرت اوراد و وظائف کو تصوف سمجھ لیا۔ علیٰ ہذا تصوف کے مسائل سمجھنے میں صدہا غلطیاں کیں جن سے ایک طرف تو ان کے عقائد درست نہ رہے بلکہ بعض تو شرک تک میں مبتلا ہو گئے۔ اور دوسری طرف بعض حضرات نے یہاں تک تجاوز کیا کہ اصل تصوف کا ہی انکار کر بیٹھے اور حضرت اولیاء اللہ رحمہ اللہ کی شان میں بے ادبی و گستاخی کے خوگر ہو گئے۔ تیرہ صدیوں کے مسئلہ مسائل تصوف کو کتاب و سنت سے خارج اور شریعت کے خلاف سمجھ کر تصوف کے نام سے کوسوں دور بھاگنے لگے، یہ لوگ نہ صرف بزرگان دین کے برکات و فیوضات محروم ہی رہے بلکہ ان کے قلوب میں قساوت پیدا ہو گئی۔ ان کے علاوہ بعض حضرات تصوف کے منکر تو نہیں ہیں، حضرات اولیاء کے معتقد بھی ہیں لیکن علم تصوف کو شریعت کے علاوہ ایک علیحدہ علم سمجھتے ہیں اور مسائل تصوف کو غیر ثابت بالسنہ جانتے ہیں ان جہاں امور کے پیش نظر کتاب شریعت اور طریقت مرتب کی گئی ہے جس کے جملہ مضامین حضرت حکیم الامت مجدد الملتہ الشاہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کا انتخاب ہیں۔ اس میں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، افکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجیہات، تعلیمات و مسائل مع دلائل و حقائق، سالک کے لئے طریق عمل اور ان کے متعلق ضروری تفصیلات مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں کتب فقہ کی طرز بہ ابواب و فصول کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے، شاید ہی تصوف کا کوئی ایسا اہم مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اس کے مطالعہ سے اسلامی تصوف و سلوک کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کا طریقہ نہایت واضح اور آسان ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی تضاد نہیں۔

قیمت بمسئلہ بیس روپے علاوہ خرچہ ڈاک

مکتبہ تھانوی منصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی

مکتبہ تھانوی منصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی  
ایم۔ اے جناح روڈ

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(رواه البخاري)

وَعظ مسمی بہ

تَعْظِيمُ الْعِلْمِ

تَقْسِيمُ الْعِلْمِ

مِنْجِلُ ارشاد

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب کھانوی  
 رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ  
 محمد عبد المنان عفی عنہ

مکتبہ کھانوی۔ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی  
 ایم۔ اے۔ جناح روڈ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

وَعظمتی  
تَعظِيمُ الْعِلْمِ  
مع  
تَقْسِيمُ الْعِلْمِ

ایں	متنی	کہ	کیف	لم	ماذا	مزاى شك	من ضبط	المستعمل	الاشتات
ہوں ہوا	کس ہوا	کس ہوا	کیسے ہوا	کس ہوا	کیا ضرورت	کیسے ہوا	کیسے ہوا	کیسے ہوا	متفرقات
وہی۔ صدر عبد الرب	ہا شیخان	سگھڑا ۵ منٹ	کھڑے ہو کر	دارس کے سالانہ جلسہ کی تقریب تھی۔	علم دین کی ضرورت اور اس کی اقسام	علماء و طلباء کو یا مخصوص تحریکات حادثہ کے شرکاء کو	احقر ظفر احمد عرفا، اللہ عتقہ عثمانی تحف نوی۔	۳۵۰۰ تقریباً	حضرت حکیم الامت کو ذکا و حرارت کی شراکت تھی پھر بھی بہت زور کا بیان تھا

الحمد لله وحده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شره وانفسنا  
ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد  
ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا و مولانا محمد اعمده ورسوله  
صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم۔

اصابع فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم ۝  
اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ

تَظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً مَا مِنْ الشَّيْءِ مِنْ يُجَادِلُنِي اللَّهُ بِعِلْمِهِ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ  
 (کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ  
 کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ زمین میں موجود ہیں اور کامل کر دیں تمہارے ادب پر اپنی  
 نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں  
 جدال کرتے ہیں بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے)

یہ ایک آیت ہے سورہ لقمان کی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے بعض دلائل توحید ارشاد فرما کر منکرین  
 توحید کی شکایت کی ہے اور ان کا انکار چونکہ بلا دلیل بلکہ غلات دلیل ہے اس لئے اس کو مجادلہ  
 سے تعبیر فرمایا ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا لیکن میرا مقصود اس وقت مضمون توحید کو بیان کرنا  
 نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی مخاطب توحید کا منکر نہیں بلکہ مجھ کو علم دین کی ضرورت اور اس کے  
 بعض انواع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون اگرچہ منطوقاً اس آیت کا مدلول  
 نہیں ہے مگر اس سے مفہوم ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ تقریر استدلال سے واضح ہو جائے گا  
 پس یہ آیت توحید پر تو صراحتاً دلالت کرتی ہے اور علم کی ضرورت اور اس کے اقسام پر اشارتاً  
 دلالت کر رہی ہے اور چونکہ اس وقت ایک علمی مقام میں بیان ہو رہا ہے اور میرا معمول ہمیشہ  
 یہ ہے کہ مناسب محل مضمون بیان کیا کرتا ہوں اس لئے دوسرے مضمون کو جو اشارتاً اس آیت  
 سے مستنبط ہو رہا ہے اختیار کرنے میں ترجیح دی گئی لیکن ربط کے لئے دلیل توحید کو بھی بیان  
 کر دینا مناسب ہے کیونکہ ضرورت علم کی طرف اس آیت کے دوسرے جزو میں اشارہ ہے  
 اور پہلے جزو میں صرف توحید کی دلیل مذکور ہے تو پوری آیت کی تفسیر اسی وقت سمجھ میں آوے گی  
 جبکہ دونوں اجزاء کو بیان کر دیا جائے۔ مگر پہلے جزو کا بیان محض ربط ہی کے لئے ہو گا اور  
 اصل مقصود علم کے متعلق بیان ہے جو کہ دوسرے جزو میں مذکور ہے

اب سمجھنا چاہئے کہ وہ توحید کی دلیل کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَمْ تَرَ اَنْتَ  
 اللَّهُ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنْ تَعْقِلُوْا كَمَا تَعْقِلُوْنَ  
 (نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہاری تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں  
 اور جو کچھ کہ زمین میں موجود ہیں یہاں سَخَّرَ لَكُمْ کے معنی وہ مراد نہیں ہیں جو اردو محاورہ میں

تسخیر کے لفظ سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ معنی محل اشکال بھی ہیں۔ لیکن منشاد اس اشکال کا محض غلط محاورہ ہے اور یہ مزکہ (پھسلنے کی جگہ) ہے اہل علم کے لئے۔ بعض علماء بھی محاورات السنہ میں فرق نہیں کرتے اس لئے ان کو قرآن میں اشکالات پیش آجاتے ہیں لیکن اہل علم کو پھر بھی یہ غلطی واقع ہوتی ہے کیونکہ ان میں اکثر حضرات محاورات و لغات میں فرق جانتے ہیں۔ البتہ ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ غلطی زیادہ پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض ترجمہ ہی کو دیکھتے ہیں اور لغات عربیہ و محاورات قرآن سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ پس یہ لوگ اکثر قرآن کے محاورات کو اپنی زبان کے محاورات پر قیاس کر کے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی نے سَخَّرَ لَكُمْ کا ترجمہ کسی جگہ یہ دیکھا ہو ”مسخر کر دیا تھا تمہارے لئے“ پھر اس کو محاورہ اردو عربی میں غلط ہو گیا ہو اور اس نے تسخیر کے لفظ کو اردو محاورہ پر محمول کیا ہو۔ اور دوسرے معنی کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو۔ کیونکہ اس کے ذہن میں تسخیر کے وہی معنی بسے ہوئے ہیں جو محاورہ اردو میں مستعمل ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو بات بسی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے دیوبند میں مجھے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق لکھ کر یہی تھی کہ اس کو صاف کر دو کسی نے حضرت سے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تھا جس کے جواب میں آپ نے وہ تحقیق لکھی تھی مسئلہ تصور شیخ صوفیہ کا ایک شغل ہے جو زمانہ قدیم میں رائج تھا۔ لیکن اب محققین نے اس شغل سے منع کر دیا ہے کیونکہ اب عقول سے سلامتی رخصت ہو گئی ہے۔ بہت لوگ اس شغل سے غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں باقی اگر کسی سالک کی فہم سلیم ہو تو اب بھی اسکی تعلیم کا مضائقہ نہیں۔ رفع خطرات و حصول یکسوئی کے واسطے یہ شغل بہت نافع ہے۔ غرض میں اس مسئلہ کی نقل لکھ رہا تھا کہ ایک نووارد طالب علم جو اب تک معقول میں مہنک تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہیں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا کا۔ بس اس غریب کے نزدیک وہی ایک شیخ تھا اور تو سب جلا ہے ہی تھے سو اس کا منشا یہی تھا کہ معقول پڑھنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں شیخ بوعلی سینا ایسا ہوا تھا کہ شیخ کا لفظ سن کر ادھر ہی

ذہن منتقل ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کا خیال نہ گیا کہ کوئی اور بھی شیخ ہو سکتا ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ جب علوم میں وسعت نہیں ہوتی تو ہر شخص ہر بات کو اپنے علم ہی پر محمول کرتا ہے۔ یعنی جو بات اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اسی کی طرف انتقال ذہن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقص الفہم لوگوں کے صفات الہیہ کو اپنی صفات پر قیاس کیا۔ قرآن میں حق تعالیٰ کے لئے وجہ دید و سماع و بصیر و رحمت و غضب وغیرہ کا ذکر دیکھ کر بعض لوگ تجسم کے قائل ہوئے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن میں صفات بشریہ ہی بسی ہوئی ہیں۔ اس لئے ان الفاظ سے تجسیم کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو گیا ہے

جنگ ہفتاد و دو دولت ہم را عذر مینر

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زردند

(بہتر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ

چل سکا ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی)

اسی طرح ترجمہ دیکھنے والوں نے تسخیر کا لفظ تعویذ گنڈوں ہی میں سنا ہوگا اس کے سوا اور کسی جگہ اس لفظ کو نہ سنا ہوگا۔ پس قرآن میں **سَخَّرَ لَكُمْ** کا ترجمہ "مسخر کر دیا تمہارے واسطے" دیکھ کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوا۔ اب وہ اس معنی کو ذہن میں لیکر علماء کے پاس پہنچے اور اپنے نزدیک بڑا اشکال لے کر آئے کیونکہ تسخیر کے معنی ان کے ذہن میں تابع و مطیع و منقاد کرنے کے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں اگر ہم کو بارش کی ضرورت ہو اور ہم بادل سے کہیں کہ برس جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ برسے گا و علیٰ ہذا القیاس اگر سمت در میں طوفان آ رہا ہو اور ہم ہوا سے یہ کہیں کہ تھم جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ تھمے گی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس معنی کے اعتبار سے ہماری مسخر نہیں ہیں۔ اب ان کو قرآن پر اشکال ہوا کہ قرآن میں تو یہ فرمایا ہے کہ تمام چیزوں کو تمہارے واسطے مسخر کیا گیا ہے اور حالت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں سو بات یہ ہے کہ اس شخص نے تسخیر کا لفظ تو قرآن سے لیا اور معنی



اردو محاورہ کے موافق کئے اس سے یہ اشکال پیدا ہوا حالانکہ اس کو چاہئے تھا کہ تفسیر جس زبان کا لفظ ہے اسی زبان کے محاورات کے موافق اس کے معنی لیتا تو یہ اشکال نہ پڑتا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اکثر اشکالات کا سبب یہی ہے کہ لوگ حقائق کو تو سمجھتے ہیں محض غلط محاورات سے شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک شخص تھا: بھون میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے قرآن پر کچھ شبہ ہے جس کو میں بعد میں بیان کروں گا پہلے آپ اس آیت کا ترجمہ کر دیجئے وَوَجَدُكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ۔ میں سمجھ گیا کہ اس کو کسی ترجمہ کے دیکھنے سے اشکال پیش آیا ہے میں نے کہا سنئے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے "اور پایا خدا تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے میں نے کہا فرمائیے وہ کیا اشکال ہے کہنے لگے اے ابو! تو کچھ بھی نہیں۔ سو منشاء اشکال کا یہ تھا کہ بعض مترجمین نے اس آیت کے ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ پایا آپ کو گمراہ الخ اور غالباً اس زمانہ میں اردو کا محاورہ گمراہ کے بارہ میں فارسی محاورہ کے موافق ہوگا۔ فارسی میں گمراہ ناواقف کو بھی عام ہے۔ یہی محاورہ اس وقت اردو کا بھی ہوگا۔ اس لئے ان حضرات نے ضال کا ترجمہ اس جگہ گمراہ سے کر دیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اردو محاورہ فارسی کے مطابق اس وقت بھی نہ ہو لیکن مترجم نے فارسی محاورہ کا لحاظ کر کے یہ ترجمہ کیا ہو اور عوام کی گمراہی کا اندیشہ اس لئے نہ ہوا ہو کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ عوام کو ترجمہ قرآن کسی عالم استاد سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے تو ان کو اطمینان تھا کہ پڑھاتے ہوئے ہم بتلا دیں گے کہ اس جگہ فارسی محاورہ کے موافق یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے انہوں نے آزادانہ یہ لفظ لکھ دیا لیکن اب اردو کا محاورہ بدل گیا ہے آجکل گمراہ محض ناواقف کو نہیں کہتے بلکہ یہ لفظ اس زمانہ میں مذمت کی جگہ بولا جاتا ہے یعنی جو شخص بعد وضوح راہ حق کے اس راہ کو چھوڑ دے۔ نیز آجکل عوام ترجمہ قرآن کو علماء سے سبقاً سبقاً پڑھتے بھی نہیں اس لئے ان کو اشکالات پڑتے ہیں کہ انہوں نے گمراہ کا لفظ دیکھا جو کہ فارسی لفظ ہے اور معنی لئے اردو محاورہ کے موافق اس وجہ سے شبہ پیدا ہوا حالانکہ ان کو لازم تھا کہ جو لفظ جس زبان کا ہے اس کے معنی اسی زبان کے محاورہ کی موافق لیتے۔

پس سمجھنا چاہیے کہ گمراہ کے دو معنی ہیں ایک وہ جس کو راستہ معلوم ہی نہ ہو اس معنی کیلئے آجکل اردو میں ناواقف کا لفظ مستعمل ہے۔ دوسرے وہ جو بعد بتلانے کے بھی غلط راستہ پر چلے اور عربی میں لفظ ضال بھی ان دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں ضال اور گمراہ سے پہلے معنی مراد ہیں یعنی ناواقف جس پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام علوم حق تعالیٰ ہی کے بتلانے سے حاصل ہوئے اس میں کیا اشکال ہے۔ اور دوسرے معنی جو ضال اور گمراہ کے ہیں وہ اس آیت میں ممتنع الارادہ ہیں وہ ہرگز مراد نہیں خوب سمجھ لو۔ تو جس طرح خلط محاورہ کی وجہ سے اس آیت میں اشکال پڑا تھا اسی طرح یہاں بھی ممکن ہے کسی کو اشکال پیش آیا ہو۔ کیونکہ تسخیر کے معنی ہمارے محاورہ میں یہ ہیں کہ کسی کو ایسا تابع کر دیا جائے کہ جو ہم کہیں وہی کرنے لگے جیسا کہ تسخیر کے لئے تعویذ گنڈے نکھوئے جاتے ہیں اور وہاں تسخیر کے یہی معنی مراد ہوتے ہیں کہ دوسرا شخص ہمارا ایسا منقاد و مطیع ہو جائے کہ جو ہم کہیں وہی کرنے لگے۔ سو سمجھنا چاہیے کہ تسخیر کے صرف یہی معنی نہیں ہیں بلکہ عربی میں تسخیر کے ایک اور معنی بھی ہیں یعنی کام میں لگا دینا اور اس آیت میں ہی دوسرے معنی مراد ہیں پہلے معنی مراد نہیں کیونکہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں ہماری منقاد و مطیع نہیں ہیں کہ جو ہم کہیں وہی کرنے لگے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مہمان تمہارے یہاں آوے اور تم اس کی آسائش کے لئے اپنے نوکروں سے کام لو تو وہ نوکر مطیع تو تمہارے ہیں مگر تم نے اس وقت کام میں اس مہمان کے لگا دیا تو تمہارے کہنے سے یہ پانچ چہ گھنٹے جو نوکر اس کے کام میں لگے رہے یہ بھی تسخیر ہے حالانکہ وہ اس کے نوکر نہیں بلکہ تمہارے مطیع ہیں تم نے صرف ان کو اس کے کام میں لگا دیا ہے اور لعنت عربیہ کے موافق کسی کو کسی کے کام میں لگا دینا بھی تسخیر کہلاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے آسمان و زمین وغیرہ کو تمہارے واسطے کام میں لگا دیا ہے پس یہی تسخیر ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں تمہاری مطیع نہیں بلکہ ممکن ہے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور انسان کو بھی خبر نہ ہو کہ میرے کام میں کون کون لگا ہوا ہے لیکن چونکہ تم کو ان سے منافع حاصل ہو رہے ہیں اور راحت پہنچ رہی ہے اور ان سے

تمہارے کام چل رہے ہیں اس لئے دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے یعنی تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔ پس اب

سَخَّرَ لَكُمْ فِي سَبِيحِ نَهْرِكُمْ  
ابرو بادومہ و خورشید و فلک در کارند

تا تو نالے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار

شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

یعنی بادل اور ہوا اور چاند و سورج سب کے سب اپنے اپنے کام میں اس لئے لگے ہوئے ہیں

کہ تم کو روٹی مل جاوے اور پیٹ بھر کے تم خدا کی عبادت میں لگو اور غفلت میں عمر نہ گزارو

دوسرے شعر میں از بہر تو کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے نفع کے لئے اور تمہاری خاطر سے یہ سب

مختلف کاموں میں لگائے ہوئے ہیں اور جو کام جس کے سپرد ہے اس کو اچھی طرح ہر اک

بجالا رہا ہے۔ بہر تو کہ یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع کر دیا گیا ہے۔ پس از بہر تو

سرگشتہ و فرمانبردار کے وہی معنی ہیں جو سَخَّرَ لَكُمْ کے ہیں۔ آگے بطور تفریح کے فرماتے

ہیں کہ شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری۔ یعنی جب یہ تمام چیزیں باطاعت احکام

الہیہ تکوینہ تیرے کام میں لگی ہوئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیرے اوپر ربیبے بڑی

حق تعالیٰ کی نعمتیں ہیں کہ ان سب کو تیرے کام میں لگا رکھا ہے تو یہ بہت ہی بے انصافی

ہوگی کہ احکام الہیہ تشریحیہ کی فرمانبرداری نہ کرے کیونکہ جس قدر کسی پر منعم کا احسان زیادہ

ہوتا ہے اسی قدر اس پر اس منعم کا شکر زیادہ واجب ہوتا ہے اور اگر وہ ناسپاسی کریگا

تو سب سے زیادہ مورد عتاب بھی ہوگا۔ پس انسان بھی اشرف المخلوقات اسی وقت ہے

جبکہ وہ احکام الہیہ کا اتباع کرے ورنہ بصورت مخالفت جمادات و حیوانات ہی اس سے

اچھے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام کی مخالفت تو نہیں کرتے۔

اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شرف انسان کے لئے لوازم ذات سے نہیں

بلکہ بنی شرف کا اعمال ہیں۔ بعض لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ شرف کو لوازم ذات سے سمجھتے ہیں

گو افعال کیسے ہی ہوں۔ بعض لوگ فخر کرتے ہیں کہ ہم شیخ ہیں یا سید ہیں اور اس بنا پر وہ اپنے

کو دوسری قوموں سے مطلقاً افضل سمجھتے ہیں گو ان شیخ و سید صاحب کے اعمال جلاہوں سے

بھی بدتر ہوں سو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر انسان کے اعمال درست نہ ہوں تو وہ جلاہوں سے تو کیا افضل ہوگا وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہوگا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ رَیہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں، بنا، شرفِ اعمالِ صالحہ و ایمان ہے ورنہ ۔

النَّاسُ مِنْ جَهْدِ التَّمْتَالِ الْكَفَاءِ اَبُوهُمَا اَدَمُ وَالْاُمُّ حَوَاءُ

یعنی صورت کے اعتبار سے سب آدمی یکساں ہیں کیونکہ سب کے سب آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ البتہ اگر اعمال درست ہوں تو پھر شرفِ نسب بھی ایک درجہ میں باعثِ فضیلت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس پر فخر کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہاں توحید بالنعمة (اظہارِ نعمت) جائز ہے۔ اور اگر انسان ہو کر اعمالِ خلافِ انسانیت کرے تو پھر فخر و شرف کیسا ہاں اس صورت میں بھی استعداد تو اس کے اندر موجود ہے اگر اپنی استعداد کی طرف عود کرے تو پھر وہ اشرف المخلوقات ہے اور یہی محل ہے اس آیت کا وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَا هُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا۔

اس آیت میں جو بنی آدم کو عموماً مکرم کہا گیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ ہر انسان میں استعداد ایسی موجود ہے کہ اگر وہ اس سے کام لے تو پھر ساری مخلوق سے زیادہ مکرم و محترم ہو سکتا ہے اور اگر اعمالِ بد ہوئے تو کچھ بھی نہیں۔ بہر حال انسان پر جب نعم الہیہ اور مخلوقات سے زیادہ ہیں تو نافرمانی و اعمالِ بد کی صورت میں وہ دوسروں سے زیادہ موردِ عتاب ہوگا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس پر تعینیں زیادہ ہوتی ہیں اس پر تشکیر بھی زیادہ واجب ہوتا ہے اور ناشکری کی صورت میں اس پر عتاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ دیکھو رعایا میں سے ایک معمولی آدمی اگر احکامِ شاہی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس درجہ موردِ عتاب نہیں ہوتا جیسا کہ ایک درباری آدمی خلاف ورزیِ احکام پر موردِ عتاب ہوتا ہے۔

الغرض انسان اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مخلوق اس کی

غلام ہے بلکہ اس کی مثال محض مہمان جیسی ہے کہ سارا سامان اسی کے واسطے ہوتا ہے مگر وہ مالک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے اور اشارہ کی صورت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک قضیہ شرطیہ ہے جس کے مقدم و تالی میں بظاہر ربط نہیں ہے مگر اس مقدمہ کے ملا لینے کے بعد ربط پیدا ہو جاتا ہے تو جس مقدمہ پر آیت کا مربوط ہونا موقوف ہے اس پر بھی آیت کی دلالت لازمی ہے گو بطریق اقتضا ہی سہی۔ وہ آیت یہ ہے وَ لَوْ يُؤْخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكُوا عَلَىٰ ظُهُرِهِمْ زِينَةً رَاسِهِمْ (ترجمہ) اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے۔

اس آیت میں بظاہر مقدم و تالی میں ربط نہیں کیونکہ آدمیوں کے افعال پر مواخذہ کرتے کا نتیجہ ظاہر میں آدمیوں ہی کی ہلاکت ہو سکتی ہے نہ کہ تمام حیوانات کی ہاں اگر یہ فرماتے وَ لَوْ يُؤْخِذُ اللَّهُ الْمَخْلُوقَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكُوا عَلَيْهَا مِنْ زِينَةِ رَاسِهِمْ (ترجمہ) اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتی ہے تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے)

یا یوں فرماتے وَ لَوْ يُؤْخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكُوا عَلَيْهَا مِنْ زِينَةِ رَاسِهِمْ (ترجمہ) اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی انسان کو نہ چھوڑتے)

تو اس صورت میں ربط ظاہر تھا لیکن آیت اس طرح وارد نہیں ہوئی وہاں تو مواخذہ اعمال انسان پر تمام حیوانات اور جاندار چیزوں کی ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ کہ انسان کے گناہوں سے تمام مخلوق ہلاک ہو۔ ان دونوں مقدموں میں جوڑ کیا ہے۔ مگر تقریر گزشتہ کے ملانے سے اب اس اشکال کا جواب ظاہر ہے اس آیت کے ساتھ وہ مقدمہ ملا لیجئے کہ انسان کے لئے سب کائنات پیدا ہوئے ہیں پس اب ربط پیدا ہو گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ انسان تو اس صورت میں اپنے گناہوں کی وجہ ہلاک ہوتا اور بقیہ مخلوقات اس لئے ہلاک

ہوئیں کہ وہ سب انسان کے لئے پیدا ہوئیں تھیں اور قاعدہ ہے الشئی اذا اخلا  
عن غایۃ انتفی (چیز جب غرض و غایت سے خالی ہوتی ہے تو منتفی ہو جاتی ہے)  
جب انسان ہی نہ رہا جس کے لئے یہ سب پیدا ہوئے تھے تو اب ان کے باقی رہنے میں  
کیا فائدہ اس لئے یہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

الغرض انسان اس عالم بمنزلہ مہمان کے ہے اور حق تعالیٰ ہماری عادت کے  
موافق ہمارے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں اور معزز مہمان کے بارے میں ہماری عادت یہ ہے  
کہ مہمان کے آنے سے پہلے سب کام درست کر دیا جاتا ہے اس کی نشست و برخاست  
کے لئے کمرہ صاف اور درست کر دیتے بستر وغیرہ انتظام کر دیتے اور تمام ضروریات کو  
پہلے سے مہیا کر دیتے ہیں جس سے بعض دفعہ ناواقف دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ  
اس کمرہ کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کیوں کیا جا رہا ہے بلکہ ممکن ہے کہ کوئی نادان سامان  
دیکھ کر یوں سمجھنے لگے کہ شاید مالک کو اس کمرہ ہی سے زیادہ محبت ہے اسی لئے وہ اس کو  
زیادہ آراستہ رکھنا چاہتا ہے یا اس سامان ہی کو مقصود سمجھ جائے کہ اس کا محفوظ کرنا او  
قریب سے رکھنا ہی مالک کو منظور ہے مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ نہ اس کمرہ سے مالک  
کو کوئی خاص محبت ہے نہ اس سامان کی حفاظت مقصود ہے بلکہ یہ سب کچھ کسی کی آمد  
کے لئے انتظام ہے چنانچہ ہفتہ دو ہفتہ کے بعد جب مہمان پہنچ جاتا اور اس تمام سامان  
میں تصرف کرنے لگتا ہے اس وقت حقیقت شناس کے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے  
لیکن نادان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مہمان تو ایک یا دو ہفتہ کے بعد آیا اور سامان پہلے  
مکمل ہو چکا کمرہ بہت پہلے سے آراستہ ہے تو وجود میں یہ سامان اور کمرہ کی آراستہ مقدم  
ہے اور مہمان کی آمد مؤخر ہے اور مقدم مؤخر سے افضل ہوتا ہے اس لئے یہ سامان  
مہمان کے تابع نہیں۔ غرض یہ بیوقوف تقدیم وجود ہی کو باعث شرف سمجھتا ہے۔ پھر قاعدہ  
یہ ہے کہ مہمان کے چلے جانے کے بعد بھی سامان کو فوراً منتشر نہیں کیا جاتا اس سے  
نادان کو سامان کے مقصود ہونے کا اور زیادہ شبہ ہو جاتا ہے کہ تقدیم فی الوجود و تاخیر  
فی البقاء اس کی علامت ہے کہ یہ سامان مہمان کے واسطے نہیں ورنہ اس کے چلے جانے

کے قتل ہی منتشر کر دیا جاتا مگر عاقل کے نزدیک یہ بھی اسی کی علامت ہے کہ یہ سب سامان مہمان ہی کے واسطے تھا کیونکہ مہمان عزیز کے سامنے سامان کو منتشر نہیں کیا کرتے تاکہ اسکو ایک سنت کے لئے بھی تکلف نہ ہو چلنے وقت تک سارا سامان اسی طرح آراستہ رکھا جاتا ہے اس کی رخصت کے بعد توقف سے سامان کو منتشر کیا کرتے ہیں۔ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہماری عادت مہمان کے واسطے یہ ہے تو آپ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے بھی ہماری ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کیا ہے۔ چنانچہ سورہ حم میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ تمام کائنات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے اور دیگر آیات و احادیث سے یہ معلوم ہے کہ فنا پہلے انسان کا ہوگا اس کے بعد دوسری کائنات فنا ہوں گی۔ اس سے نادان کو غلطی ہو سکتی ہے کہ اگر انسان مقصود ہوتا اور یہ کائنات اس کے لئے پیدا ہوتی تو اس کی طرف توجہ بھی سب سے پہلے ہوتی حالانکہ اس کو سب کے بعد پیدا کیا گیا ہے مگر یہ محض نادانی ہے کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ غایت ہمیشہ مقدم فی التصور اور مؤخر فی الظہور ہوا کرتی ہے تو انسان کا ظہور مؤخر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ توجہ بھی اس کی طرف بعد میں ہوتی بلکہ اصل مقصود خلق عالم سے انسان کا ظہور تھا لیکن حق تعالیٰ نے انسان کی آسائش کے لئے نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ انسان ایک معزز مہمان ہے اس کی تمام ضروریات کو پہلے سے پیدا کر دیا یعنی بسائط کو۔ لیکن بسیط سے مراد یہ نہیں کہ وہ اشیاء بالکل ترکیب سے خالی ہیں فاقد الاجزاء ہیں بلکہ بسیط سے مراد یہ ہے جس میں ترکیب بصنۃ العباد نہیں ہے چنانچہ جتنی چیزیں انسان کی ضرورت کی تھیں ان کے اصول ہر وقت عالم میں موجود ہیں انسان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ ان میں ترکیب و تحلیل کر کے جو کچھ چاہے تیار کر لے مثلاً درخت پہلے سے موجود ہیں انسان نے آکر اس کو کاٹا اور پھر لکڑی تختے کر لیاں وغیرہ بنالیں۔ خدائے گیبوں پیدا کر دیا جس کو پیس کر آٹا بنایا جاتا اور پانی میں ملا کر گوندھا جاتا اور آگ پر رکھ کر روٹی پکانی جاتی ہے۔ اسی طرح جانوروں سے دودھ نکلتا اور اس سے گھی بنایا جاتا اور اس میں مٹھانی وغیرہ ملا کر حلوا تیار کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام چیزوں میں غور کر لیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کا

کام صرف تحلیل و ترکیب ہے اعدام و ایجاد انسان کا کام نہیں یعنی نہ وہ کسی چیز کو اپنے پاس سے وجود دے سکتا ہے نہ کسی کے وجود کو سلب کر سکتا ہے لیکن بعض لوگ تحلیل و ترکیب ہی کو ایجاد و اعدام سمجھتے ہیں اس لئے اپنے کو موجود کہنے لگے۔ چنانچہ نمرود کو یہی غلطی پیش آئی تھی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس نے وجود صالح پر دلیل کا مطالبہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایک کھلی ہوئی دلیل بیان فرمائی کہ "رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ" کہ میرا رب وہ ہے جو چلاتا ہے اور مارتا ہے۔ تو نمرود کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یہ کہہ کر اس نے قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلایا جن میں سے ایک واجب القتل تھا اس کو تو رہا کر دیا اور ایک قیدی رہائی کے قابل تھا اس کو قتل کر دیا۔ حالانکہ یہ احیاء و اماتت نہ تھا کیونکہ احیاء کے معنی حیات بخشنے کے ہیں جس قیدی کو نمرود نے رہا کیا تھا اس کو پہلے سے حیات حاصل تھی نمرود نے اس کو اپنے گھر سے حیات نہ دی تھی اور اماتت ازہاق روح کا نام ہے اور جس قیدی کو اس نے قتل کیا تھا اس میں نمرود کا فعل صرف اس قدر تھا کہ اس نے اس کی گردن جدا کر دی اب یہ عادیۃ اللہ ہے کہ انگلی یا ہاتھ کے جدا کر دینے سے جان نہیں نکلتی اور گردن کے جدا کر دینے سے جان نکل جاتی ہے پس گردن کا جدا کرنا نمرود کا فعل تھا اس کے بعد جان خود بخود عادیۃ اللہ کے موافق نکل گئی انسان کا اس میں کچھ دخل نہ تھا پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے تفریق اجزاء و عدم تفریق اجزاء کو احیاء و اماتت کو سمجھا جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی کور صغریٰ دیکھی تو آپ نے دوسری دلیل کی طرف اس کو عجز عن الفہم کے عاجز ہونے کے سبب نہ کہ اپنے عجز عن الجواب کے سبب انتقال کیا کیونکہ آپ نے یہ دیکھا کہ اگر میں اس کا جواب دوں اور احیاء و اماتت کی حقیقت بیان کروں اور یہ بتلاؤں کہ تیرا فعل احیاء و اماتت میں داخل نہیں تو یہ کور مغز اس فرق کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس لئے آپ نے دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ واضح بیان فرمائی وہ یہ کہ میرا خدا وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا کا منکر ہے تو مغرب سے آفتاب کو نکال۔ اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر ان کا منہ نکلنے لگا



اور اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔ یہاں سے اہل مناظرہ کے ایک اشکال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا۔ اشکال یہ ہے کہ فن مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال کرنا مناظرہ کو جائز نہیں اور یہ ایک مسئلہ عقلیہ ضروری ہے کیونکہ اگر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز کر دیا جائے تو اس طرح سلسلہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا۔ تم نے ایک دلیل بیان کی خصم نے اس کو توڑ دیا تم نے اس انتقال کر کے دوسری دلیل بیان کر دی اس نے اس کو بھی توڑ دیا تم نے تیسری دلیل بیان کر دی تو یہ تو غیر متناہی سلسلہ ہو جائے گا۔ پھر حق کبھی ظاہر ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے علماء مناظرہ نے انتقال الی دلیل آخر کو ناجائز مانا ہے اور کوئی شخص اس اشکال کا یہ جواب نہ سمجھے کہ یہ تو علم مناظرہ کا ایک مسئلہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تہی ہیں ان کے ذمہ ہمارے اصول کا ماتنا کرنا لازم ہے بلکہ ہم کو ہی ان کی بات کا ماتنا لازم ہے جواب ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ محض ہمارے اصول مسلمہ کی قسم سے نہیں بلکہ عقلی مسئلہ ہے جس کا تسلیم کرنا فی نفسہ ضروری ہے۔ پس اب اس اشکال کا صحیح جواب سنئے۔ بات یہ ہے کہ مناظرہ میں انتقال الی دلیل آخر اپنی مصلحت سے تو ناجائز ہے لیکن خصم کی مصلحت سے جائز ہے مثلاً ہم نے ایک دلیل غامض بیان کی جس کو خصم نہیں سکتا تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دلیل غامض کو سہل عنوان سے بیان کیا جائے سو اگر اس میں تطویل زیادہ نہ ہو نیز مخاطب تسہیل کے بعد سمجھنے پر قادر ہو جائے تو اس کی تسہیل کر دینی چاہئے اور اگر تسہیل میں تطویل ہو یا مخاطب ایسا بلید ہو کہ تسہیل کے بعد بھی دلیل غامض کو نہ سمجھ سکے تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ اس دلیل غامض سے انتقال کر کے دوسری واضح دلیل بیان کر دی جائے جس کو خصم بخوبی سمجھ سکے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت میں مخاطب کی مصلحت سے انتقال کیا تھا۔ کیونکہ آپ نے دیکھا کہ مخاطب بڑا ہی کوڑ مغز ہے اس لئے اس سے کیا امید تھی کہ وہ امانت و احیاء کی حقیقت کو سمجھے گا اور جھک جھک کر بے گناہ ہو گا۔ اگر فرد کو کچھ بھی علم و فہم ہوتا تو

اس کی بات کا جواب بہت سہل تھا۔ ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ ازہاق روح تیری قدرت میں نہیں تیرا کام صرف گردن جدا کر دینا تھا۔ اس کے بعد روح کا نکل جانا عادتہ اللہ کے موافق ہوا تیرا اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ قاعدہ عقلیہ ہے الْقُدْرَةُ تَتَعَلَّقُ بِالْضِدَائِنِ کہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے جو شخص جان نکالنے پر قادر ہوگا وہ اس کے روکنے پر بھی ضرور قادر ہوگا پس تفریق گردن کے بعد اگر زہوق روح تیرے اختیار سے تھا تو اس پر بھی تجھ کو قدرت ہونی چاہیے کہ ایک شخص کی گردن جدا کر کے اس کی جان کو نہ نکلنے دے اگر تو اس پر قادر ہے کہ گردن کاٹنے کے بعد جان کو روک لے اور نہ نکلنے دے تو ایسا بھی کر دکھا اس کا جواب اس کے پاس ہرگز کچھ نہ تھا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل کمزور نہ تھی اور نہ اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے دوسری دلیل کی طرف انتقال کیا تھا بلکہ محض اس وجہ سے انتقال کیا کہ پہلی دلیل کے سمجھنے کی اُس کوڑمغز سے امید نہ تھی غرض انسان کا کام محض تحلیل و ترکیب ہے ایجاد و اعدام اس کا کام نہیں اور جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں چیز کا موجد ہے نہ اطلاق محض مجازی ہے کیونکہ حقیقی ایجاد میں عالم میں ہوئیں ان کے اجزاء بسیط پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ ان اجزاء بسیط کو خدا تعالیٰ کے سوا پیدا نہیں کیا موجد کا کام صرف اس قدر ہے کہ ان سے ان اجزاء میں ترکیب دیدی ہے پس ظاہر میں اس کو صرف ہیئت ترکیبہ اجتماعیہ کا موجد کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ہیئت اجتماعیہ کا موجد بھی مجازاً ہی ہے کیونکہ یہ قاعدہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قدرت ضدین سے متعلق ہوا کرتی ہے۔ پس اگر ہیئت اجتماعیہ کا وجود اس شخص کے اختیار سے ہوا ہے تو لازم ہے کہ اس کو اس پر بھی قدرت ہو کہ اجزاء بسیط کو ملا دینے کے بعد ان پر ہیئت اجتماعیہ کو طاری نہ ہونے دیں حالانکہ کسی شخص کو اس پر قدرت نہیں بلکہ جب اجزاء کو باہم ترکیب دیا جائے گا ہیئت اجتماعیہ لزوماً طاری ہو جائے گی خواہ تم چاہو یا نہ چاہو یہ اس کی صاف دلیل ہے

کہ انسان کا کام بجز ترکیب کے اور کچھ نہیں نہ وہ بسیط کا موجد ہے نہ مرکب کا نہ ہیئتہ اجتماعیہ کا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے لوہے اور مقناطیس کو باہم نزدیک کر دیا جائے کہ نزدیک کر دینا تو تمہارا فعل ہے اس کے بعد مقناطیس خود بخود اس کو جذب کر لے گا خواہ تم کتنا ہم چاہو کہ جذب نہ کرے اب تمہارا کوئی اختیار نہیں اسی طرح ترکیب کے بعد ہیئتہ اجتماعیہ خود بخود فائض ہو جاتی ہے اب تم کو کوئی نہیں پوچھتا کہ تم ہو کون۔ ہاں حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ ترکیب کے بعد بھی ہیئتہ اجتماعیہ کو فائض نہ کرے۔ چنانچہ ایک پتھر ایسا ہے کہ جب اس کو سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ بھاگتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ مٹی کو سیال چیز میں ڈال دینے کا مقتضا تو یہ ہے کہ وہ ساکن ہو جائے اور دونوں مجتمع رہیں مگر یہاں خلاف مقتضا اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور بدون کسی مخلوق کے صنع کے وہ جدا ہو جاتے ہیں اسی طرح اس ہیئت اجتماعیہ کے آثار کی حالت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچا لیا حالانکہ اس اجتماع کا اثر اور مقتضایہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام جل کر خاکستر ہو جاتے مگر حق تعالیٰ نے اس اثر کو روک دیا اور اس کے خلاف دوسرا اثر پیدا کر دیا۔ اسی طرح یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں عرصہ تک زندہ رکھا اور ان کو ہضم نہ ہونے دیا حالانکہ اس ترکیب و اجتماع کا اثر و مقتضایہ تھا کہ وہ مچھلی کے معدہ میں جا کر ہضم ہو جاتے اور زندگی ختم ہو جاتی پس حقیقت میں ایجاد و اعدام حق تعالیٰ ہی کا کام ہے انسان کا کام صرف تحلیل و ترکیب ہے پس حق تعالیٰ نے انسان کی تمام ضروریات کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا کر دیا تھا کہ جب وہ دنیا میں آیا ساری ضرورت کی چیزیں اس کو تیار ملیں صرف تحلیل و ترکیب کرنا اس کا کام رہ گیا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۵

یا نبودیم و لقا صا ما نبود

لطف تو ناگفتہ نامی شنود

ممکن ہے کہ اس پر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ جب خدا تعالیٰ کو انسان کی ایسی خاطر منظور تھی اور وہ معزز زہمان تھا تو پھر اس کو یہ تکلیف بھی کیوں دی گئی کہ وہ ترکیب و تحلیل کرتا پھرے۔ بس تمام چیزیں کامل و مکمل اس کے واسطے موجود ہوتیں تو بہتر تھا۔ درختوں پر بجائے گیہوں کے روٹی لگا کر تکی کیا اس کے بجائے بنائے کیڑے پیدا ہوا کرتے و علیٰ ہذا القیاس میں کہتا ہوں کہ اس میں حق تعالیٰ نے طبیعت انسانی کی بہت زیادہ رعایت کی ہے کیونکہ اس وقت تو گیہوں الگ پیدا ہوتا ہے اور چننا الگ تم کو اختیار ہے کہ خالص گیہوں کی روٹی پکالو یا خالص چنے کی یادوں کو ملا کر۔ نیز یہ بھی اختیار ہے کہ روٹی پکاؤ یا گیہوں بال کر کھاؤ یا اس کا ستو بناؤ یا حلوا سوہن تیار کرو و غرض سدھ قسم کی چیزیں بنا سکتے ہو اور اگر بجائے گیہوں چنے کے دونوں کی روٹیاں پکی پکائی لگا کر تکیں تو بس ایک ہی غذا تم کو نصیب ہوتی یہ رنگ برنگ کی غذا میں تم تیار نہ کر سکتے اسی طرح روٹی کے پیدا ہونے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی کے موافق اس کا جیسا چاہے لباس تیار کر سکتا ہے خواہ خالص سوت کا کیڑا بنائے یا سوت اور ریشم کو ملا کر یا اون اور سوت کو ملا کر نیز یہ بھی اختیار ہے کہ کرتہ بنائے یا پاجامہ یا قمیص یا اچکن اور اگر سے سلانے کیڑے درختوں پر لگا کرتے تو بس وہ اسی کام آتے جس کام کے لئے وہ موضوع ہوتے دوسرے لباس مختلف قسم کے تیار نہ ہو سکتے اور اگر ایسا ہو سکتا تو انسان ایک قسم کی غذا اور ایک ہی قسم کے لباس سے اکتا جاتا چنانچہ اس کا تجربہ ایک زمانہ میں ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ نے بتی اسرائیل کو من و سلویٰ عطا فرمایا تھا کہ بے محنت و مشقت دونوں وقت ان کو بیٹھے بٹھلے غذا مل جاتی تھی اور غذا بھی بہت نفیس تھی مگر ان سے ایک غذا پر نہ رہا گیا آخر کو اکتا کر کہنے لگے **يَا مُوسَىٰ لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامِهِ وَاجِدْ قَادِحًا لَسَا رَبِّكَ يُخْرِجُ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُؤْمِهَا وَعَدِسِهَا وَبَصَلِهَا ۗ** اے موسیٰ ہم سے ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہو سکے گا۔ پس اپنے پروردگار سے

دعا کیجئے کہ ہمارے لئے دو چیزیں پیدا کرے جو زمین سے اگا کرئی تھیں یعنی  
 ترکاریاں۔ اور لکڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز قال اَتَسْتَعِيدُ لَوُتِ  
 السِّدِّي هُوَ اَذْنِي بِالذِّي هُوَ خَيْرٌ لِّ هِبَطُو اِمْصِرَاقَاتٍ لَكُمْ مَاسَا لَتُّهُ  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم عمدہ چیز کے بدلے ادنیٰ کو لینا چاہتے ہو جاؤ کسی  
 شہر میں اترو وہاں جو کچھ تم مانگتے ہو مل جائے گا تو صابو! اگر حق تعالیٰ پکی پکانی  
 روٹی آسمان سے اتارا کرتے تو آپ بھی چند روز میں بنی اسرائیل کی طرح اس سے  
 گھبرا جاتے اس لئے انسان کی راحت اسی میں ہے کہ ترکیب و تحلیل کا کام اس پر  
 چھوڑ دیا گیا کہ جس طرح چاہے اپنی طبیعت کے موافق جوڑ توڑ کرتا رہے جیسا کہ  
 قاعدہ ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا پان مزے نہیں لگتا  
 تو ان کی راحت اور ان کا اعزاز یہی ہے کہ میزبان ان کے آگے پان دان لا کر  
 رکھ دے کہ لو بھائی تم اپنے ہاتھ سے جیسا چاہو بنا لو۔ پس جس طرح پان دان  
 سامنے رکھ دینے کو ہر شخص غایت اعزاز سمجھتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس شخص  
 نے میزبان کی تحقیر کی کہ اس کو پان لگانے کی تکلیف دی اسی طرح تحلیل و ترکیب  
 کو انسان پر چھوڑ دینے سے تکلیف اور بقدری کا شبہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ حقیقت  
 میں یہ بھی غایت اعزاز ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو ایک سی غذا ایک لباس پر  
 مجبور نہیں کیا بلکہ مختلف اقسام و انواع کے استعمال کی اس کو گنجائش دی خاص  
 خاص شرائط و حدود کے ساتھ جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے کیونکہ انسان ایک  
 حالت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اور یہی حکمت ہے عبادات کے تنوع و تعدد  
 میں بھی یعنی حق تعالیٰ نے ہمارے لئے ایک ہی قسم کی عبادت مشروع نہیں فرمائی  
 بلکہ رنگ برنگ کی عبادات ہیں۔ ایک وقت نماز ہے دوسرے وقت تلاوت قرآن  
 ہے ایک وقت تدریس و تعلیم ہے۔ کبھی و غط و نصیحت ہے۔ کبھی استغفار و درود <sup>شکفا</sup>  
 ہے اور پھر ہر حالت کے مناسب الگ الگ دعا بتلائی گئی ہے۔ و علیٰ ہذا القیاس  
 تاکہ ایک عبادت سے انسان اکتانہ جائے اور جدید عبادت سے اس کا شوق

برہمٹا رہے دیکھتے پہلے رمضان سردی میں تھا تو لوگ اس سے اکتاتے تھے کہ  
 میاں یہ بھی کوئی روزہ ہے اُدھارے اُدھارے بیٹھے ہیں نہ بھوک ہے نہ پیاس ہے  
 ذرا سادہ ہے خبر ہی نہیں ہوتی کہ روزہ بھی تھا یا نہیں روزہ تو گرمی کا لطف کا  
 ہے کہ ذرا خبر بھی ہو کہ ہاں روزہ ہے پھر افطار میں شربت کا اور ٹھنڈے پانی  
 کا اور بعض جگہ برف کا اہتمام ہوتا ہے۔ ٹھنڈے کنوؤں کی تلاش ہوتی ہے  
 کہ جس کنویں کا پانی سب سے زیادہ ٹھنڈا ہو اس کا پانی لایا جاتا ہے سردی میں  
 تو یہ باتیں ہوتی تھیں۔ اب جب رمضان گرمی میں آیا تو اس سے بھی گبرائے۔  
 چنانچہ اب رمضان آنے والا ہے معلوم ہو جائے گا کہ کتنے آدمی روزہ رکھتے  
 ہیں۔ اب یوں کہتے ہیں کہ صاحب رات تو ذرا سی ہوتی ہے۔ تراویح پڑھنے کے  
 بعد سونے کا موقع ہی نہیں ملتا ادھر آنکھ لگی ادھر سحری کا وقت آیا اتنی دیر میں  
 افطار کے وقت کا کھانا پانی بھی مہضم نہیں ہوتا اب سحری میں کیا کھالیں بس سحری کا  
 لطف تو گرمیوں کی رات میں کچھ بھی نہیں۔ پھر دن ایسا پہاڑ کہ گھنٹے گھنٹے گنتے تھک  
 جاؤ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا پیاس کے مارے کلیجہ نکلا جاتا ہے پھر افطار کے  
 وقت پانی اس یری طرح پیا جاتا ہے کہ تراویح پڑھنا محال ہو جاتا ہے۔  
 بس گرمیوں میں نہ تراویح کا لطف ہے نہ روزہ کا۔ لیجئے اب گرمیوں کے رمضان  
 کی برائی ہونے لگی۔ غرض انسان کو کسی ایک حالت پر قرار دین نہیں بس  
 اس کو تو جنت ہی میں جا کر آرام ملے گا۔ مگر وہاں بھی اس کا چلبلا پن نہ جائے گا۔  
 ایک خدا کے بندے کو بیٹھے بٹھلائے کھیتی کا شوق ابھرے گا بھلا اس سے  
 کوئی پوچھے کہ جب تجھے بیٹھے بٹھلائے بے مانگے ہر چیز مل رہی ہے پھر تجھے  
 کھیتی کی ضرورت کیا ہے کچھ نہیں صرف وہی چلبلا پن کہ اس سے ایک حالت  
 میں رہا نہیں جاتا جنت میں جو بے محنت و مشقت کھائے کو ملے گا تو آپ کو  
 اپنی وہی حالت یاد آئے گی کہ ایک وقت میں ہم کھیتی کر کے کھایا کرتے تھے۔ یوں  
 ناچ بولتے، مل چلاتے کھیتی کا ٹٹتے تھے اب وہ بات ہی نہیں اس لئے اس کو کھیتی کا

شوق ہوگا چنانچہ یہ شوق بھی اس کا پورا کیا جائے گا ادھر دانہ پرٹا ادھر پیدا ہوا اور پکا اور تھوڑی دیر میں غلہ کا ڈھیر سامنے آجائے گا پھر ارشاد ہوگا دُونَكَ يَا اِبْنَ اَدَمَ قَلَنْ يُشْبِعَكَ شَيْءٌ کہ اے ابن آدم لے (یہ کھیتی بھی تیار ہوگئی) مگر تجھے کوئی چیز سیر نہیں کر سکتی۔ قیاس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کوئی گاؤں کا رہنے والا کسان ہوگا جسے جنت میں بھی کھیتی ہی یاد آئے گی یا ممکن ہے کوئی ایسا شخص ہو جسے دنیا میں بھی سلطنت و راحت ہی ملی ہو اور جنت میں تو جو کچھ ہے سلطنت ہی سلطنت ہے تو اس شخص کو دنیا میں کھیتی کا موقع نہ مل سکا اس نے یہ چاہا کہ لاؤ جنت میں اس آرزو کو پورا کر لوں۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ بعض دفعہ سلاطین غایت تکلیف اور ساز و سامان و فرش و تخت سے گھبرا جاتے ہیں غربا کے گھر جا کر بورے اور ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بیٹھنے اور موٹی بھوٹی روٹی ان سے مانگ کر کھاتے تھے یہ کہتے تھے کہ عیش و آرام اور تکلف سے طبیعت گھبرا گئی اس لئے سادگی کا مزہ چکھنے کے لئے کبھی کبھی جی چاہا کرتا ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ انسان کی طبیعت ایسی چلبلی ہے کہ جس آسائش و آرام کا یہ ساری عمر طالب رہتا ہے جب وہ میسر ہو جاتا ہے تو اس سے بھی اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے انسان کی مرضی و نامرضی پر کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کام اپنے قبضے میں رکھا ہے۔ کیونکہ انسان کی حالت بچوں کی سی ہے۔ اب بچے اگر ایسی ویسی فرمائش کرنے لگیں تو کیا باپ ان کی ہر فرمائش کو پورا کر دیا کرتا ہے ہرگز نہیں بلکہ باپ اپنی مرضی کے موافق کام کرتا ہے۔ بچوں کی مرضی پر اگر ہر کام چھوڑ دیا جائے تو اس میں ان کی ہلاکت ہے اور بعض دفعہ اسی خلاف حکمت ہونے کے سبب بچوں کی ضدیں اور فرمائشیں پورا کرنا بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ایسی ضدیں کرتے ہیں کہ والدین کو تنگ کر دیتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک بچہ نے رونا شروع کیا پوچھا کیوں روتا ہے

کہنے لگا مسٹھائی لوں گا تیر مسٹھائی دیدی پھر رونا شروع کیا بھائی اب کیوں روتا ہے۔ بولا دودھ لوں گا دودھ بھی آگیا۔ اسی طرح بہت سی سوچ سوچ کر فرمائش کیں اور پوری کر دی گئیں اس کو اس وقت مقصود والدین کو عاجز کرنا تھا۔ پھر اس نے رونا شروع کیا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہنے لگا کہ ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپا دو۔ اب اس ضد کو کوئی کیونکر پورا کر سکتا ہے آخر ماں باپ عاجز ہو گئے۔

اسی واسطے بیربل اور اکبر میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تھی اکبر کہنے لگا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے۔ ایک راج ہٹ، ایک تریا ہٹ، ایک بالک ہٹ۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا راج ہٹ اور تریا ہٹ کا دشوار ہونا تو مسلم ہو سکتا ہے کیونکہ بادشاہ اور عورت عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی فرمائش کر بیٹھیں جس کا پورا کرنا دشوار ہو لیکن بالک ہٹ کا دشوار ہونا مسلم نہیں کیونکہ بچوں کی ایسی کیا فرمائش ہوگی جو پوری نہ ہو سکے۔ بیربل نے کہا کہ سب سے زیادہ مشکل تو بالک ہٹ ہی ہے اس کو بڑا ہی عاقل پورا کر سکتا ہے ہر شخص پورا نہیں کرتا۔ اکبر نے کہا کہ اس کے لئے عقل کی کیا ضرورت ہے بچوں کی فرمائش کو ہر شخص پوری کر سکتا ہے۔ بیربل نے کہا اچھا ہم بچے بنتے ہیں آپ میری ضد کو پورا کریں۔ اس نے کہا اچھا۔ اب بیربل بچہ بنا اور بچوں کی طرح سیکنے لگا (اکبر کا دربار ایسا ہی ہوتا تھا وہاں یہی خرافات اکثر رہا کرتی تھیں) غرض اکبر نے پوچھا کیوں روتے ہو۔ بیربل نے کہا ہم تو ہاتھی لینگے۔ اکبر نے فوراً ہاتھی خانہ سے ایک ہاتھی منگوادیا اور کہا سبحان اللہ اپنے بڑی مشکل فرمائش کی بیربل پھر روتے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہا ہم تو کھلیا لیں گے۔ اکبر نے فوراً بازار سے ایک کھلیا بھی منگادی اور کہا بس یہی بڑی مشکل ضد تھی بیربل پھر روتے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو اس کھلیا میں کھڈا اب تو اکبر کی عقل حیران ہو گئی کہ واقعی اس ضد کا پورا کرنا مشکل ہے آخر عاجز ہو گیا اور مان گیا کہ بچوں کی فرمائش کا پورا کرنا مشکل ہے۔ پھر اس نے بیربل سے کہا کہ یہ جو



تم نے کہا تھا کہ عاقل بچوں کی ضد بھی پوری کر سکتا ہے۔ اب میری سمجھ میں جو بات نہیں آتی اس فرمائش کو عاقل کیونکر پورا کر دیگا۔ بیربل نے کہا کہ اگر عقل ہو تو سب آسان ہے۔ اکبر نے کہا اچھا اب ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد کو پورا کرو۔ اس نے کہا بہتر ہے چنانچہ اب اکبر نے سکنا شروع کیا۔ بیربل نے کہا کیوں روتے ہو آپ نے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے (میاں کو بس یہی سبق یاد تھا گھر کی عقل تو تھی ہی نہیں) بیربل نے ایک آدمی کو بھیجا کہ بازار سے جا کر مٹھائی یا مٹی کا ایک ہاتھی ڈرا سا لے آؤ چنانچہ لایا گیا اور اکبر کو دیدیا گیا اب آپ نے پھر رونا شروع کیا پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا ہم تو کھلیا لیں گے اس نے کھلیا بھی منگا دی۔ پھر آپ رونے لگے پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو کھلیا میں رکھڈ اس نے اٹھا کر رکھ دیا بس اکبر خاموش ہو گئے۔ بیربل نے کہا کہ یہ آپ کی عقل تھی کہ بچہ کے ہاتھی مانگنے پر آپ لے اتنا بڑا ہاتھی منگا دیا۔ آپ کو چاہئے تھا کہ بچہ کی فرمائش کو اس کی حیثیت کا لحاظ کر کے پورا کرتے۔ الغرض بچہ بڑی الٹی الٹی ضدیں کیا کرتے ہیں بعض دفعہ بچہ یہاں تک چاہتا ہے کہ آگ پکڑ لوں۔ ساتھ کو ہاتھ میں لے لوں مگر ماں باپ اس کی اس خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح یہ بھی خدا کی رحمت عظیمہ ہے کہ حق تعالیٰ کو ہر فرمائش کے پورا کرنے پر تادد ہے۔ پھر بھی انسان کی خواہش کا اس لئے اتباع نہیں کرتا کہ اس کو حکمت ہی کی خبر نہیں۔ بلکہ انسان کی خواہش کو حق کے تابع رکھا گیا ہے ورنہ بڑا فساد عظیم برپا ہوتا۔ چنانچہ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَوْ تَّبِعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَ

الْأَرْضُ مِنْهُ۔ الْآیۃ۔ (اگر حق تعالیٰ ان کی خواہشات کا اتباع کرتے

تو زمین و آسمان سب فساد ہو جاتے) پس انسان کی مصلحت اسی میں

ہے کہ اس کو اسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا ورنہ یہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا۔

ایک شخص نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ حق تعالیٰ سے دعا کر دیجئے کہ مجھ کو اپنے متعلق آنے والی بات کی خبر ہو جا یا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرما دیجئے کہ تیری مصلحت اسی میں ہے کہ تجھ کو آنے والی بات کی اطلاع نہ ہو اگرے تیری مصلحتوں کو تجھ سے زیادہ ہم جانتے ہیں آپ نے اس شخص کو اطلاع کر دی اس نے پھر اصرار کیا کہ میرا جی بہت چاہتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی جو قبول ہو گئی۔ چنانچہ اس کو آئندہ واقعات کی اطلاع پہلے ہی ہو جا یا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کو معلوم ہوا کہ میرا گھوڑا مرنے والا ہے اس نے جلدی سے بازار میں جا کر اسے فروخت کر دیا اور نفع سے فرحت کیا اور اپنے جی میں بہت خوش ہوا کہ دیکھو اس علم سے میرا کتنا بڑا نفع ہوا کہ جانور میرے گھر میں نہیں مراد دوسرے کے یہاں جا کر مرے گا اور مجھے اس کی قیمت مع شئی زائد وصول ہو گئی۔ پھر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اب میرا غلام مرنے والا ہے اس نے غلام کو بھیجا کہ فروخت کر دیا اور اپنے دل میں بہت ہی خوش ہوا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ اب میں خود مرنے والا ہوں اب تو بڑا پریشان ہوا کہ اپنے کو کہاں جا کر چھپا دوں آخر موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوڑا ہوا آیا کہ شاید وہ اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت بتلا دیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرما دیجئے کہ اس نے اپنی موت اپنے ہاتھوں خریدی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی تقدیر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس عرصہ میں اس کے گھر پر ایک مصیبت نازل ہوگی ہم نے اول اس کے جانور پر ڈالنا چاہا۔ اس نے ہوشیاری کر کے اس کو اپنے سے الگ کر دیا۔ پھر ہم نے اس کے غلام پر اس کو ڈالنا چاہا اس نے اس کو بھی بیچ کر نفع حاصل کر لیا اب خود یہی رہ گیا ہے لہذا اب وہ مصیبت اس کے اوپر ضرور آوے گی ٹل نہیں سکتی۔ اس سے کہہ دیجئے کہ بس اب حسن خاتمہ کی دعا کرے موت ضرور آوے گی۔

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرتے وقت، خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

تو آپ نے دیکھا کہ انسان کی مرضی پر کام چھوڑنے کا کیا نتیجہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لے لی۔ بس حق تعالیٰ کی یہی بڑی رحمت ہے کہ رب کام اپنے قبضہ میں رکھا اور ہم کو کچھ بھی خیر نہیں دی کہ کل کر کیا ہونے والا ہے۔ لوگ علم غیب کی تمنا کیا کرتے کشف کو کمال سمجھتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ وبال جان ہو جاتی ہے۔ شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں تو علم غیب کو استکثار خیر و دفع مضرت کا سبب بتلایا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ کشف بعض دفعہ وبال جان ہو جاتا ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے۔

وَلَوْ كُنْتُمْ أَغْلَمُ الْغَيْبِ لَاسْتَكْتَرْتُمْ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسْتَفَى السُّوءُ

(ترجمہ) اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو خیر بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی مضرت نہ پہنچتی۔ اس کے چند جوابات ہیں اول تو یہ کہ آیت میں قصہ کلیہ نہیں ہے بلکہ جزئیہ ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ خیر ہی خیر حاصل ہوتی اور شر مس بھی نہ کرتا دوسرے یہ کہ آیت میں غیب سے مراد جمیع الغیب ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر مجھ کو غیب کا علم محیط حاصل ہوتا الخ اور ظاہر ہے کہ غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر و دفع مضرت کا ضرور سبب ہو سکتا ہے اور اس قصہ میں جو اس شخص کو مصیبت پیش آئی اس کا سبب یہ تھا کہ اس کو علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ اخیر تک کی سب حالت معلوم ہو جاتی تو وہ جان لیتا کہ اگر میں گھوڑے اور غلام کو فروخت کر دوں گا تو پھر یہ بلا میرے اوپر آوے گی)

پس کشف کے بعض دفعہ وبال جان ہونے پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ کشف میں علم محیط نہیں ہوتا اور علم ہوتا ہے اور علم محیط بشر کے لئے حاصل ہونا محال بھی ہے اور اس جگہ اس سے بچت ہی نہیں بلکہ جس قدر غیب کا علم انسان کو ہو سکتا ہے اس کے متعلق میں نے یہ کہا تھا کہ بعض دفعہ وہ وبال جان ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں۔ خوب سمجھ لو یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر انسان کے لئے پکی پکائی روٹی اور سلعے سلائے کپڑے

پیدا ہوا کرتے تو وہ گھبرا جاتا کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں اچکن پیدا ہونا اور آپ کا جی قمیص کو چاہتا ہو۔ دوسرے وقت میں پا جامہ پیدا ہوا اور آپ کی طبیعت لنگی کو چاہتی ہے۔ اور انسان اس سے بھی گھبرا جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے سر پر سوار ہو جائے۔ اب خدا کا شکر ہے کہ اس کے سر پر سوار کوئی چیز نہیں وہ جیسا چاہے خود بنا سکتا ہے اور اگر کسی چیز کی ضرورت نہ ہو تو یہ بھی اختیار ہے کہ کچھ نہ بنائے یہ حکمت ہے اس میں کہ حق تعالیٰ نے تحلیل و ترکیب کا کام انسان پر چھوڑ دیا ہے سر پر سوار ہونے سے مجھے اپنا ایک قصہ یاد آیا ایک صاحب نے جو کہ میرے دوست کے بیٹے ہیں میری دعوت کی تھی وہ بندہ خدا کھانا کھاتے ہوئے میرے سر پر سوار ہو گئے بار بار مجھے ٹوکیں کہ مولانا آپ تو بہت کم کھاتے ہیں اچھی طرح کھائیے تکلف نہ فرمائیے اب وہ تو مجھے زیادہ کھانے کو فرما رہے تھے مگر میری یہ حالت کہ جب مجھے اس کا تصور آتا کہ میزبان میرے لقموں کو دیکھ رہا ہے مجھ سے غیرت کی وجہ سے لقمہ نہ ٹوٹتا آخر کار میں بھوکا ہی رہا اور اپنے گھر آ کر میں نے دوبارہ کھانا کھایا۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے میری دعوت کی وہ ہر چیز مجھے اپنے آپ کہلاتے تھے مگر میری طبیعت اندر سے گھسٹی جاتی تھی۔

یہ آداب معاشرت کے بالکل خلاف ہے۔ میزبان کو چاہیے کہ مہمانوں کو کھاتے ہوئے ہرگز نہ گھورے۔ بس سرسری نگاہ سے اتنا معلوم کرتا رہے کہ کہاں کس چیز کی ضرورت ہے۔ باقی نہ اس سے کہے کہ آپ کم کھا رہے ہیں نہ یہ کہے کہ آپ تکلف کر رہے ہیں کیونکہ جب مہمان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میزبان میرے لقمے دیکھ رہا ہے تو اس سے بالکل نہیں کھایا جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دسترخوان پر ایک بدوی بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا اور دیہاتیوں کی طرح بڑے بڑے لقمے بنا رہا تھا۔ حضرت معاویہ نے خیر خواہی کے طور پر اتنا فریاد کیا کہ اے شخص اپنی جان پر رحم کر اور لقمہ چھوٹالے تاکہ گلے میں نہ اٹک جائے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ بدوی فوراً دسترخوان سے

اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت معاویہؓ سے خطاب کر کے کہا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارا کھانا کھاوے۔ تم مہمانوں کے لقموں کو تکتے ہو کہ کون چھوٹا لیتا ہے کون بڑا۔ تم کو اس سے کیا غرض تم کو دسترخوان پر مہمانوں کو بٹھلا کر پھر اپنے کھانے کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا چاہیے۔ یہ کہہ کر چلتا ہوا۔ ہر چند حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا کہ کھانا اچھی طرح کھا کر جانا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میں بیان یہ کر رہا تھا کہ انسان کی مثال معزز مہمان جیسی ہے کہ جس طرح اس کی آمد سے پہلے تمام ضروریات کا انتظام کر دیا جاتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے تمام عالم کو اسی کی خاطر اور اسی کے واسطے پیدا کیا پھر جب انسان ہلاک ہو جائے گا تو سارا عالم بھی ہلاک ہو جائے گا۔ کیونکہ جس کے لئے یہ ساز و سامان تھا جب وہی نہ رہا تو اس کے رہنے میں کیا فائدہ۔ حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو تو پہلے پیدا کیا ہی جنت کو بھی پہلے ہی پیدا کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت اس عالم کے بعد انسان کو ہوگی کیا ٹھوکاتا ہے اس رحمت کا اور اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میرا اصلی گھر جہاں ہر قسم کی راحت و آسائش ہے اس وقت موجود ہے تو اس کو اُدھر زیادہ رغبت ہوگی اور دنیا میں اس کا دل نہ لگے گا اور اگر اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ جنت تو ابھی سنی بھی نہیں دنیا کے فنا ہونے کے بعد بنے گی تو اکثر طبائع کو عالم آخرت کی طرف رغبت نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو کم ہوتی کیونکہ معدوم کی طرف رغبت ہونا انسان کے طبائع میں نادر ہے گو وہ معدوم کیسا ہی یقینی وجود ہو۔ اور اب جس وقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد پر نظر پڑتی ہے اَعْدَاتُ اللّٰهِ يَنْتَظِرُونَ کہ جنت خدا سے ڈر لے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقویٰ کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی بعد میں پیدا ہوگی اور وہ اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ابھی سے اس کا پیدا ہونا عجب ہے اور خدا تعالیٰ فعل عجب سے پاک ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی اَعْدَاتُ اللّٰهِ يَنْتَظِرُونَ تیار کی گئی ہے خدا سے

ڈرنے والوں کے لئے) رد کر رہی ہے کیونکہ صیغہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں لینا مجاز ہے حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہو اور بلا وجہ معنی مجازی لینا جائز نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کیونکہ میں نے ابھی اس کی حکمت بتلا دی ہے جس کو دوبارہ اعادہ کرتا ہوں۔ وہ حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالیٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنارہے ہیں کہ اَعِدَّ رَبِّ اِلٰدُ الْمُتَّقِيْنَ دَجَنَّتْ مُتَّقِيُوْا کے واسطے تیار کی گئی ہے) اور اگر پیدائش ہوتی تو بجائے اس کے یہ فرماتے تُوْعَدُوْا لِلدُّنْيَا (یعنی جنت منقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعۃ میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شے موجود کی طرف رغبت ہے اور اس وقت شی معدوم کی طرف رغبت ہوتی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آگئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ الغرض سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (کام میں لگا دیا ہے تمہارے نفع کے لئے تمام چیزوں جو آسمان و زمین میں ہے) میں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام عالم کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے۔ اور وہ معنی مراد نہیں جو تسخیر کے لفظ سے محاورہ اردو میں متبادر ہوتے ہیں اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ نے توحید کی دلیل بیان فرمائی ہے۔ اصل مقصود آیت کا توحید ہی ہے گو تبعاً دوسرے مضامین کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے۔

حاصل استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں تو معبود بھی وہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ معبود کے لئے کامل الصفات و جامع الكمالات ہونا ضروری ہے اور خلق بہت بڑی صفت کمال ہے پس جو خالق نہیں وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا اور جو خالق ہو گا وہ یقیناً تمام صفات کمال کا جامع ہو گا کیونکہ خلق کے معنی اعطاء وجود کے ہیں اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں۔ پس جو ذات معطی وجود ہے یقیناً اس کے قبضہ میں

خزائن وجود ہیں اور جس کے قبضہ میں وجود کے خزائن ہوں وہ تمام صفات کمال کا جامع ہوگا۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے اکثر مواقع میں توحید کی دلیل میں صفت خالقیت کو بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ صفت خالقیت تمام کمالات کو مستلزم ہے۔ حق تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں زیادہ دقیق دلائل نہیں بیان فرمائے بلکہ نہایت سہل دلائل بیان فرمائے ہیں جن کو تھوڑی سی عقل والا بھی بہت جلدی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ صرف خالقیت سے توحید کو ثابت فرمایا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تدقیقات سے مخاطب ساکت تو ہو جاتا ہے مگر اس کی تسلی نہیں ہوتی اور سہل عنوانات سے تسلی خوب ہو جاتی ہے جیسا کہ اس آیت میں کتنا سہل عنوان ہے کہ کیا تم نے اس بات کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہے۔ اس عنوان سے ہر شخص کا ذہن توحید کی طرف جلد منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر منطقی استدلالی طرز ہوتا تو اس سے اس درجہ تسلی نہ ہو سکتی۔ اس جگہ شاید کوئی یہ سوال کرے کہ حق تعالیٰ کا خالق ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے وجود صانع تو معلوم ہو جائے اور اس دلیل سے وجود صانع ثابت نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب دہری نہ تھے وہ محض مشرک تھے وجود صانع کا وہ انکار نہ کرتے تھے اس لئے وجود صانع کو ثابت کرنے کا قرآن نے اہتمام نہیں کیا۔ ہاں علمائے اسلام نے جب دہریوں کا بھی ایک فرقہ اسلام کے مقابل دیکھا تو انہوں نے وجود صانع پر بھی دلائل قائم کئے۔ اہل عرب کا دہری نہ ہونا قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَيْسَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ مَنْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ -

(اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین۔ تو وہ

یہ ضرور کہیں گے اللہ نے)

اور اس قسم کا مضمون قرآن میں جا بجا مذکور ہے۔ پس جب اہل عرب صانع کے قائل تھے

اور شرک میں مبتلا تھے تو ان کے واسطے دلائل توحید ہی کی ضرورت تھی چنانچہ سارا قرآن دلائل توحید سے بھرا ہوا ہے لیکن وہ دلائل منطقی طرز پر صغریٰ و کبریٰ و حد اوسط وغیرہ سے مرکب نہیں ہیں۔ یہ میں نے اس واسطے کہدیا تاکہ کوئی معقولی یہ نہ کہے کہ ہم نے تو سارا قرآن دیکھ لیا ہم کو تو ایک جگہ بھی دلیل عقلی نہیں ملی سو بات یہ ہے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن کا طرز دلائل کے بارہ میں استدلال منطقی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اکثر دلائل قرآن کے اقنائی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اقناعی ہی ہیں بلکہ محض طرز کے اعتبار سے اقنائی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب دلائل عقلیہ ہیں جو طرز عقلی پر بخوبی منطبق ہو سکتے ہیں بالخصوص دو موقوعوں میں تو یہ انطباق بہت ہی ظاہر ہے ایک سورہ بقرہ کی اس آیت میں رَاتٍ فِي تَخْلُقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَأْتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ہیر پھیر اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لئے ہوئے سمندروں میں چلتا آسمان سے پانی اتار کر مرڈ زمین کو زندہ کر دینا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا ہواؤں کے رخ بدلتا تابع فرمان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان ادھر ادھر پھرنا عقلمندوں کے لئے قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں)

اس آیت میں چونکہ لفظ يَعْقِلُونَ موجود ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دلیل عقل کے مطابق ہے اس لئے مفسرین کو موقع مل گیا کہ انھوں نے طرز عقلی پر اس کا انطباق خوب بیان کیا۔ دوسرا موقع اس آیت میں ہے لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔ (اگر ان زمین و آسمان میں چند معبود ہوتے تو البتہ فاسد ہو جاتے)



دعاصل اس دلیل عقلی کا یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں۔ بعض تو بدهتہ بوجہ مشاہدہ کے کیونکہ بعض کی نسبت ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال میں تغیر و تبدل کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور بعض چیزیں اجزاء سے مرکب ہیں یہ بھی امکان کی علامت ہے اور بعض اشیاء بعض کی محتاج ہیں اور احتیاج بھی ممکن کا خاصہ ہے۔

غرض یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور ممکن کا وجود و عدم چونکہ برابر ہوتا ہے اس لئے وہ کسی مرجح کا محتاج ہے۔ وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا اور اس کے وجود کے لئے بھی کسی مرجح کی ضرورت ہوگی و علیٰ ہذا القیاس اور تسلسل محال ہے اس لئے اس کو قطع کرنے کے لئے کسی جگہ یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح واجب الوجود ہے جس کا وجود ضروری اور معدوم ہونا محال ہے۔

وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ تو دلیل ہے وجود صالح کی اب رہا اس کا واحد ہونا سوا اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ واجب الوجود متعدد مثلاً دو مانے جاویں تو آیا ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر کامل ہونا ضروری پہلی شق محال ہے کیونکہ عاجز ہو سکتے والا واجب الوجود نہیں ہو سکتا اور دوسری شق پر یہ سوال ہے کہ اگر ان میں سے ایک نے کسی کام کا ارادہ کیا۔ مثلاً زید کے موجود کرنے کا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ وجوب وجود کے منافی ہے اور اگر خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے تو اس کے ارادہ پر مراد کا مرتب ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادر مطلق کے ارادہ سے مراد کا مختلف لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آویگا۔

مع وعظا میں یہ دلیل اس تفصیل سے بیان نہ ہوئی تھی محض اشارہ کیا گیا تھا احقر جامع نے تفسیر بیان القرآن مصنفہ حضرت حکیم الامتہ دام مجدہم سے اس کو مفصل نقل کر دیا ہے۔

مع تغییر یسیر فی العبارة روماً للتسہیل ۱۲ جامع

کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر اس کی مراد یعنی نذید کا وجود مرتب ہوگا اور دوسرے کے ارادہ پر اس کی مراد جو کہ پہلے کی ضد ہے یعنی نذید کا عدم مرتب ہوگا اس صورت میں اجتماع ضدین لازم آوے گا جو کہ محال ہے پس واجب الوجود کا متعدد ہونا ہی محال ہے پس ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود ہمیشہ واحد ہی ہوگا اور یہی مقصود ہے خوب سمجھ لو، اس جگہ ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اس طرح استدلال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ توحید کی دلیل کے لئے مطلقاً کسی مصنوع کا بیان کر دینا کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے ان مقامات پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں کا بیان فرمایا ہے جو علاوہ مخلوق و مصنوع ہونے کے ہمارے حق میں نعمت بھی ہیں جس سے حاصل یہ ہوا کہ عبادت جس کی فرود اعظم توحید ہے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدا کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں اور اس لئے بھی فرٹی ہے کہ منعم بھی حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں گویا اس طرح دلیل عقلی کے ساتھ ایک داعی طبعی بھی بیان فرمادیا کیونکہ منعم کے احسان کا ماننا اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا طبعی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے تو خدا تعالیٰ کے انعامات پر نظر کر کے طبعی مؤثر سے تو متاثر ہونا چاہیے اس نکتہ کی وجہ سے تمام قرآن میں جہاں توحید کی دلیل کا ذکر ہے وہاں نعمتوں کا ذکر ضرور ہے چنانچہ اس آیت میں سَمَّوْا لَكُمْ فِي لَامِ مَنْفَعَةٍ مِنَ الْاَنْعَامِ کی طرف اشارہ ہے اور آگے تو بالکل تصریح ہی کر دی وَ اَسْمِعْ عَلَیْكُمْ نِعْمَهُ ظَاهِرَةً وَ بَاطِنَةً اور کامل کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی ہیں اس میں نعمت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں نعمت ظاہرہ وہ ہے جو جو اس ظاہرہ یا باطنہ سے محسوس ہو اور نعمت باطنہ وہ ہے جو عقل سے معلوم ہو یا یہ جو اس ظاہرہ سے محسوس ہو وہ ظاہرہ ہے اور جو جو اس باطنہ و عقل سے معلوم ہو وہ باطنہ ہے بہر حال اس میں نعمتوں کا اجمالاً پوری طرح احاطہ کر دیا گیا اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے نعمت کی تقسیم ظاہر فرمادیں وَ رَنِّ نِعْمَ بَاطِنًا (باطنی نعمتوں)

کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی کیونکہ اس تقسیم کے بعد بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو نعم باطنہ کو نعمت ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ نعمت سمجھتے بھی ہیں وہ نعم ظاہرہ کی برابر ان کی قدر نہیں کرتے چنانچہ نعمت باطنہ یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائی جس کا فرد اعظم اسلام ہے۔ اب ذرا انصاف سے بتلائیے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی زبان سے یوں کہا ہو کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو اسلام کی دولت عطا فرمائی۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے۔ اسی طرح علم اور حب فی اللہ۔ بغض فی اللہ۔ توکل و رضا وغیرہ یہ سب نعم باطنہ ہیں ان پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور یہ حال تو اس پر ہے کہ حق تعالیٰ نے نعم باطنہ کی طرف متوجہ بھی فرمایا ہے اور اگر وہ نعمت کی تقسیم نہ فرماتے تو شاید کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ اَلَا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ دگر جس کو اللہ چاہے اور ایک بہت بڑی فہرست نعمتوں کی ہماری نظر سے غائب ہو جاتی چنانچہ خود عقل بھی ایک نعمت ہے جو کہ ایک نور کا نام ہے جو انسان کو حق تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مددک کلیات ہے اور یہ بھی نعم باطنہ میں داخل ہے۔ باطنہ فرمانے سے اس پر تنبیہ ہو گئی اور اس پر تنبیہ کی ضرورت بھی تھی کیونکہ بعض لوگ عقل کے منکر ہیں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کے اندر عقل نہیں ہے حالانکہ جانور اور انسان میں فرق ظاہر ہے مگر یہ خدا کے بندے پھر بھی عقل کے منکر ہیں اس کا عقلی جواب تو ہے ہی مگر لطیفہ کے طور پر ایک جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کا حال خوب جانتا ہے تو وہ جو عقل کے منکر ہیں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں سو ان میں واقعی عقل نہ ہوگی اور ہم کو اپنے گھر کا حال معلوم ہے اور ہمارے اندر عقل ہے ہم کو خود اپنا حال معلوم ہے اس لئے ہم عقل کے منکر نہیں ہیں۔ یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ ایک بزرگ نے معتزلہ کے جواب میں بطور لطیفہ کے فرمایا ہے کہ معتزلہ جو روایت الہیہ کے آخرت میں منکر ہیں وہ بھی صحیح کہتے ہیں۔ ان کی بات کو رد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بے چارے اپنا حال بیان

کر رہے ہیں کہ ہم آخرت میں رویت الہیہ سے محروم رہیں گے سو وہ اس نعمت سے محروم ہیں اس لئے وہ انکار میں معذور ہیں اور اہل سنت والجماعت جو رویت کے قائل ہیں وہ اپنا حال بیان کر رہے ہیں سو ان شار الشریعہ کو دیدار ہوگا اس لئے ہم اس کے قائل ہیں۔ الغرض عقل کے وجود میں بھی بعض لوگوں نے کلام کیا ہے اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نعمت پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال عقل کے وجود پر دلیل صحیح اور کشف موجود ہے جس سے معلوم ہو گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نور اور اک ایسا ہے جو حیوانات کے اندر نہیں ہے اور اسی سے انسان حیوانات وغیرہ سے ممتاز ہے اور یہ عقل انسان کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتی ہے جو ابتداء میں اپنا کام نہیں کرتی کیونکہ بچپن میں تمام قوی باطنہ قوی ظاہرہ کی تدبیر بدن میں مصروف ہوتے ہیں اس لئے پیدا ہونے کے ساتھ ہی عقل اپنا کام نہیں کرتی پھر جوں جوں بدن کی قوت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر عقل اپنا کام کرتی ہے حتیٰ کہ بلوغ کے وقت شرعاً وہ کامل ہو جاتی ہے اسی لئے شریعت نے بالغ کو احکام کا مکلف بنایا ہے اس پر یہ اشکال نہ ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ابتداء بلوغ میں بھی اکثر لوگوں کو پوری عقل نہیں ہوتی۔ پوری عقل تو ۳ یا ۴ سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلوغ کے وقت عقل تو کامل ہو جاتی ہے لیکن تجربہ کم ہوتا ہے۔ اور ۳، ۴ سال کی عمر میں تجربہ بھی کافی ہو جاتا ہے اس عمر میں کچھ عقل نہیں بڑھتی بلکہ تجربہ بڑھتا جاتا ہے لیکن تجربہ کی وجہ سے اس کی باتوں میں اور اعمال میں پختگی اور استواری پیدا ہو جاتی ہے اس سبب سے لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ۳، ۴ سال کی عمر میں عقل زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمر میں عقل ہی بڑھ جاتی ہو۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آیا کہ بلوغ کے وقت عقل کامل نہیں ہوتی۔ بس یوں کہتا چاہیے کہ بلوغ کے وقت اتنی عقل ضرور ہو جاتی ہے کہ احکام الہیہ کو اور اپنے نفع و نقصان کو سمجھ سکے پھر اس کے بعد دن بدن عقل کو ترقی ہوتی رہتی ہے مگر وہ ترقی تکلیف احکام کا موقوف علیہ نہیں مکلف

ہونے کے لئے وہی مقدار عقل کافی ہے جو بلوغ کے وقت عموماً ہوتی ہے اور یہاں سے منکرین معاد کی ایک غلطی معلوم ہوئی وہ یہ کہ بعض لوگ معادیات کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ وہ امور محسوس نہیں ہیں مثلاً جنت و دوزخ کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ نہیں ہوا تو ان کو اس تقریر سے سمجھنا چاہیے کہ بعض امور متفق علیہا مسلم عند الکل بھی ایسے ہیں جن کے وجود کا محض دلیل سے اعتقاد کیا گیا ہے اور ان کا مشاہدہ کسی نے آج تک نہیں کیا جیسے عقل اور روح وغیرہ کہ منکرین معاد بھی ان کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اب اگر ہر چیز کا وجود مشاہدہ کے بعد ہی تسلیم کیا جائے تو پھر یہ لوگ عقل و روح کے وجود کے کیونکر قائل ہو گئے پس معلوم ہوا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا وجود یقینی ہے مگر مشاہدہ محسوس نہیں۔ اسی طرح جنت و دوزخ وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان اشیاء کا وجود بھی دلیل صحیح سے ثابت ہے لہذا اس کو تسلیم کرنا لازم ہے گو مشاہدہ کسی نے نہ کیا ہو اور جس طرح عقل نعم باطنہ میں سے ہے اسی طرح بعض علوم بھی جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے نعم باطنہ میں سے ہیں جیسے تمام علوم عقلیہ گو وہ منقول ہی ہوں ان کا ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے جو اس سے نہیں ہو سکتا کیونکہ نقل میں الفاظ کا ادراک سمع سے ہوتا ہے اور نقوش کا بصر سے لیکن معانی کا ادراک تو عقل ہی سے ہوتا ہے اور علوم نام معانی ہی کا ہے اسی طرح جس قدر باطنی حالت و کیفیات و اخلاق و مقامات ہیں وہ بھی سب نعم باطنہ میں داخل ہیں اور یہ سب ظاہری اور باطنی نعمتیں حق تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں ان کے سوا صالح و خالق اور منعم کوئی نہیں۔ پس معبود بھی ان کے سوا کوئی نہیں یہ حاصل ہے توحید کی دلیل کا آگے حق تعالیٰ منکران توحید کی شکایت فرماتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّبِينٍ  
یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جدال کرتے ہیں۔ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ  
اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں، سے مراد يُجَادِلُ فِي تَوْحِيدِ اللَّهِ  
اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں جدال کرتے ہیں، مضاف مقدر ہے یعنی خدا کی توحید میں

جھگڑا کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور ان دلائلِ بیینہ میں غور نہیں کرتے۔ اس آیت میں منکرانِ توحید کی متعدد مذمتیں مذکور ہیں چنانچہ اول تو جدال ہی فی نفسہ مذموم ہے کیونکہ ہر چہ کہ بظاہر جدال کی دو قسمیں ہیں ایک جدالِ بحق ہے ایک جدالِ بالباطل جیسا کہ *جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ* ان سے احسن طریقہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ جدالِ بحق کرو، سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال کا اطلاق جدالِ بحق پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کے تتبع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جدال اور جدل کا اطلاق اکثر جدالِ بالباطل پر ہی ہوتا ہے یہ بات سارے قرآن کو دیکھ کر بھی نہ ٹوٹے گی۔ اور جہاں جدالِ بالحق پر جدال کا اطلاق آیا ہے وہ اطلاق صورتِ جدال پر مشاکلتہ ہے کیونکہ خواہ جدالِ بالحق ہو یا بالباطل صورتِ دونوں کی ایک سی ہوتی ہے۔ جیسا مشاکلتہ *جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا* (برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے) فرمایا گیا کیونکہ صورتِ دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ صورت کے یکساں ہونے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک مولوی صاحب کی دستار بندی ہوئی تھی مگر وہ کسی قابل نہ تھے کتابیں سمجھ کر نہ پڑھی تھیں۔ دستار بندی کے وقت استاد سے کہنے لگے کہ اس وقت تو لوگ مجھے فاضل سمجھیں گے مگر میں حقیقت میں مدفاضل ہوں اگر لوگ مجھ سے مسائل دریافت کرنے لگے تو میں کیا کروں۔ استاد نے کہا کہ میں ایسی ترکیب بتلاتا ہوں جس سے تمہاری رسوائی نہ ہو بلکہ اور وقعت بڑھ جاوے گی۔ تم ہر سوال کے جواب میں یہ کہدیا کرنا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اس کے بعد کچھ نہ کہتا ورنہ قلمی کھل جائے گی۔ تو اب دیکھئے یہ جواب ایسا ہے کہ اس کو بڑا محقق وسیع النظر بھی بیان کر سکتا ہے اور ایک جاہل بھی کسکتا ہے ظاہر میں دونوں کے جواب یکساں ہوں گے۔ لیکن حقیقت شناس فرق کو سمجھ لے گا اسی طرح جدالِ بالحق و بالباطل کی صورت یکساں ہوتی ہے اس لئے دونوں پر جدال کا اطلاق یکساں کر دیا جاتا ہے مگر حقیقت دونوں کی بالکل جدا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ میں آخران مولوی صاحب کی قلمی ایک دن کھل ہی گئی بات یہ ہے کہ سمجھنے والے لبِ لہجہ سے سمجھ جاتے ہیں کہ اس قول کا منشا تحقیق اور وسعتِ نظر ہے یا جہلِ محقق کے

لہجہ میں جرأت اور استغنا کی شان ہوتی ہے اور ناقص اگر بڑی بات منہ سے نکالے گا تو اس کے لہجہ میں پستی اور کم ہمتی نمایاں ہوگی وہ محقق کی طرح جرأت کے ساتھ ایسی بات نہیں کہہ سکتا اس لئے کوئی پرکھنے والا سمجھ گیا کہ یہ مولوی صاحب جوہر بات میں یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کچھ آتا و اتا نہیں محض ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ اس نے امتحان کے طور پر پوچھا کہ مولانا کَاللّٰہِ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے بارے میں کیا تحقیق ہے تو آپ نے ساختہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے بس ان کو یہی ایک جواب یاد تھا۔ جیسے ایک طوطی کا قصہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کسی شخص نے اس کو یہ لفظ یاد کرا دیا تھا دریں چہ شک (اس میں کیا شک) اور بازار میں آکر دعویٰ کیا کہ یہ طوطی فارسی زبان جانتی ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ ایک شخص نے اس کو خریدنا چاہا مالک نے بہت قیمت بتلائی اس نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تو اس قیمت کے لائق ہے جو یہ شخص مانگتا ہے۔ اس نے وہی کہا دریں چہ شک۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ واقعی طوطی فارسی خوب جانتی ہے دیکھو کیسا بر محل جواب دیا ہے۔ اب تو خرید کر گھر لے گئے اور اس سے باتیں کرنے بیٹھے تو وہ ہر بات کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہتی چلی جاتی ہے موقع ہو یا نہ ہو آخر اس نے جھلا کر کہا کہ میں تہایت ہی احمق تھا جو اتنی رقم کثیر خرچ کر کے تجھ کو لایا اور دھوکہ میں آ گیا۔ اس نے اس کے جواب میں بھی یہی کہہ دیا دریں چہ شک خیر یہاں تو جواب بر محل ہو گیا گو اس نے قصد نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ان مولوی صاحب کو بھی بس اتنا ہی یاد تھا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے حتیٰ کہ آپ نے کَاللّٰہِ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو بھی اختلافی بتلایا اگرچہ فی نفسہ یہ بھی صحیح تھا کیونکہ کفار کو توحید رسالت میں بھی اختلاف ہے لیکن مسلمان کے استفتاء کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے تو اس میں توائمہ مذاہب کا بھی اختلاف مراد ہوتا ہے۔ بس اب تو لوگوں میں ان مولوی صاحب کی خوب ہی قلعی کھلی کہ یہ کون جاہل ہے جو کلمہ شریف کو بھی اختلافی بتلاتا ہے اسی کے مشابہ ایک اور حکایت مجھے یاد آئی۔ کا پیور میں عبدالرحمن خاں صاحب

مالک مطبع نظامی کا ایک ملازم تھا وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ جب تم حج کو چلو تو مجھ کو بھی ساتھ لے چلنا میں نے اس سے کہا کہ پہلے تم کچھ عربی سیکھ لو تا کہ وہاں کی زبان سمجھ سکو۔ وہ بے چارہ عربی نیکھنے پر بھی راضی ہو گیا میں نے اس کو اول یہ لفظ سکھا یا۔ هَاتِ الْحَجْرَ رُذَيْلَةَ اور یہ کہد یا کہ جب میں یہ لفظ کہا کروں تم اسی وقت استنجا کے واسطے مجھے ڈھیلا لادیا کرو۔ وہ بیچارہ روز اس پر عمل کرتا۔ ایک دن مجھے استنجا کی ضرورت تھی اس لئے میں نے ڈھیلا نہ مانگا تو آپ خود ہی کہتے ہیں مولوی صاحب هَاتِ الْحَجْرَ بِرُذَيْلَةَ کہا سبحان اللہ بندر کے ہاتھ لگی ہلدی کی گرہ اس نے کہا میں ہی پتساری ہوں۔ اب آپ نے هَاتِ الْحَجْرَ کیا سیکھا ہے کہ ہر جگہ اسی کا استعمال شروع کر دیا۔ امر کا صیغہ استفہام میں برت رہے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ جہاز میں بنگالی لوگ آکر اپنی زبان میں کچھ سوالات کرتے جس کو میں نہ سمجھتا اور ان کو یہ بھی نہ سمجھا سکتا کہ میں نہیں سمجھا۔ آخر میں نے ایک اردو داں بنگالی سے کہا کہ مجھے اتنا بنگلہ سکھا دو کہ جب کوئی ایسا بنگالی مجھ سے بنگلہ میں باتیں کرے تو میں اس سے یہ کہدوں کہ میں بنگلہ نہیں سمجھتا انھوں نے کہا کہ تم یوں کہدیا کرو بنگالی بوزی نا یعنی بوجھی نا اور سننے میں بوزینہ آتا ہے جس کے معنی فارسی کے اعتبار سے بہت بُرے ہیں، تو مجھے ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ بینگالیوں سے یہی کہدیا کرتا بنگالی بوزینہ اور اس میں میرے نفس کی شرارت بھی مضمر ہوتی تھی مگر ایک بنگالی نے مجھے خوب ہی جواب دیا جب میں نے اس سے کہا بنگالی بوزینہ تو اس نے بیساختہ جواب دیا ہندوستانی بوزینہ یعنی میں اردو نہیں سمجھتا۔ العرض جدان بالحق کو مشاکلہ جدال کہدیا گیا ہے۔ مجھے مشاکلت پر ایک اور مسئلہ یاد آ گیا وہ یہ کہ انبیاء و اولیاء پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہے حقیقت مصیبت نہیں کیونکہ مصیبت کے بارہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے اس پر اثر کال ہوتا ہے کہ انبیاء و اولیاء پر بھی تو مصیبت آتی ہے تو کیا



اُن پر بھی گناہوں کے سبب سے آئی ہے۔ اس کا ایک جواب تو تسلیمی ہے کہ ہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق خطا سے کون خالی ہے۔ لیکن یہ جواب اولیاء کے بارہ میں تو صحیح ہے۔ انبیاء کے بارہ میں بے تکلف جاری نہیں ہو سکتا کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے جو کچھ خطا ہوتی ہے وہ اجہتا دی خطا ہے جس پر ان کو ثواب ملتا ہے تعد معصیت کی ان میں ہرگز گنجائش نہیں اس لئے وہاں یہ کہنا کہ مصائب کا سبب ان کی خطائیں ہیں بہت بعید ہے بلکہ ان کی مصائب کا سبب محض رفع درجات ہے تو مَا أَصَابَكُمْ كَمَا خَطَابَ صِرْفِ عَصَاةٍ كُوهُوَ كَمَا جَنَّا نَحْمَ مَا كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ اس کا قرینہ ہے۔ اس لئے دوسرا جواب سب سے لطیف ہے کہ یہ بالکل سچ ہے کہ مصیبت گناہوں ہی کی وجہ سے آتی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مصیبت کہتے کس کو ہیں۔ مصیبت وہ ہے جس سے پریشانی اور انقباض لاحق ہو اور انبیاء و اولیاء بیماری وغیرہ سے پریشان اور منقبض نہیں ہوتے تو یہ بیماری اور فاقہ اور تنگدستی وغیرہ ان کے حق میں مصیبت ہی نہیں بلکہ راحت ہے جیسے کوئی معشوق پیچھے سے آکر اپنے عاشق کو بغل میں دبا لے اور اول تو اس کو کلفت معلوم ہوگی۔ لیکن جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ دبانے والا محبوب ہے اس وقت ساری کلفت دور ہو جائے گی اور چاہے گا کہ تھوڑی دیر اور دبائے رہے۔

حدیث میں زاحر صحابی رضی اللہ عنہ کا قصہ وارد ہے۔ یہ دیہات کے رہنے والے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دیہات کی چیزیں لایا کرتے تھے اور آپ ان کو شہر کی چیزیں عطا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مذکور ہے **رَأَى زَاهِرًا يَتَنَادَى حَاضِرًا رَزَاهِرًا دِيهَاتِي** اور ہم شہری ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ یہ بازار میں جا رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے تشریف لاکر ان کو دبا لیا۔ اول تو زاہر بڑکے گھبرائے کہ یہ کون ہیں جب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو حدیث میں آتا ہے کہ پھر تو زاہر اپنی کمر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے خوب رگانے لگے تاکہ جسداہلر

سے مس ہو کر برکت حاصل ہو جائے پھر آپ نے فرمایا کہ کوئی اس غلام کو خریدتا ہے وہ کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ مجھے فروخت کریں گے تو مجھے بہت کھوٹا پائیں گے میرا کوئی بھی گاہک نہ ملے گا آپ نے فرمایا لیکن تم خدا کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو تو کیا کوئی ایسا کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دبا بیٹے سے حضرت زاہر کو کچھ کلفت ہوئی تھی ہرگز نہیں اس میں جو کچھ ان کو لطف آیا ہوگا انہی کے دل سے پوچھنا چاہیے رچھر غلام کے لفظ سے یاد کرنے میں جو مسرت حضرت زاہر کو حاصل ہوئی ہوگی اس کو ان کے سوا کون بتلا سکتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ۷

بس کہا مجھ کو اے میرے غلام سب سے پیارا نام ہے میرا یہی امن الجامع  
اسی طرح انبیاء و اولیاء پر جب کلفت آتی ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ نازل کرنے والا کون ہے یوں کہتے ہیں ۷

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے محبوب پر دل قربان ہے،

جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

بلکہ بعض دفعہ جو اُس کلفت کے انوار و آثار کو دیکھتا ہے تو عراقی کی طرح زبان  
حال سے کہتا ہے ۷

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاکت تیغ تیرے دوستوں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سلامت

بہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

پھر اس کو بیماری اور تنگدستی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس کو دور ہوتا پسند نہیں ہوتا۔  
حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا پر جب فاقہ اور مرض نہ ہوتا تو بے قرار ہو کر فرماتیں کہ  
شاید محبوب ناراض ہیں جو بہت دنوں سے پیام و سلام نہیں آیا۔ یعنی فاقہ اور بیماری  
یہ ان کے نزدیک محبوب کا پیام و سلام تھا۔ پھر ان لوگوں کی بیماری اور فاقہ مستی  
کو مصیبت کون کہہ سکتا ہے ہاں یوں کہئے کہ صورت مصیبت ہے جیسے آپ نے

دیکھا ہوگا کہ بعض کارگر لوگ مٹھائی کی چیزیں بنا یا کرتے ہیں کبھی مٹھائی کا درخت بناتے ہیں کبھی پھول پتے وغیرہ تو عوام کی مصیبت کو اور خواص کی مصیبت کو یوں سمجھئے جیسے ایک تو نیم کا اصلی پتہ ہو دوسرا اسی کی شکل میں مٹھائی کا بنا ہوا پتہ ہو صورت دونوں کی یکساں ہے مگر حقیقت میں آسمان زمین کا فرق ہے کہ ایک تلخ ہے ایک شیریں ہے اسی لئے حضرت رابعہ فاقہ و مرض کے نہ آنے سے بے چین ہو جا یا کرتی تھیں آخر ان کو کچھ تو مزہ اس میں آتا ہوگا لیکن یہ ایک مذاق ہے اور دوسرا مذاق اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ ہر حال میں خوش ہو۔ نہ صحت سے بے چین ہو نہ مرض سے نہ فاقہ کے آنے سے گھبرائے نہ جانے سے اس سے بھی راضی ہو اس سے بھی راضی ہو بس اس کا حال اس کا مصداق ہو۔

زندہ کنی عطلے تو در بکشی فدائے تو

دل شدہ بستلے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بختیں تو زہے نصیب اور موت دیں تو زہے قسمت جب جان آپ کی عاشق ہو گئی تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

اور یہ حالت اس لئے افضل ہے کہ اس میں اپنے اختیار و ارادہ کا فناء کلی ہے کہ اپنے لئے کسی حالت کو تجویز نہیں کرتا اگر حق تعالیٰ تندرست رکھیں مال و دولت عطا فرماویں اس سے بھی راضی ہے اگر بیمار رکھیں فاقہ بھیجیں اس سے بھی خوش ہے خوشی اور غم کلفت و راحت مدح و مذمت دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں اور یہی کمال عبدیت ہے لوگ اہل اللہ کی تکالیف کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ان کی طرح پریشان ہوں گے مگر جس کو یہ دولت حاصل ہو جس کا مذاق عبدیت اور فنا ہو چکا ہو بھلا وہ بھی کہیں تکلیف سے پریشان ہوا کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ روتے بھی ہوں آہ بھی کرتے ہوں بیماری میں ترپتے بھی ہوں مگر اس ترپنے سے ان کا دل پریشان نہیں ہوتا دل کو اس وقت ایک خاص سرور و لذت حاصل ہوتی ہے باطن میں وہ پوری راحت میں ہوتے ہیں۔

دما دم شراب الم در کشند وگر تلخ بینند دم در کشند  
 (ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش  
 رہتے ہیں)

آخر آپ نے سنا ہو گا کہ بعض عشاق نے محبوبوں کے ہاتھ سے قتل ہونا بخوشی گوارا کیا ہے تو کیا قتل کے بعد ان کی لاش تڑپی بھی نہ تھئی تڑپی ضرور تھئی لیکن اس کو خلاف محبت و عشق کوئی نہیں سمجھتا اسی طرح اگر اہل اللہ سے ظاہر میں کلفت کی وجہ سے آہ و نالہ اور اضطراب صادر ہو تو یہ محبت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے کہ کلفت کا احساس ہو ہاں ان کا دل مسرور ہوتا ہے جس پر واقعات بکثرت شاہد ہیں۔ ایک بزرگ کے بدن پر کیرے پڑے ہوئے تھے وہ بے چارے راستہ میں سڑک کے کنارے آپڑے تھے ان پر ایک دوسرے بزرگ کا گذر ہوا ان کو ان کی حالت دیکھ کر رحم آیا۔ دیکھا کہ زخموں پر ہزاروں نکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں ان بزرگ نے ترس کھا کر ان کا سراٹھا کر اپنے زانووں پر رکھ لیا اور پنکھا جھلنے لگے۔ اس شخص نے معاً آنکھیں کھول دیں اور کہا جاؤ یہ کون ہے جو میرا اور محبوب کے درمیان آ کر حائل ہو گیا تم میرے حال پر کیا ترس کھاتے ہو مجھے تمہارے حال پر رحم آتا ہے۔ یہ حکایت تو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ اور ایک واقعہ میرے بچپن کے زمانہ کا ہے میرے ایک عزیز جو درویش تھے۔ کبیل اوڑھے ہوئے اپنے ایک عزیز سے ملنے آئے۔ وہ دوسرے صاحب شال اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ شال اوڑھنے والے ان درویش سے کہنے لگے کہ تم نے کیا ڈھونگ بتایا ہے کہ لباس چھوڑ کر کبیل دیا یہ کبیل تو زہر لگتا ہے۔ تو وہ درویش بے ساختہ کہنے لگے کہ مجھے تمہارا یہ شال زہر لگتا ہے میں کیا کروں الغرض آپ کو ان کی کلفت پر رحم آتا ہے اور ان کو آپ کی تندرستی و ناز و نعم پر رحم آتا ہے کہ یہ لوگ آخرت میں درجات سے اور دنیا میں محبوب کی چھپر چھارے سے محروم ہیں۔

حضرت بشلیؑ جب کسی امیر کو دنیا میں منہمک دیکھتے تو یہ دعا پڑھا کرتے  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي عَافَانِي مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهِ وَفَضَّلَنِي عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقَ

تَفْضِيلًا ۵ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھ کو عافیت دی اس چیز سے جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور اپنی مخلوق سے بہتوں پر فضیلت دی (حدیث شریف میں یہ دعا بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کے لئے وارد ہوئی ہے کہ جب کسی مریض و مبتلا کو دیکھو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔  
ان شاء اللہ تعالیٰ تم اس مرض و بلا سے محفوظ رہو گے۔ مگر فقہانے یہ لکھا ہے کہ یہ دعا آہستہ سے پڑھے مریض کو سنا کر نہ پڑھے تاکہ اس کی دل شکستی نہ ہو تو حضرت شیخ زبیرؓ زیادہ دنیا کو بھی بلا سمجھتے تھے اور اس سے محفوظ رہنے پر شکر کرنے کے لئے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات فقرے کس درجہ راضی ہوں گے۔

حضرت غوث اعظمؒ کو بادشاہ سجستان نے لکھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خانقاہ کے لئے ملک نیمروز کا کوئی حصہ وقف کر دوں تاکہ ذاکرین و شائین کے خرچ کو کافی ہو جایا کرے۔ آپ نے اس کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ہے

چوں چتر سجری رخ بخت سیاہ باد در دل اگر بود ہوس ملک سجرم  
زانگہ کہ یافتم خیر از ملک نیم شب من ملک نیمروز بیک جوئی خرم  
دچتر سجری کی طرح میرا بخت سیاہ ہو ہو اگر میرے دل میں سجری کے ملک ہو س بھی ہو  
جب سے مجھے آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے  
میں نہیں خریدتا)

ان عارفین کے کلام میں ظاہری شوکت و بلاغت بھی بہت ہوتی ہے اور باطنی شوکت تو ان کا حصہ ہے  
لہذا الحمد للہ اس کا نمونہ اس وقت بھی موجود ہے میرے نخلص دوست جناب خواجہ عزیز الحسن صناعوری جو بفقہ  
تعالیٰ دولت جذب معرفت سے مالا مال ہیں کبھی کبھی اشعار بھی تصنیف فرمادیا کرتے ہیں باوجودیکہ آپ کسی عو کے شاگرد  
نہیں مگر طبیعت خداداد کیتھا جذب باطنی کے بل جگے آپ کے کلام میں وہ شوکت و سولت ہے کہ بعض مشاعروں میں جب آپ کی غزلیں  
پڑھی گئیں تو بڑے بڑے نامی شعرا کی غزلیں پھینکی پڑ گئیں بعض مرتبہ خواجہ صناعی کے کسی شعر کی داد میں لوگ بیستا کھڑے  
ہو ہو جاتے تھے بعد میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ شعراء کو آپ سے حسد ہونے لگا پس یہ بات بالکل سچ ہے کہ عارفین کے  
کلام میں ظاہری شوکت و سولت و بلاغت بھی زیادہ ہوتی ہے کثرت اللہ قینا أمنا لله آمین۔ اکثر  
کوئے اللہ تعالیٰ ہم میں ان جیسے لوگوں کی یا یہ دعا قبول کرے

آخر کوئی بات تو ان کو نصیب ہے جو دنیا کی لذتوں سے اس قدر سیر ہو گئے صابو !  
ان کے دل میں ایک دولت ہے جس نے ان کو سب دولتوں سے بے نیاز کر دیا ہے  
وہ کیا ہے وہ یہ ہے جس کو عارف شیرازی نے بیان فرمایا ہے ۵

بفراغ دل زمانے نظرے بساہ روی

بہ ازاں کہ پتہ شاہی ہمہ روزہ وہائے وہوئے

(فراغ دل سے کچھ وقت محبوب کے چہرہ پر نظر کرنا تمام دن ہو وہائے کی

پتہ شاہی سے بہتر ہے)

واللہ ایک بار فراغت قلب کے ساتھ محبوب کی طرف نظر کرنا سلطنتِ ہفت اقلیم سے  
افضل ہے۔ خاقانی کہتے ہیں ۶

پس از سی سال این معنی محقق شد بجا فتانی

کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

(تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک دم خدا تعالیٰ

کے ساتھ مشغول ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے)

اس میں سلیمان علیہ السلام کی توہین کا شبہ نہ کیا جائے چنانچہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہوگا  
کہ یکدم با خدا ہونا ملک سلیمانی سے افضل ہے تو معلوم ہوا کہ نعوذ باللہ سلیمان علیہ  
السلام کی سلطنت ان کے لئے مفضول حالت تھی جو اب یہ ہے کہ مطلب شعر کا یہ ہے  
کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی کہ یکے غیر سلیمان علیہ السلام دادہ شود (ایک  
دم خدا کے ساتھ مشغول ہونا اس ملک سلیمانی سے بہتر ہے جو سلیمان علیہ السلام کے علاوہ  
کسی اور شخص کو دیدیا جائے) باقی سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں یا خدا بودن  
کے خلاف نہ تھا بلکہ وہ تو اس سلطنت میں بھی ہر دم با خدا تھے ان کی سلطنت بھی ذکر  
میں داخل تھی کیونکہ ذکر کی ایک نوع یہ بھی ہے لنگوٹہ باندھنے ہی کا نام بزرگی نہیں کالمین  
کو دنیا خدا تعالیٰ سے غافل نہیں کیا کرتی یہ حالت ناقصین کی ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے  
حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب سلطنت کی دعا کی ہے تو ساتھ میں یہ بھی فرمادیا

رَبِّ هَبْ لِي مَلَكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي يَعْنِي مجھے ایسا ملک عطا ہو جو میرے  
بعد والوں کے لئے ملنا مناسب نہ ہو۔

مولانا رومی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ظاہراً اس سے حرص و حسد کا شبہ ہوتا ہے  
مگر واقعہ میں یہ شعفاً کے حق میں انھوں نے اس دعا میں عین رحمت فرمائی جس کی توجیہ یہ  
ہے کہ مِّنْ بَعْدِي میں بَعْدِیتِتِ زمانہ مراد نہیں بلکہ بعدیتِ رتبہ مراد ہے مطلب یہ  
ہوا کہ ایسا ملک مجھے عطا کیا جائے جو میرے درجہ والوں کے لئے خواہ مناسب ہو مگر  
مجھ سے کم درجہ والوں کے لئے غیر مناسب ہوگا یعنی ان کو عطا نہ کیا جائے کیونکہ وہ  
ایسی سلطنت سے کفر و تکبر میں مبتلا ہو جائیں گے اب اس تفسیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
کے متعلق کچھ اشکال نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ تو سلیمان علیہ السلام کے اعتبار سے مِّنْ  
بَعْدِي بلکہ مِّنْ قَبْلِي (مجھ سے پہلے) ہیں یعنی آپ تو ان کے ہم رتبہ نبوت و رسالت ہیں  
اور درجہ میں ان سے بھی افضل ہیں ختم ہوئی تفسیر مولانا کی۔ واقعی تفسیر کوئی ان حضرات  
سے سیکھے الغرض سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں باخدا ہونے کے خلاف نہ تھا  
وہ سلطنت کے ساتھ بھی ہر دم باخدا تھے اور حضرت سلیمان کو تو ملک کیا مضر ہوتا  
جبکہ حضرات صحابہ کو مضر نہ ہوا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ حضرات صحابہ کے پاس دنیا  
ایسی تھی جیسے منتر جاننے والے کے ہاتھ میں سانپ جس طرح منتر جاننے والے پر سانپ  
کے زہر کا اثر نہیں ہوتا اسی طرح حضرات صحابہ پر دنیا کا اثر نہ ہوتا تھا اس کی وجہ  
کیا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کے ہاتھ میں دنیا تھی دل میں دنیا نہ تھی۔ دل میں خدا کی  
محبت و معرفت اس درجہ بھری ہوئی تھی کہ وہاں دنیا و مافیہا کا گذر ہی نہ تھا مولانا  
نے عجیب مثال بیان فرمائی ہے۔

آب در کشتی ہلاک کشتی است

آب اندر زیر کشتی پشتی است

(کشتی میں پانی کشتی کو ڈبوئے والا ہے اور اس کے نیچے ہونا کشتی کیلئے پشتی ہے)

اور حضرات صحابہ کی بھی بڑی شان ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ ہے۔

صاحبو! اولیاء امت میں بھی ایسے بکثرت ہوئے ہیں جن کو سلطنت و ملک نے ایک ساعت کے لئے بھی پا خدا ہونے سے نہیں روکا۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار بہت بڑے بزرگ تھے اور اسی کے ساتھ آپ کے یہاں شاہانہ مٹھا ٹھ بھی تھا۔ مولانا جامی وہ زمانہ طلب میں حضرت خواجہ صاحب کی بزرگی کا حال سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا تو وہاں پورا شاہانہ سامان تھا مولانا جامی کو خطرہ ہوا کہ یہ شخص دلی اور عارف کیا ہوگا جس کے یہاں اس قدر دتیا بھری ہوئی ہے۔ دلی کو تو فقیروں ہونا چاہئے۔ اس خطرہ کو قوت ہوئی تو آپ نے بر ملا خواجہ صاحب کے منہ پر کہہ دیا۔

عز نہ مرد امت آنکہ دنیا دوست دارد

(جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مرد خدا نہیں ہے)

اور یہ کہہ کر وہاں ٹھہرے بھی نہیں آ کر مسجد میں لیٹ رہے۔ یہاں ان کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھتے ہیں کہ میدان حشر قائم ہے اور ایک شخص مولانا جامی کے سر پر ہوا ہے کہ میرا آپ کے ذمہ فلاں حق ہے وہ ادا کیجئے آپ کہتے ہیں کہ بھائی میرے پاس تو کچھ نہیں اس نے کہا پھر میں آپ کی نیکیاں لوں گا یہ بڑے پریشان تھے کہ اتنے میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی سواری سامنے سے گزری اور انہوں نے مولانا جامی کو اس حال میں دیکھ کر اپنی سواری روک لی اور فرمایا کیا قصہ ہے۔ حق دار نے اپنا مطالبہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ یہ شخص میرا مہمان ہے اس کو تنگ نہ کرو اور جو کچھ لینا ہو ہمارے خزانہ سے جو ہمارا یہاں جمع ہے جا کر لے لو ہیبت سے آنکھ کھل گئی تو دیکھا خواجہ صاحب نماز کے لئے سواری پر آ رہے ہیں مولانا جامی کے دل پر خواجہ صاحب کا رعب اور ان کی ہیبت جم گئی اور یہ سمجھے کہ واقعی یہ شخص خالی نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بڑا ہی صاحب ظرف ہے جس کو دنیا خدا سے غافل نہیں کر سکتی مولانا جامی بے ساختہ دوڑ کر قدموں میں جا گرے اور قصور کی معافی چاہنے لگے انہوں نے ہنس کر فرمایا کہ میاں خواب و خیال پر اعتماد نہیں کیا کرتے۔ اب تو ان کو اور بھی اعتقاد بڑھا کہ معلوم ہوتا ہے



یہ خواب بھی آپ ہی کا تصرف تھا اور اگر تصرف نہ تھا تو آپ کا کشف ہی بہت صحیح ہے بہر حال کھلی کرامت ظاہر ہوئی۔ مولانا جامی نے معافی چاہنے کے بعد سلسلہ میں داخل ہونے کی درخواست کی خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا ہم کو اپنا وہ مصرعہ دوبارہ سنانا جو تم نے آستے ہی پڑھا تھا۔ مولانا جامی نے عرض کیا کہ حضور وہ تو میری جہالت تھی اب میری کیا مجال ہے جو ایسی بات زبان سے کبھی نکالوں۔ فرمایا ایک بار تم نے اپنی خواہش سے پڑھا تھا ایک بار ہماری خاطر سے پڑھ دو اور یہ بے ادبی نہیں کیونکہ اب تو ہم خود اصرار کر رہے ہیں **ثُمَّ الْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبِ** (ادب سے بڑھ کر ہے) کا لحاظ کر کے پڑھ دو۔ غرض انہوں نے مجبور ہو کر پڑھا۔ **ع** نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد (جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مرد خدا نہیں ہے) حضرت خواجہ احرار رحم نے بیاختہ دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا۔ **ع** اگر دارد برائے دوست دارد (اگر دوست رکھے تو محبوب حقیقی کے لئے دوست رکھے) سبحان اللہ کیا عجیب جواب ہے جس میں کاملین کے پاس دنیا ہونے کی حقیقت کھول دی کہ وہ جو کچھ رکھتے ہیں دوست یعنی محبوب حقیقی کیلئے رکھتے ہیں اپنے نفس کے لئے یہ ساز و سامان نہیں رکھتے۔ یعنی مقصود بالذات نفس کی راحت نہیں ہوتی بلکہ ہر حال میں رضا کا قصد ہوتا ہے گو اس کی ساتھ راحت نفس بھی لازم آجائے۔ اور حقیقت میں یہ بڑا کمال ہے کہ متاع دنیا میں مشغول ہو کر انسان کا دل خدا سے غافل نہ ہو۔ الغرض کاملین کی نظر میں راحت و کلفت خوشی اور غم سب یکساں ہوتے ہیں کوئی حالت ان کو خدا تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی پس ان پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہوتی ہے حقیقت مصیبت نہیں ہوتی گویا اس کو مشاکلہ مصیبت کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح یہاں جدال بالحق کو مشاکلہ جدال کہہ دیا گیا کہ صورت ہر جدال کی ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ بات بھی پہلے ہی زمانہ کے ساتھ خاص تھی کہ جدال بالباطل کی صورت جدال بالحق کے مشابہ تھی کہ جس طرح اہل حق تہذیب کے ساتھ مناظرہ کرتے تھے اہل باطل بھی تہذیب کی رعایت کرتے تھے۔ باقی آجکل تو جدال بالباطل کا پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں۔ کیونکہ آجکل مناظرہ میں خصم پر پہیدیاں اڑانا خلاف تہذیب

باتیں استعمال کرنا خواہ مخواہ اپنی بات کی تیج کرنا ہر شخص کو معلوم ہو جاتی ہے جس سے سب سمجھ جاتے ہیں کہ اظہار حق مقصود نہیں محض ہمارا اور جیت مقصود ہے آجکل تو دنیا میں شاید ہی کہیں جدال بالحق ہوتا ہو ورنہ عموماً جدال بالباطل ہی ہوتا ہے۔ اور گویہ حالت بہت زمانہ سے ہے مگر اس زمانہ میں پہلے سے زیادہ ترقی ہے۔

امام ابو صفیہ رحمہ نے اپنے صاحبزادے حماد کو نصیحت فرمائی تھی کہ علم کلام و مناظرہ میں مشغول نہ ہونا انہوں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو خود مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا ہاں ہم نے مناظرہ کیا ہے لیکن ہماری یہ حالت تھی کہ ہم تمنا کرتے تھے کہ حق بات خصم کے منہ سے نکلے اور ہم اس کو قبول کریں اور تم کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ خصم کے منہ سے سوائے باطل کے کچھ نہ نکلے تاکہ تم غالب رہو ہم کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ہمارا مسلمان بھائی اپنی زبان سے غلط بات کہے پھر اس کی تیج کئے یا ہم حق بات کہیں اور اس کو ہار کر ہماری بات ماننا پڑے جس سے ہمارا غلبہ اور اس کا عجز ظاہر ہو یا ضد میں آکر وہ ہماری حق بات کو رد کرنے لگے تو اس کے ایمان کا ضرر ہو اس لئے ہم یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے تو ہم اس کو جلدی سے قبول کر لیں جس سے اس کی عزت بھی ہو اور حق بھی واضح ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کے بعد کا زمانہ بھی غنیمت تھا کیونکہ اس زمانہ کے لوگ جو یہ تمنا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے باطل کے سوا کچھ نہ نکلے اور حق بات ہمارے ہی منہ سے نکلے تو اس تمنا کا منشا یہ تھا کہ وہ لوگ اس بات کا قصد کرتے تھے کہ اگر کبھی خصم کے منہ سے حق بات نکل گئی تو ہم ضرور مان لیں گے ورنہ اگر ان کی نیت یہ نہ ہوتی تو اس تمنا کی ان کو کیا ضرورت تھی کہ خصم کے منہ سے باطل ہی نکلے معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ غلط بات ہی کا رد کرنا چاہتے تھے حق بات کے رد کرنے کا وہ قصد نہیں کرتے تھے مگر آجکل تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے نہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ باطل نکلے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے یہ بات دل میں ٹھان لیتے ہیں کہ خصم کے منہ سے جو کچھ نکلے گا اس کو رد ہی کرینگے خواہ حق ہو یا باطل ہو افسوس۔ تو یہ ایک تیسرا درجہ ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھا یہ آج کل پیدا

ہوا ہے کہ مناظرہ میں ہر شخص یہ ٹھکان لیتا ہے کہ دوسرے کے منہ سے جو کچھ نکلے اس کو رد ہی کرنا چاہیے اگرچہ وہ حق بات ہی ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)

کانپور میں ایک مرتبہ میں نے ایک مسئلہ بیان کیا ایک طالب علم بولے کہ تمہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے یہ س طرح کہاں دیکھا کہنے لگے ہدایہ میں لکھا ہے۔ میں نے ہدایہ ان کے سامنے رکھ دیا کہ لو اس میں زکا لو اس میں ہر چند تلاش کیا مگر وہ مسئلہ نہ تھا تو اب بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کریں کہتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ہدایہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ پھر اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں اور میرا یہ سوال پھر بھی موقع کا تھا کیونکہ آدمیت اس صورت کا نام نہیں بلکہ آدمیت نفس ناطقہ اور روح انسانی پر موقوف ہے جو ایک مخفی امر ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں

گر بصورت آدمی انسان بدے

احمد و بوجہل ہم یکساں بدے

(اگر صورت کی وجہ سے آدمی انسان ہوتا تو احمد اور ابو جہل برابر ہوتے)

بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ ان کی صورت آدمی کی ہے لیکن روح سبع اور بہائم کی ہے۔ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد ہے اُولٰٓئِکَ کَا لَآ نَعَامٍ بَلْ هُوَ اَضَلُّ رِبِّہٖ لُوْکٌ مِّثْلُ جَانُوْرٍ کَہِیْنَ بَلْکَہِ اِن سَہِیْ بَد تَر ہِیْنَ)

مولانا فرماتے ہیں

اینکہ می بینی حنلاف آدم اند نیتند آدم غلاف آدم اند

(یہ جو آدمیوں کا اختلاف دیکھتے ہو یہ آدم نہیں یہ آدم کے غلاف ہیں)

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست

(بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان ہیں اس لئے ہر کس و ناکس کا اندھا ہو کر

مرید نہ ہونا چاہیے)

غلافِ آدم پر مجھے یاد آیا کہ حیدرآباد میں محرم کے زمانہ میں بعض لوگ شیر اور ریچھ بننتے ہیں یعنی شیر اور ریچھ کی کھال پہنکر لوگوں کو ڈراتے ہیں تو کیا اس سے وہ سچ مچ شیر ہو گئے ہرگز نہیں بلکہ ان کو غلافِ شیر کہا جائے گا۔ اسی طرح آدمی کی کھال بدن پر لگ جائے سے کسی کو آدمی نہیں کہا جاسکتا آدمیت کچھ اور ہی چیز ہے۔ دیکھئے اسی شیر میں اور غلافِ شیر میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ یہ نقلی شیر تو کتے سے بھی سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور حقیقی شیر کی یہ شان ہوتی ہے۔

گر جہاں پُربرف گر دسرسر بسر

تاب خور بگداز دش از یک نظر

راگر تمام عالم بھی برف سے پُر ہو جائے آفتاب کی تابش اس کو ایک نظر

سے پگھلا دیتی ہے )

واقعی اگر جنگل میں ایک شیر آکر دھڑو کے تو سارا جنگل کانپ جائے اور یہ نقلی شیر اس کی آواز ہی سنکر ہگ دے۔ یہی فرق ہے حقیقی انسان اور نقلی انسان میں۔ دیکھئے ابو جہل بھی کعبہ میں جاتا تھا جبکہ وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ تو جا کر سب بتوں کو سجدہ کرتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بار کعبہ میں داخل ہوئے تھے تو سارے بت سرنگوں ہو کر آپ کے قدموں میں آگرے۔ ایک وہ انسان تھا ایک آپ انسان تھے۔ پس حقیقت میں ابو جہل آدمی نہ تھا بلکہ غلافِ آدم تھا۔ اسی لئے میرا ان طالب علم سے یہ سوال ایک حد تک صحیح تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں ممکن ہے کہ آپ غلافِ آدم ہوں۔ باقی ان کا سوال محض ہٹ دھرمی تھا کیونکہ ہدایہ کا ہدایہ ہونا بتابق عبارت سے معلوم ہو سکتا تھا وہ اپنی ہدایہ لاکر اس ہدایہ کا مقابلہ کر سکتے تھے مگر صاحب ملا آن باشد کہ چپ نشود (ملا وہ ہے کہ چپ نہ ہو) ممکن ہے کہ تطابق عبارت کی صورت میں بھی وہ یہی کہتے کہ یہ ہدایہ نہیں کیونکہ وہ دونوں کی عبارت میں بھی اعتبار سے فرق نکال سکتے تھے کہ یہ نقوش اس حیثیت سے کہ میری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش ہیں اور اس حیثیت سے کہ دوسری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش نہیں ہیں کچھ اور ہوں گے جیسا کہ

ایک طالب علم نے اپنے بھائی کو گالی دی تھی ماں کی کسی نے کہا ظالم وہ تیری بھی تو ماں ہے۔ تو آپ نے کہا کہ صاحب اعتبار کا فرق ہے اس حیثیت سے کہ وہ میری ماں ہے مخدومہ مکرمہ ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کی ماں ہے ایسی ویسی ہے۔ تو بھائی یہ اعتبار کا فرق بڑے غضب کا ہے جس کی بابت مشہور ہے لَوْ لَا الْأَعْتَابُ لَبَطَلَّتْ الْحِكْمَةُ (اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حکمت باطل ہوتی) لیکن اگر وہ اعتبارات ایسے ہی اعتبارات ہیں تو یوں کہنا چاہیے لَوْ لَا الْأَعْتَابُ لَبَطَلَّتْ الْحَمَاقَةُ (اگر اعتبارات ہوتے تو حماقت باطل ہو جاتی) غرض ان طالب علم کے اس جواب سے سب کو معلوم ہو گیا کہ ان کو محض ضد اور اپنی بات کی تیج منظور ہے آجکل عموماً یہ حالت ہے کہ محض ایک دوسرے کی ضد میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہہ دیتے ہیں مثلاً دو عالموں میں مخالفت ہے تو اب وہ مخالفت دنیوی معاملات سے گذر کر مسائل شرعیہ تک پہنچتی ہے کہ جس مسئلہ میں ایک کا فتوے جواز کا ہوگا دوسرا اس کی ضد میں عدم جواز کا فتوے دے گا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس ضد کا

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

یہیں دہلی کا قصہ ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں علماء کی دو جماعتیں تھیں

ایک جماعت شیخ سدو کے بکرے کو حلال کہتی تھی اور ایک جماعت حرام بتلاتی تھی ایک مرتبہ دونوں جماعت کے لوگوں کو ایک شخص نے دعوت میں جمع کر لیا جب سب کے سامنے کھانا رکھ دیا گیا اور وہ کھانے کو تیار ہوئے تو اس نے کہا کہ ذرا تھوڑی دیر سب حضرات توقف فرمائیں مجھے کچھ کہنا ہے۔ سب نے ہاتھ روک لیا تو اس نے کہا کہ یہ جو گوشت آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے یہ شیخ سدو کے بکرے کا ہے اب جس کا جی چاہے کھائے جس کا جی چاہے نہ کھائے پس جو لوگ اس کو حرام سمجھتے تھے انہوں نے تو ہاتھ کھینچ لیا تھا شاید کہ جو لوگ اس کو

حلال کہتے تھے انھوں نے بھی ہاتھ روک لیا۔ داعی نے ان سے کہا کہ صاحب یہ حضرات اگر ہاتھ روکیں تو ان کو حق ہے کیونکہ یہ اس کو حرام سمجھتے ہیں مگر آپ نے کیوں ہاتھ روکا آپ کے نزدیک تو یہ حلال ہے۔ اس وقت وہ کہنے لگے کہ بھائی حق بات تو یہی ہے کہ یہ حرام ہے مگر ہم تو محض ان کی ضد میں اس کو حلال کہتے ہیں سو دیکھئے یہ ضد ایسی بری بلا ہے کہ اس میں انسان کیا کچھ کر گذرتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ وہ لوگ آجکل کے اختلاف کرنے والوں سے پھر بہت غنیمت تھے کہ انھوں نے حرام کو صرف زبان ہی سے حلال کیا پیٹ کے اندر اس کو داخل نہیں کیا گویا انھوں نے زبان سے نکالا اندر داخل نہیں کیا۔ نیز موقع پر اپنی غلطی کا اقرار بھی کر لیا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے محض ضد میں کہتے تھے اور آجکل اگر کوئی مولوی کسی کی ضد میں حرام کو حلال کہتا ہو اور اس کو ایسا موقع پیش آجائے جیسا ان صاحبوں کو پیش آیا تھا تو آجکل کے ضدی مولوی کبھی اس کا اقرار نہ کریں گے کہ ہم محض ضد میں اس کو حلال کہتے تھے اور واقع میں حق یہی ہے کہ حرام ہے۔ اور یقیناً سب کے سامنے اپنی بات کی لاج رکھنے کو طوعاً و کرہاً اس کو کھا بھی جائیں گے گو دل نہ مانتا ہو اندر سے جی متلاتا ہو، طبیعت اس کو پھینکتا چاہتی ہو مگر یہ اپنی بات کے پکے بری بھلی طرح اس کو ضرور ننگل ہی جائیں گے۔ الغرض امامِ حنا کے صاحبزادے کو صورت یکساں ہونے کی وجہ سے شبہ ہو گیا کیونکہ جدال بالحق و جدال بالباطل دونوں کی صورت یکساں ہی تھی اور جس طرح جدال کا اطلاق جدال بالحق پر کبھی ہو جاتا ہے اسی طرح مرار کا اطلاق بھی مرار بالحق پر کبھی ہو جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔ **وَلَا تُبَارِكُ فِيهِمْ وَلَا مَوْلًا لَهُمْ ظَاهِرًا** (سورہ اہزاب کے بارہ میں سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے) اس میں مرار بالحق ہی مراد ہے کیونکہ مرار بالباطل کی اجازت کسی درجہ میں نہیں ہو سکتی اور اس آیت میں مرار ظاہر کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنی ہے تو اس کو صورت مرار کہدیا گیا بوجہ مشاکلتہ کے ورنہ حقیقی مرار حرام ہے۔ حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے چنانچہ ارشاد ہے

مَنْ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَلِيَ إِخْوَهُ مَجْهَدٌ حَدِيثُ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ بَعِينَةٌ  
کم یاد رہتے ہیں اسی طرح حوالہ بھی یاد نہیں رہا کرتا کہ یہ کس کتاب کی حدیث ہے۔ اہل  
علم اس کی تحقیق کر لیں مجھے حدیث کا مضمون یاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علم کو  
اس لئے حاصل کئے تاکہ اس کے ذریعہ سے علماء کا مقابلہ کرے اور جاہلوں سے  
جھگڑا کرے اور لوگوں کا رخ اپنی طرف پھیرے خدا تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل  
کریں گے تو دیکھئے مراء پر کس قدر شدید وعید ہے مگر افسوس کہ آج کل تحصیل علم سے  
زیادہ غرض وہی ہوتی ہے جس سے حدیث میں ممانعت وارد ہو رہی ہے بلکہ آج کل  
تو عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کی تحصیل علم سے کوئی بھی غرض نہیں ہوتی نہ حسن نہ  
مذموم۔ اب تک تو ہم یہ سنا کرتے تھے کہ افعال اختیار یہ بدون تصور غایت و  
غرض کے موجود نہیں ہو سکتے۔ مگر آج کل کے طلبہ کی حالت دیکھ کر اس مسئلہ میں ہم  
کو شبہ ہو گیا اور جن کی کچھ غرض ہوتی بھی ہے تو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی غرض  
محض رضائے الہی ہو بلکہ اکثر کو جاہ مطلوب ہوتی ہے کیونکہ بہت لوگ علم دین پرست  
ہیں مگر اپنی اصلاح نہیں کرتے اگر رضائے الہی ان کو مطلوب ہوتی تو عمل کا اہتمام

لو قلت وفي ترغيب الترهيب المنذرى ص ۲۹، ۳۰ ما نصه وروى عن كعب بن مالك قال  
سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من طلب العلم ليجارى به السفهاء او ليجارى  
به السفهاء ويصرا به وجوه الناس ليه ادخله الله النار۔ رواه الترمذى واللفظله و  
ابن ابى الدنيا في كتاب الصمت وغيره والحاكم شاهد او البيهقى وقال الترمذى حدیث غریب  
وعن جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تعلموا العلم للنبا هو ابه العلماء ولا تماروا به  
السفهاء ولا تحيروا به المجالس فمن فعل ذلك فالنار والنار رواه ابن ماجه وابن حبان  
في صحيحه والبيهقى كلهم من رواية يحيى بن ايوب انفاقى عن ابن جريه عن ابى الزبير  
عنه و يحيى هذا ثقة احمته به الشيخان وغيرهما ولا يلتفت الى  
من نثذ فيه الخ والله اعلم ۱۲ جامع

ضرور ہوتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگوں کا مشغلہ تحصیل علم کے بعد جھگڑنا ہی رہ جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرار بار ہی کے واسطے علم حاصل کرتے تھے بس آجکل اسی میں فخر و ناموری سمجھتے ہیں کہ اس سے مقابلہ بحث کر لی اس سے جھگڑنے کے کچھ جاہل ان کی طرف ہو گئے پھر علاوہ ناموری کے اس صورت میں آمدنی بھی نہ زیادہ ہوتی ہے اور جب ان دونوں جھگڑنے والوں میں فیصلہ نہیں ہوتا تو علماء محققین کے پاس سوالات جاتے ہیں اور خواہ مخواہ ان کو بھی اس جھگڑے میں پھانسا جاتا ہے اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے احتیاط کرے اور جھگڑے سے بچتا چاہے تو اس کے پاس سے ملتے نہیں اس کے سر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ میں مفتی سعد اللہ صاحب و مولوی سراج الدین صاحب میں لفظ اُخیر کی بابت اختلاف ہوا کہ فصیح اُخیر (بکسر الہمزہ) ہے یا اُخیر (بضم الہمزہ) ایک کسرہ فصیح کہتے تھے ایک ضمہ کو مگر فیصلہ نہ ہوتا تھا بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس اختلاف میں پرٹنے سے تم کو کتنی رکعتوں کا ثواب ملا ایک فضول بحث میں وقت ضائع کیا اور فریقین نے دوسرے علماء سے استفعتے کئے مولوی سراج الدین صاحب نے جو کہ بہت ہی ذکی ہیں مفتی محمد یوسف صاحب کی خدمت میں بھی سوال بھیجا انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں جس کا جواب دیا جائے فضول بحث ہے تو مولوی سراج احمد صاحب بولے کہ اس کو دین بنانا کیا مشکل ہے آپ نے فوراً ایک صورت اپنے ذہن سے گھڑی اور اس طرح استفطار لکھا کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی بی بی سے کہا کہ اگر آج صبح سے شام تک تو نے کوئی لفظ غیر فصیح بولا تو تجھ پر تین طلاق۔ اس عورت نے لفظ اُخیر بولا تو اس پر طلاق ہوئی یا نہیں۔ پھر یہ استفعا مفتی صاحب کے پاس بھیجا گیا وہ بے چارے یہ سوال دیکھ کر مجبور ہو گئے اور ان کو اپنی تحقیق لکھنی پڑی یہ بھی اس لئے کہ شاید مفتی صاحب اس سوال سے پریشان ہو گئے ورنہ آزاد محقق اُس کا بھی جواب دے سکتا تھا وہ یہ کہتا کہ میں صاحب واقعہ کو جواب دوں گا تم کو جواب نہ دوں گا یا یہ کہتا کہ جواب دینا فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں جاؤ میں تم کو جواب نہ دوں گا۔



کسی اور سے پوچھو مگر ایسے جواب کے لئے کسی قدر ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے جواب دینے والے کو لوگ جاہل اور بد مزاج کج اخلاق مشہور کریں گے تو جس میں اتنی ہمت ہو کہ اگر کوئی اسکو جاہل وغیرہ کہدے تو برا نہ مانے وہ شخص ایسا جواب دے سکتا ہے مگر ایسی ہمت والے کم ہیں خصوصاً آجکل تو یہ حالت ہے کہ علماء سوال کرنے والوں سے ڈرتے ہیں ان کو یہودہ سوال سے روک نہیں سکتے کہ اگر روکیں گے تو یہ ہم کو بد نام کریں گے یا مدرسہ کا چندہ بند کر دیں گے اس لئے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں حالانکہ بعض لوگ محض تعنت کی راہ سے سوال کرتے ہیں۔ ان کا مقصود حق بات کا معلوم کرنا نہیں ہوتا بلکہ عجیب کو پریشان کرنا ہوتا ہے ایسے شخص کو تو جواب دینا شاید جائز بھی نہ ہو کیونکہ ایسا سوال گناہ ہے اور عجیب اس کی اعانت فی السؤال کر رہا ہے کیونکہ اس کے جواب دینے سے سائل کو آئندہ کے لئے سوال کی جرأت بڑھتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بھیک مانگنے والے جنکو بھیک مانگنا حرام ہو ان کو دینا بھی حرام ہے کیونکہ ان کو سوال کرنا ہی حرام ہے اور دینے سے سوال کی اعانت ہوتی ہے اور اعانت موصیت بھی داخل موصیت ہے پس ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دینا چاہئے اگر وہ یہ کہے کہ تم کو جواب معلوم ہی نہیں تو کہدو اچھا، تم تو جاہل ہیں پھر تم ہم سے کیوں سوال کرتے ہو اور اگر کوئی یہ کہے کہ تم کو تو جواب معلوم ہے پھر کیوں نہیں بیان کر دیتے اس سے کہدو کہ ہاں معلوم ہے مگر تجھ کو نہ بتلا دیں گے۔

بامدعی مگو بیدا سرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

مدعی سے اسرار عشق و مستی کو بیان نہ کرو اس کو رنج اور خود پرستی میں منے دو) غضب تو یہ ہے کہ آجکل ہر سوال کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے گو جواب معلوم بھی نہ ہو تو گھڑ مرٹھ کر جواب لکھتے ہیں محض اس لئے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں شخص کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں۔ اَسْتَغْفِرُ اللہَ الْعَظِيمَ۔

حالانکہ کسی بات کا جواب معلوم نہ ہونا کوئی عجیب نہیں کیونکہ علم محیط تو حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مڑے مڑے عالم بلکہ امام اور مجتہد کو بھی کہیں کہیں کا اذری کہتا پڑتا ہے۔ (مجھے معلوم نہیں)

کسی امام کی (یعنی مالک رحمہ اللہ کی حکایت ہے کہ ان سے ایک مجلس میں چالیس سوالات کئے گئے تو انھوں نے صرف چار کا جواب دیا باقی سبکی نسبت یہی فرماتے رہے لَا أُدْرِي لَا أُدْرِي یعنی مجھے معلوم نہیں۔ پس نہ معلوم ہونے کی صورت میں خواہ مخواہ درپے جواب کے ہونا تو مذموم ہے ہی میرے نزدیک تو اگر جواب معلوم بھی ہو تو متعنت کے سامنے بیان نہ کرے اس سے تو انکار ہی کر دے۔ اور یوں کہدے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں فتراز ورنہ در مجلس زنداں خیرے نیست کہ نیست  
مصلحت نہیں ہے کہ راز کو ظاہر کیا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ نہ معلوم ہو)

الغرض جواب دینے والے کو سائل کا تابع نہ ہونا چاہیے بلکہ سائل کو اپنا تابع بنانا چاہیے اور اگر وہ تابع نہ رہے تو اس کو جواب ہی نہ دے پس اگر یہ معلوم ہو کہ سائل منصف ہے اور طالب حق ہے اس کو ضرور جواب دے بلکہ اپنے کاموں کا خرچ کئے بھی اس کو جواب دینا چاہیے اور اگر متعنت ہے اس کو ہرگز جواب نہ دے۔ ایسے شخص کو جواب دینے کو طبیعت بھی نہیں چاہتی اور منصف کو جواب دینے کے لئے طبیعت میں خود بخود تقاضا ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے حقیقت واضح کر دی جائے۔ مولانا عبدالقیوم صاحب کی عادت تھی کہ فضول سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ اور محققین نے ہمیشہ اس کا لحاظ کیا ہے کہ وقت کو فضول ضائع نہ کیا جائے اول تو ان کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کوئی مسئلہ ان سے پوچھتا تو اپنی طرف سے فتوے کبھی نہ دیتے تھے بلکہ کتاب کا نام لیکر فرمایا کرتے کہ درمختار یا ہدایہ وغیرہ میں یوں لکھا ہے۔ یہ تو آپ کی غایت احتیاط کا نمونہ ہے اور اگر کوئی شخص فقہی مسئلہ معلوم کرنے کے بعد یہ سوال کرتا کہ یہ مسئلہ کسی حدیث میں بھی ہے یا نہیں تو آپ فرمادیتے کہ میں تو مسلم نہیں ہوں خدا کا شکر ہے کہ میرے آباؤ اجداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مسلمان چلے آ رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

صہرہ سے اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

جو کچھ کیا اس کو ان حضرات نے یاد رکھا جو اس زمانہ میں موجود تھے پھر جو کچھ ان کو کرتے ہوئے دیکھا اس پر ان کی اولاد نے عمل کیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ دین مجتہد تک پہنچا ہے اس لئے مجھے حدیث کی ضرورت نہیں حدیث کی احتیاج صرف نو مسلم لوگوں کو ہے جن کے آبا و اجداد نے اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اپنے باپ دادوں کے ذریعہ سے معلوم نہیں ہوا اس لئے احادیث کے ذریعہ سے معلوم کرنے کی ان کو ضرورت ہے مولانا عبد القیوم صاحب کے اس جواب کا منشا صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ سائل کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ تیرا یہ سوال فضول ہے کیونکہ اگر ہم نے تجھے یہ بتلا بھی دیا کہ فلاں حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہے تو تجھ کو وجہ دلالت کیونکہ معلوم ہوگی اب اگر ہم وجہ دلالت بھی بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے مقدمات اور مبادی تم کو اسی وقت پڑھاویں اور اگر وجہ دلالت میں تم ہماری تقلید کرو گے کہ چونکہ مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہے اس لئے مانتا ہوں تو پھر تم پہلے ہی سے ہماری تقلید کیوں نہیں کرتے کہ یہ مسئلہ شریعت میں اسی طرح ہے جس طرح مولوی صاحب نے بتلایا ہاں جو شخص وجہ دلالت کو سمجھ سکتا ہو یعنی طالب علم ہو جو مقدمات اور علوم مبادی سے واقف ہو چکا ہو اس کو اس سوال کا حق ہے اس کے سامنے دلائل حدیثیہ بیان کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ باقی جاہلوں کے سامنے یہ علوم بیان کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔

حضرت حاجی صاحب؟ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم کو تنگ کرے اور کسی مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کرنی چاہے تو سب رطب دیا بس بنہات و جواب اس کے سامنے رکھ دو اور کہہ دو کہ ان میں سے تم خود انتخاب کر لو۔ مجھے انتخاب اور ترجیح کی ہمت نہیں مجھے اور بھی کام کرنا ہے جس کے واسطے میں پیدا ہوا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کی ایک مثال بھی ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے جس کے کچھ بال سفید کچھ سیاہ تھے حجام سے کہا کہ میری دائرہ میں سے سفید سفید بال چھانٹ دے اس نے

استزہ لے کر سارے بال موٹا اور سب کو سامنے رکھ کر کہا کہ اس میں سے سفید سفید چھٹا لیجئے مجھے فرصت نہیں۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کے ارشاد پر عمل کرنا اسی شخص کو آسان ہے جو ننگ و ناموس کو آگ لگا چکا ہو کیونکہ ایسے جو اب سے عجیب کی وقعت نہیں ہوتی لوگ اس کو جاہل یا بد مزاج مشہور کر دیتے ہیں۔ اسی لئے آجکل ایسے جو اب بہت کم لوگ دیتے ہیں اکثر تو جھک جھک میں مشغول ہو جاتے ہیں سلف کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ فضول وقت ضائع نہ کیا جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے ایک معقولی صاحب آکر لیٹ گئے کہ میں آپ سے مناظرہ کروں گا مولانا نے فرمایا کہ مناظرہ سے دو مقصود ہوتے ہیں ایک اظہار حق یہ تو آجکل مفقود ہے دوسرے بڑا بننا اور اپنی شان علم جتلا نا آجکل زیادہ یہی مقصود ہوتا ہے تو اس کے لئے آپ کو مناظرہ کی ضرورت نہیں فضول کیوں مشقت میں پڑتے ہیں باواز بلند کہے دیتا ہوں کہ صاحبو! آپ مجھ سے زیادہ عالم ہیں میں جاہل ہوں مجھے کچھ نہیں آتا بس آپ کا مقصود حاصل ہو گیا۔ چنانچہ مولانا نے باواز بلند یہ مضمون فرما دیا اور وہ معقولی اپنا سامنے لیکر رہ گئے۔ سبحان اللہ! یہ حضرات کیسے بے نفس تھے اپنے آپ کو بالکل مٹائے ہوئے تھے۔ حضرت استاذ علیہ الرحمہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی عادت تھی کہ درس میں اگر کسی طالب علم نے آپ کی تقریر پر اعتراض کیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ مجھ سے تقریر میں غلطی ہوئی ہے تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے تھے پھر ایک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بار بار فرماتے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی یہاں تک کہ اعتراض کرنے والا شرما شرما جاتا تھا اور بعض دفعہ جب کسی مضمون میں پڑھاتے ہوئے مشرح صدر نہ ہوتا تو صاف فرما دیتے کہ مجھے اس مقام پر مشرح صدر نہیں ہوا پھر اسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ عین درس میں طلبہ کے سامنے کتاب اٹھا کر اپنے ماتحت مدرسین میں سے کسی کے پاس پہنچ جاتے اور بے تکلف فرما دیتے کہ مولانا مجھے اس مقام پر مشرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرما دیجئے انہوں نے تقریر کر دی تو پھر اپنے حلقہ درس

میں انہی صاحب کا نام لے کر فرماتے کہ مولانا نے اس مقام کی یہ تقریر کی ہے۔  
حقیقت میں ایسا بے نفس ہونا بڑا مشکل ہے آج کل لوگ اس کو ذلت سمجھتے ہیں  
مگر وہ اللہ عزت تو اضع ہو میں ہے چنانچہ حدیث میں ہے *مَنْ جَاءَنَا بِشَيْءٍ مِنْ دِينِ اللَّهِ فَذَرْنَاهُ*  
(جو شخص اللہ کے لئے تو اضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفع عطا فرماتے ہیں)  
آخر ان حضرات نے جیسا بے نفسی اختیار کر رکھی تھی کیا اس سے ان کی جاہ و عزت  
میں کچھ کمی آئی؟ بخدا پہلے سے زیادہ عزت ہو گئی کہ آج ان کی یہ باتیں کمالات اور  
کرامات میں شمار ہو رہی ہیں۔ لیکن طلبہ کے ساتھ یہ برتاؤ اسی وقت تک ہونا چاہیے  
جبکہ سوال صحیح ہو اور اگر بیڈھنگا سوال ہو جسکے طرز سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مندرجہ اعتراض  
اور پریشان کرتا ہے تو اول اس کو حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ  
کی طرح الزامی جواب سے خاموش کر دو۔ مولانا اگر الزامی جواب میں بہت ملکہ تھا مگر  
وہ ایسوں ہی کے واسطے ہوتا تھا جن کا مقصود محض اعتراض ہریتا اور جو لوگ  
تحقیق کے طالب معلوم ہوتے ان کے سامنے تحقیقی جوابات بھی خوب بیان فرماتے  
تھے۔ مولانا میں ظرافت بھی بہت تھی جب طالب علم الزامی جواب سے سکت  
ہو جاتا تو فرما دیا کرتے تھے کہ تالاب پاس ہے (یعنی اس میں جا کر ڈوب مرو)  
اور اگر کوئی شخص اس سے بھی باز نہ آوے تو اس کو جواب ہی نہ دو۔

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نر ہی

آنست جوابش کہ جوابش ندھی

(جو شخص قرآن اور حدیث کے جواب کو تسلیم نہ کرے اس کا جواب یہ

ہے کہ اس کو جواب نہ دو)

اور اگر اس پر بھی متنبہ نہ ہو اور جواب کا تقاضا ہی کرتا رہے تو اس کو حلقہ درس سے  
نکال دو کیونکہ جس شخص کو اپنی بات کی پیروی کرنے کا مرض ہو وہ ہرگز پرٹھانے کے  
قابل نہیں اگر اس کے اس مرض کا علاج نہ کیا گیا اور اسی طرح سر آنکھوں پر بٹھالیا  
گیا تو اس میں ہمیشہ کے لئے یہ عادت پختہ ہو جائے گی کہ جو بات اس کے منہ سے

نکلے گی اس کی پیچ کیا کرے گا حق و ناحق کی ذرا پروا نہ کرے گا۔ اور اس کا دین پر جو بُرا اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

بد گہر را علم و فن آموختن دادن تیغ است دست را ہزن  
(نااہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

کلمتہ میں ایک عالم نے مسئلہ رضاع غلط لکھا اور علماء کے پاس اس کو دستخط کے واسطے بھیجا علماء نے بالاتفاق اس پر دستخط سے انکار کیا کہ یہ تو بالکل غلط مسئلہ ہے کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا آخر میں ان کو اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا تھا۔ مگر بات کی پیچ بری بلا ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ لکھ مارا اور اس میں داہی تباہی دلائل سے اپنے مطلب کو ثابت کرنا چاہا پھر وہ اپنے استاد کے پاس اُس فتوے کو لے گئے۔ اور ان سے جا کر کہا کہ اس مسئلہ میں سب لوگ مجھ سے علیحدہ ہیں کوئی میرے ساتھ نہیں آپ ہی میرا ساتھ دیدیجئے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی یہ تو غلط مسئلہ ہے۔ اس میں ساتھ کیونکر دوں۔ کہنے لگے کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ غلط ہے مگر اب تو زبان و قلم سے نکل گیا اب تو جس طرح ہو میری تائید کر دیجئے مگر استاد نے ساتھ نہیں دیا۔ افسوس دین کو کھیل بنا رکھا ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ایک بات زبان سے نکل گئی ہے اُس کی لکیر پیٹے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کا غلط ہونا معلوم ہے نہ معلوم ان لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کہاں جاتا رہا۔ اب سُنا ہے کہ اُن عالم مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا خدا معاف کرے۔ اگرچہ جرم بہت سنگین ہے میں تمام مدرسین و مہتممینِ مدارس سے بالتجاء عرض کرتا ہوں کہ لعل اللہ اس بات کا کچھ انتظام کیجئے کہ سب طلبہ کو ایک لاکھٹی نہ ہانکا جائے اور سب کی تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ جس شخص کے اخلاق خراب ہوں اول اس کے اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کیا جائے۔ بات بات پر اس کو ٹوکا جائے، اگر اصلاح کی امید نہ ہو تو مدرسے علیحدہ کیا جائے۔ اسی طرح جس طالب علم کی طبیعت میں کجی معلوم ہو سلامتی سے محروم ہو اس کو بھی ہرگز پورا نصاب نہ پڑھایا جائے کیونکہ تکمیل نصاب کے بعد وہ خود بھی

اور دوسرے لوگ بھی اس کو عالم و مقتدا سمجھیں گے اور ایسا شخص مقتدا ہو کر جو کچھ ستم ڈھائے گا ظاہر ہے پھر ان سب کا وبال ان مدرسین و مہتممین کے اوپر ہوگا کہ انہوں نے ایسے نااہلوں کو کیوں علم پڑھایا میری رائے میں ایسے لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب اردو میں یا فارسی میں یا کسی قدر عربی میں مقرر کر لیا جائے جو ضروری مسائل و احکام کے جاننے کے لئے کافی ہو وہ نصاب پڑھا کر ان سے کہہ دیا جائے کہ جاؤ دنیا کا کوئی کام سیکھو اور کماؤ کھاؤ مجھے حیرت ہے کہ بعض مدارس میں ایک ہزار بعض میں پانچ سو بعض میں سو دو سو طلبہ تعلیم پاتے ہیں کیا یہ لوگ سب کے سب مقتدا بننے کے اہل ہیں یقیناً نہیں اور ہرگز نہیں پھر اہل مدارس سب کو مقتدا کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ بخدا مسلمانوں پر زیادہ تیاہی ان نااہل مولویوں کی وجہ سے بھی آئی ہے کہ ان لوگوں نے دین کو کھیل بنا لیا ہے جیسا موقع دیکھا ویسا فتویٰ دیدیتے ہیں حتیٰ کہ عوام کہنے لگے کہ بس جی دین تو مولویوں کے ہاتھ میں ہے جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس کو چاہیں حرام اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انھوں نے علماء سے دریافت کرنا ہی چھوڑ دیا جس کے جو جی میں آیا کر لیا خواہ حلال ہو یا حرام پھر اس صورت میں قہر خداوندی نازل ہونا ہی تھا۔ اس لئے میں مکرر کہتا ہوں کہ اہل مدارس کو طلبہ کا انتخاب کرنا چاہیے اور ان میں جو اہل نظر آئیں انہی کو پوری تعلیم اور انہی کو سند فراغ دینی چاہیے مگر اب تو بلا یہ ہے کہ لوگوں کو انتساب کا شوق ہے کہ ہمارے یہاں سے اس سال اتنے آدمی فارغ ہوئے۔ اے صاحبو! طلبہ کا فارغ کرنا بہت عمدہ ہے مگر وہ پہلے اہل تو ہوں و اللہ کس قدر افسوس ہوتا ہے جب بعض فارغین کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے اعراب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے حالانکہ اس پر اعراب لگے ہوتے ہیں وہ ان کو دیکھ کر بھی غلطی کرتے ہیں اور کتابوں کے اعراب تو وہ کیا خاک صحیح پڑھیں گے بھلا ایسے نااہلوں کے فارغ کرنے سے کیا خوشی ہو سکتی ہے بجز اس کے کہ اپنے ذمہ خیانت کا وبال رہے اور کچھ نفع نہیں صاحبو! مجھ کو سحت اندیشہ ہے کہ علماء سے خصوصاً اہل مدارس سے کہیں اس کی باز پرس خدا تعالیٰ کے یہاں نہ ہو

اس کی اصلاح کی جلد فکر کیجئے۔ یہ مضمون بہت طویل ہو گیا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ طلبہ کے فضول سوالات کا جواب نہ دیتا چاہیے کیونکہ بعض طلبہ محض تنگ ہی کرنا چاہتے ہیں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے یہاں ایک شخص پڑھتے تھے ان کی عادت تھی اعتراض کرنے کی بہت تھی مگر ہمیشہ ایک دعوے کر دیا کرتے کہ یہ بات تو یوں نہیں یوں ہے اور جو بلا تائید دلیل پوچھتے تو آپ کہتے کہ کیا سارا کام میں ہی کروں دعویٰ میں نے کر دیا دلیل آپ بیان کر دیجئے سبحان اللہ کیا خوبصورت دعویٰ تھا جس کی دلیل دعویٰ اپنے ذمہ نہیں سمجھتے تھے غرض آجکل جدال بالباطل کا بہت چرچہ ہے۔ علماء و طلبہ میں سے کوئی بھی اس مرض سے خالی نہیں **إِلَّا مَنْ عَصِمَ اللَّهُ** (مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچائے) یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے قابل سبق لینے کے ہے اس میں حق تعالیٰ نے جدال بالباطل کی مذمت عجیب طرز سے بیان فرمائی ہے جس سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ** یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو مجادلہ کرتے ہیں اللہ کے بارے میں یعنی خدا کی ذات و صفات و احکام میں جن میں توحید اعلیٰ فرد ہے اور بقیہ احکام اس کے بعد ہیں سب میں جدال کرنا **جِدَالٌ فِي اللَّهِ** ہے گو درجات متفاوت ہیں اور جدال تو خون سی مذموم ہے پھر جدال **فِي اللَّهِ** تو سب سے زیادہ مذموم ہے آگے فرماتے ہیں **بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ** یعنی مجادلہ کرتے ہیں ذات و صفات و احکام الہی میں بدون علم کے اور ہدوں ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے اب یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ قیود و احتراز یہ نہیں ہیں کیونکہ جدال **فِي اللَّهِ** کی جو کہ مذموم ہی ہو گا دو قسمیں نہیں ہو سکتیں کہ ایک وہ جو علم و ہدایت اور کتاب کے ساتھ ہو دوسرے وہ جو ان کے بغیر ہو بلکہ جدال بالباطل جب ہو گا ان تینوں کے بغیر ہی ہو گا معلوم ہو گا کہ یہ قیود و اقعیہ ہیں مطلب یہ ہوا کہ جدال **فِي اللَّهِ** یعنی جدال بالباطل کا سبب ان ہدایت و کتاب منیر کا حاصل نہ ہونا ہے پھر اسی کی ساتھ ایک بات اس جگہ یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ علم سے مراد جس میں ہدایت و کتاب منیر بھی داخل ہے مطلق علم نہیں کیونکہ جدال بالباطل کے ساتھ



مطلق علم کا اجتماع تو ممکن اور مشاہد ہے بلکہ یہاں وہ علم مراد ہوتا چاہیے جو کہ جدالِ باطل کے ساتھ جمع نہ ہو سکے پس یہاں علم سے خاص علم یعنی علمِ صحیح و نافع مراد ہے۔ اب یہاں سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ علمِ صحیح و نافع کیسی قدر کی چیز ہے کہ جدالِ باطل اس کی ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور جو شخص علمِ صحیح و نافع سے محروم ہے وہ جدالِ باطلِ جدالِ فی اللہ میں جو کہ جدالِ باطل کا اعلیٰ فرد ہے پھینس جاتا ہے اور جدالِ باطل کا مذہب ہونا سب کو مسلم ہے تو جس چیز پر اس سے بچنا موقوف ہے اس کی ضرورت کا انکار نہیں ہو سکتا لہذا یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ علم نافع و علم صحیح کی سخت ضرورت ہے اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہو گئی کہ جب جدالِ باطل علم صحیح کیساتھ جمع نہیں ہو سکتا تو جو لوگ باوجود علم صحیح و ہدایت و کتابِ مینر کے حاصل کرنے کے پھر جدالِ باطل میں مبتلا رہتے ہیں یا تو انھوں نے ان تینوں کو سمجھ کر حاصل نہیں کیا یا اگر بوجھ کر حاصل کیا ہے تو جدال کے وقت جان بوجھ کر ان سے اعراض کر لیا ہے ورنہ اگر وہ ہر وقت ان تینوں پر نظر رکھتے اور پوری طرح عمل کرتے اور کسی وقت کسی مسئلہ میں ان سے اعراض نہ کرتے تو وہ ہرگز جدالِ باطل میں مبتلا نہ ہوتے خوب سمجھ لو جب علم کی ضرورت معلوم ہو گئی تو اب میرا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنا چاہیے اور اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز روزہ کی طرف توجہ ہے مگر علم نافع کی طرف توجہ نہیں اگر کوئی نماز نہ پڑھے روزہ نہ رکھے نہ کواۃ نہ دے حج نہ کرے تو سب لوگ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص علم دین بالکل حاصل نہ کرے تو اس کو بُرا کوئی نہیں کہتا، حالانکہ بقدر ضرورت علم حاصل کرنا ہر شخص کے ذمہ ویسا ہی فرض عین ہے جیسا کہ نماز روزہ وغیرہ میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ مولوی بن جاویں اور میرا یہ مطلب ہو کیونکہ نہ کر سکتا ہے۔ میں تو ابھی اہلِ مدارس کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ سب طلبہ کو مولوی نہ بنایا کریں تو جب میں سب طلبہ کا مولوی ہونا پسند نہیں کرتا تو عوام کا مولوی ہونا میں کیوں چاہوں گا۔ پس آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ آپ کو مولوی بننا پڑے گا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ مسائل و احکام شرعیہ کا علم بقدر ضرورت

اردو زبان ہی میں حاصل کر لیا جائے اور بچوں کو اہتمام کے ساتھ مکتب میں قرآن اور دینی رسائل پڑھنے کے لئے بھیجا جائے جب وہ بقدر ضرورت مسائل سے واقف ہو جائیں پھر تمہیں اختیار ہے جس کام میں چاہو لگاؤ اور جو رؤسار کے بچے ہیں جن کو خدانے مالی وسعت عطا فرمائی ہے ان کو چاہئے کہ علم دین کی پوری تعلیم دی جائے کیونکہ ان کو معاش کی فکر سے خدانے بچایا ہے تو اس کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہئے کہ یہ لوگ دین کی خدمت کریں اور اگر پوری تعلیم نہ دی جائے تو کم از کم قرآن اور اردو کے ضروری دینی رسائل تو ان کو ضرور پڑھا دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے مذہب سے تو کسی قدر واقف ہو جائیں اور جو لوگ اردو بھی نہ پڑھ سکیں جیسے گائوں کے کاشتکار وغیرہ ان کو چاہئے کہ علماء سے ملتے رہیں اور مسئلے پوچھتے رہیں اگر وہ روزانہ ایک مسئلہ بھی یاد کر لیا کریں تو سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے یاد ہو سکتے ہیں۔ رہ گئی عورتیں ان کو مرد تعلیم دیا کریں اور جو مرد پڑھے لکھے نہ ہوں وہ عورتوں سے کہہ دیا کریں کہ تم کو جو مسئلہ پوچھنا ہو ہم سے کہہ دیا کرو ہم علماء سے پوچھ کر تم کو بتلا دیں گے۔ لیجئے اس ترکیب سے ساری امت بقدر ضرورت علم سے فیضیاب ہو سکتی ہے۔ اور جو لوگ اردو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کو بھی علماء سے ملنے ملانے اور سوال کرنے کا عادی رہنا چاہئے کیونکہ بعضی بات کتاب سے حل نہیں ہوتی علماء سے زبانی دریافت کر کے اس کی حقیقت حل ہو جاتی ہے اور دین کے ساتھ تعلق و مناسبت تو بدون صحبت کے حاصل ہوتا ہی نہیں۔

صاحبو! آج کل علم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اول تو مخالفین اسلام جاہل مسلمانوں کو طرح طرح سے بہکاتے پھرتے ہیں پھر خود مسلمانوں میں بعضے فرقے ایسے موجود ہیں جو ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر واقع میں وہ اسلام سے دور ہیں اور بعضے کو مسلمان ہیں مگر گمراہ ہیں تو بعضے جاہل مسلمان ان گمراہ لوگوں کی باتوں کو اسلام کی باتیں سمجھنے لگتے ہیں اور دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جو جماعت اہل حق کی کہلاتی ہے ان میں بھی بعضے ایسے ہیں جنہوں نے دنیوی اغراض کو قبلہ و کعبہ

بنا رکھا ہے کہ جس کام کے ساتھ ان کی دنیوی غرض متعلق ہوئی اس کو انہوں نے دین کا لباس پہنا کر عوام کے سامنے ظاہر کر دیا اور جس چیز کی ممانعت سے ان کی اغراض میں خلل پڑتا ہو اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے اسی لئے وہ بہت سی باتوں کو جن کو پہلے جائز کہتے تھے آج حرام کہنے لگے اور جن باتوں کو ہمیشہ حرام و ناجائز کہتے تھے آج اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے۔ صاجو! یہ غرض وہ چیز ہے جس میں انسان دین سے اندھا بن جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بستو دیدہ شد  
چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار کے شناسد ظالم از مظلوم زرار  
جب غرض آجاتی تو ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے اور دل کی جانب سے سیکڑوں  
پر دے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں۔ جب قاضی دل میں رشوت لینے کی دل  
میں ٹھکان لیتا ہے تو ظالم اور مظلوم میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

یعنی جب قاضی کے دل میں رشوت کی طمع ہوگی اس سے صحیح فیصلہ کی امید بیکار بلکہ دورانہ کار ہے شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ پھر ایسے لوگوں کو تم اہل حق کیوں کہہ رہے ہو سو سن لیجئے کہ میں نے ان کو اہل حق عقائد کے لحاظ سے کہا ہے کہ ابھی تک شکر ہے ان کے عقائد صحیح ہیں اگرچہ اس غرض پرستی کے ساتھ عقائد کا بھی سخت اندیشہ ہے چنانچہ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ اہل حق کی جماعت کے بعض افراد ان اہل بدعت اور ملحدین کے ساتھ باہم بشیر و شکر ہو رہے ہیں جو ان کو کافر کہتے تھے اور یہ ان کو فاسق و فاجر کہتے ہیں پس حب فی اللہ و بغض فی اللہ کا اثر تو ابھی سے مرط چلا ہے آگے خدا حافظ ہے غرض اہل حق میں سے بعض ہم جیسے بھی ہیں جنہوں نے دین کو اغراض کے تابع کر رکھا ہے وہ صاف کہتے ہیں کہ آخر مصلحت وقت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں بعض علماء سے آجکل کہا گیا کہ عوام بعض امور میں شریعت کی حد سے بہت دور نکل گئے ہیں اس کی روک تھام ہونی چاہئے تو وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جو مشر و خروش میں ایسا بھی ہو جاتا ہے کچھ پروا نہیں اس وقت تو کام ہونے دو پھر بعد میں

مسائل کو بھی دیکھ لیا جائے گا لَتَأْتِيَهُ وَآتَاكَ لِيَدْرَاجِعُونَ اے صاحبو! آسمان نہیں پھٹ جاتا زمین شق نہیں ہو جاتی جب ایک عالم کی زبان سے یہ بیہودہ کلمات نکلتے ہیں افسوس مسلمان کی مصالحہ پر ایسی نظر بالخصوص ایک عالم کی نہایت شرم کی جگہ ہے مسلمان کو تو مصالحہ کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ

مصلحت دیدن آست کہ یاراں ہمہ کار  
بگذارند و خم طسره یارے گیرند

(یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی محبوب حقیقی ہو رہو) بس ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو راضی کر لو سب کام بن جائیں گے ذرا اس تدبیر کو اختیار کر کے تو دیکھو اسی میں وعدہ ہے مال و جاہ و عزت و شوکت وغیرہ حاصل ہونے کا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا

و وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور کئے انھوں نے اچھے کام کہ ضرور ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسے خلیفہ بنایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور ضرور تمکین دے گا ان کے لئے ان کے دین کو وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا اور ضرور ضرور بدلے میں دیگا ان کو بعد ان کے ڈرنے کے اور عبادت کریں گے وہ میری اور نہ شریک کریں گے وہ میرے ساتھ کسی چیز کو)

اس آیت میں استخلاف فی الارض کا وعدہ ایمان و اعمال صالحہ پر مرتب فرمایا ہے اور اس استخلاف کی غایت بھی تمکین دین و عبادت مع التوحید بیان فرمائی ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات ایمان و اعمال صالحہ و اتباع احکام ہے اس کے استحکام و حفاظت کے لئے سلطنت عطا فرمانے کا بھی وعدہ ہے پس یہ کس قدر افسوس کی بات ہے

کہ آجکل مقصود بالذات کوتاہ اور تابع کو متبوع بتایا جا رہا ہے۔ ایک دوسری جگہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وَأَقْدَ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ** (اور تحقیق ہم زبور میں نصیحت کے بعد کہہ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے) اس آیت میں عباد صالحین کے لئے وراثت ارض کا وعدہ ہے تو مسلمان کو ان آیات پر نظر کر کے احکام کا اتباع کرنا چاہیے اور تمام مصالِح کوتاہ احکام بنانا چاہیے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا گو کسی وقت ظہور وعدہ میں دیر ہو جائے تو اس سے گھبرانا نہ چاہیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تباہی کے لئے بددعا فرمائی تھی **رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَئَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا طَسَّ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَأَشْدُّدٌ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ**

(ترجمہ) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب (ہم کو یہ بات کشف اور وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گئی کہ) آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں دیئے اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہو چکی تو اب ان کے اموال و نفوس کو کیوں باقی رکھا جائے پس) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دیجئے اور ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کر دیجئے اس طرح کہ ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہو جاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہو کر) اس کو دیکھ لیں اس دعا کے بعد حق تعالیٰ کا فوراً یہ ارشاد ہوا **قَالَ اجْنِبْنِي دَعْوَتِكُمْ فَاسْتَقِيمُوا وَكَانَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ** اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی (موسیٰ و ہارون علیہما السلام) مراد ہیں کیونکہ حضرت ہارون اس

دعا برآمین کہہ رہے تھے اور آمین کہتا بھی دعائیں شریک ہوتا ہے) دعا قبول کر لی گئی سو تم (اپنے منصبی کام پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں پس باوجودیکہ دعا قبول ہو چکی تھی اور اس کی قبولیت کی اطلاع بھی فوراً دیدی گئی تھی مگر مورخین نے لکھا ہے کہ ظہور اس دعا کا چالیس سال کے بعد ہوا مفسرین نے وَلَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَخْلُمُونَ کی تفسیر میں لکھا ہے یعنی استعجال نہ کرنا یعنی جیسا کہ جاہل لوگ دعا کے اگلے ہی دن وحی کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ دیکھئے اگر آپ کسی طبیب کے پاس جائیں کہ مجھ کو مسہل کی ضرورت ہے مسہل دیدو تو یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ آج تم نے درخواست کی اور کل ہی دست آنے لگیں ہرگز نہیں بلکہ وہ اول منضج کا نسخہ لکھے گا مہینہ بھر اس کو پینا پڑے گا اس کے بعد دقت اور موسم کو دیکھ کر مسہل دیا جائے گا اور ہر مسہل کے بعد تبرید ہوگی پھر اگر مسہل میں کچھ کسر رہ گئی تو کوئی ملیں شربت مہینہ بھر پینا پڑے گا۔ غرض چار مہینہ کے بعد کہیں مسہل پورا ہوگا لوگ یوں چاہتے ہیں کہ صبح کو نسخہ پی کر شام ہی کو دست آجاویں سو بعضے طبیب ایسے بھی ہیں لیکن وہ آپ کو ایسا مسہل دیں گے کہ مادہ کے ساتھ روح کا بھی اخراج کر دے گا ایک جاہل طبیب نے ایک شخص کو مسہل دیا تھا نہ معلوم جما لگوٹہ دیدیا تھا یا کیا اس کو بچد دست آنے شروع ہوئے لوگوں نے طبیب صاحب سے آکر کہا کہ دست بہت آگئے اب بند کر دینے چاہئیں کہا نہیں ابھی اور آنے دو مادہ نکل رہا ہے کچھ دیر کے بعد لوگ پھر آئے کہ حکیم جی ضعف بہت ہو گیا دست بند ہی نہیں ہوتے کہا کچھ حرج نہیں مادہ فاسدہ نکل رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع دی کہ وہ تو مرنے کو ہو رہا ہے کہا نہیں جب مادہ نکل جائیگا خود اچھا ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ اسی میں مر گیا لوگوں نے حکیم صاحب سے کہا کہ وہ تو مر بچا گیا۔ تو آپ فرماتے ہیں اللہ کے مادے نکلنے میں تو یہ حال کیا کہ بارڈال اگر رہتا تو کیا حال ہوتا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ موت سے آگے کیا ہوتا۔ تو آج کل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو ایسا ہی مسہل دیا جائے۔ لیکن

محقق طبیب ایسا کبھی نہیں کر سکتا وہ ہر کام کو موقع اور وقت دیکھ کر کرے گا اگر تم اس سے یہ جا کر کہو کہ ہم نے کل نسخہ پیا تھا آج دست نہیں ہوئے تو وہ نسخہ لیکر پھاڑ ڈالے گا میری غرض اس مثال سے یہ ہے کہ بعض دفعہ تاخیر ظہور میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں اور حقیقت میں وہ تاخیر تمہارے ہی واسطے مصلحت ہوتی ہے مگر چونکہ ہم کو اپنی مصلحت کا بھی علم نہیں ہوتا اس لئے وہ تاخیر ناگوار ہوتی ہے پس جن مصالح کی وجہ سے تم احکام الہیہ کو پامال کر رہے وہ مصالح خود اتباع احکام پر موقوف ہیں۔ یاد رکھو مسلمانوں کو تو ہرگز اس طرح فلاح حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ احکام الہیہ کو مصالح کے تابع بنا دیں اور دنیوی اغراض کو قیلہ و کعبہ بنا لیں۔ باقی کفار کی حالت دیکھ کر تم کو دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ وہ خدا کو ناراض کر کے بھی ترقی کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ کفار خدا کے نزدیک حقیر ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے پیر کا جوتہ۔ اگر جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکا نہیں جاتا اور مسلمان خدا کے نزدیک محبوب ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹوپی کہ اس میں اگر ذرا سی بھی ناپاک چھینٹ پرٹ جاتی ہے تو اس کو فوراً سر سے اتار پھینکتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ آپ کو بھی تعمود باللہ جوتہ کی طرح بنا دیں کہ آپ برابر گندگی میں ملوث رہیں اور آپ کو اتار کر نہ پھینکا جائے۔ صاف جوا حق تعالیٰ آپ کو ٹوپی کی طرح معزز بنا چاہتے ہیں لیکن اس کی عزت یہی ہے کہ جہاں ذرا اس میں ناپاکی لگ جائے فوراً سر سے اتار دی جائے پس خوب سمجھ لو کہ ترک احکام کے ساتھ یا احکام کو اغراض و مصالح کا تابع بنا کر مسلمان کو کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر بالفرض حاصل بھی ہو جائے تو رضائے الہی تو ہرگز حاصل نہ ہوگی کہ خود فلاح سے بھی وہی مقصود ہے کیونکہ فلاح دنیوی بھی وہی محمود ہے جو معین ہو جاوے رضائے حق میں چنانچہ **الَّذِينَ إِذْ أَنْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ** رہے وہ لوگ ہیں اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دیں تو قائم کریں گے نماز کو اور زکوٰۃ دیں گے، خود اس پر شاہد بین ہے پس مسلمان کی اصل کامیابی رضائے حق ہے اور اس کی اصل

کوشش اس کی طلب ہے جس کا طریق اتباع احکام ہے خواہ دنیا میں کسی حال میں رہے اور اس حالت میں جو حفظ اور راحت مومن کو ہوتی ہے وہ سب کامیابیوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی بت پر حق تعالیٰ نے ایمان و اعمال کے ثمرات میں راہ حق پر ہونے کو بیان فرمایا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے  
 اُوْدُ لَعِبِكَ عَلٰی هُدٰى مِّنْ سَرِيْبِهِمْ وَاُوْدُ لَعِبِكَ هُوَ الْمَفْلِحُوْنَ (یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ صلاح اور نجات پانے والے ہیں)

یہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی جہاز میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں ایک جہاز دنیوی یعنی واقع فی الدنیا ہے عَلٰی هُدٰى مِّنْ سَرِيْبِهِمْ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں، دوسری جہاز اُخروی یعنی واقع فی الآخرة ہے وَاُوْدُ لَعِبِكَ هُوَ الْمَفْلِحُوْنَ (اور یہی لوگ صلاح اور نجات پانے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمان کے لئے جس اصلی جہاز کا وعدہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ پس ہدایت پر ہونا یہی بڑی رحمت اور راحت کی چیز ہے جس کا مشاہدہ مجھ کو ایک سفر میں اس طرح ہوا کہ ایک بار میں سہارنپور سے لکھنؤ جا رہا تھا اس لئے رڑکی جانے والی گاڑی میں سوار ہوا تو وہاں میرے ایک دوست بھی بیٹھے ہوئے ملے جو پورے جنٹلمین تھے جب گاڑی چھوٹ گئی تو آپس میں باتیں ہونے لگیں میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں۔ بولے کہ میری گاڑی جا رہی ہے اس وقت میں نے انہی کے محاورہ میں کہا کہ ممکن ہے آپ میری گاڑی جا رہے ہوں لیکن افسوس ہے یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے۔ وہ غلطی سے بجائے میری گاڑی کے اس میں بیٹھ گئے تھے۔ بس یہ سن کر ان کی یہ حالت ہوئی کہ چہرہ سے پریشانی ٹپکتی تھی، بات نہیں کر سکتے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بالکل بیک بینی و دوگوشش تھے۔ کیونکہ جنٹلمینوں میں یہ بھی مرض ہے کہ وہ سفر میں



نہ کپڑے ساتھ لیتے ہیں نہ پانی پینے کا برتن ساتھ لیتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب جو کہ ریاست بہاولپور میں کسی اسکول میں پروفیسر ہیں وہ فرماتے تھے کہ ایک بار میں بہاولپور سے وطن کو آ رہا تھا میری ساتھ ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس گاڑی میں ایک جنٹلمین سوار تھے وہ میرے برتنوں کو دیکھ کر ہنسنے لگے کہ یہ بھنگیوں کے سے برتن آپ کہاں سے ساتھ لائے۔ میں اس پر خاموش ہو رہا تھوڑی دیر میں ان صاحب کو پیاس لگی تو اسٹیشن پر گلاس لے کر اترے وہاں پانی نہ ملا اور کئی اسٹیشن تک نہ ملا تو اب ان کا مارے پیاس کے بُرا حال تھا بار بار کن انکھیوں سے میری صراحی کو تکتے تھے آخر مجھے رحم آیا اور میں تختہ پر آنکھیں بند کر کے سوتا بن کر لیٹ رہا تھوڑی دیر میں وہ صاحب آہستہ آہستہ صراحی کے پاس آئے اور اس چے مٹم لگا کر پانی پینا شروع کیا مگر حالت یہ کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور ایک آنکھ پانی کی طرف بڑی گھبراہٹ میں غریب نے پانی پیا میرے جی میں آیا کہ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لوں مگر میں نے خیال کیا کہ بے چارہ پیاسا ہے۔ جب پانی پنی چلے گا پھر سمجھوں گا چنانچہ جب وہ خوب پانی پنی چلے اور وہاں سے اٹھنے لگے تب میں نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن سے کیوں پانی پیا۔ بس اب تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور معافی چاہنے لگے۔ میں نے پھر تو ان کی بدتہذیبی خوب ظاہر کی کہ تم تہذیب کا دعویٰ محض جھوٹا کرتے ہو تم میں خاک تہذیب نہیں۔ میں کہتا رہا اور خاموش سنتے رہے۔

غرض کچھ سردی کا بھی خیال تھا مگر زیادہ پریشانی یہ تھی کہ بے راہ جا رہے تھے کہیں لاجول پڑھتے ہیں کہیں انا لٹریچر پڑھتے ہیں میں نے اُن سے کہا کہ میاں اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ یہ گاڑی ظاہراً رٹ کی سے پہلے تو ٹھہر نہیں سکتی خواہ تم کتنے ہی پریشان ہو اس لئے پریشانی بے فائدہ اطمینان سے

باتیں کرو میں تو ان کو باتوں میں رگنا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے جھنجلاتے تھے کہ واہ میاں تم کو ہنسی سو جھی ہے اور مجھے اپنی الجھن لگی ہوئی ہے اس حکایت سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں نے اس وقت اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ کیا تھا تو یہ ظاہر ہے کہ روڈ کی پہونچنے سے پہلے نہ میں لکھنؤ پہونچا تھا نہ ان کو میرٹھ جانا کچھ زیادہ دشوار ہو گیا تھا لیکن پھر میں اپنے آپ کو ایسا مطمئن پاتا تھا گویا کہ بادشاہ تھا کیونکہ مجھ کو اس خیال سے راحت تھی کہ میں راہ پر ہوں اور وہ ایسے پریشان تھے جیسے کوئی مجرم پنجرہ میں قید کر دیا جائے۔ ان کو اس خیال سے الجھن تھی کہ میں راہ پر نہیں ہوں۔ اسی طرح جو لوگ پیادہ سفر کرتے ہیں جب وہ راستہ بھولتے ہیں اس وقت کوئی ان کی پریشانی دیکھے کہ ایک قدم من بھر کا ہوتا ہے۔ چلتا دشوار ہو جاتا ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے کہ واقعی ہدایت پر ہونا بڑی رحمت ہے۔

خدا کی قسم جو شخص شریعت کے موافق چل رہا ہو وہ بادشاہ ہے گو ظاہر میں سلطنت نہ ہو اور جو شخص شریعت سے ہٹا ہوا ہو وہ پنجرہ میں مقید ہے گو ظاہر میں بادشاہ ہو مسلمان متبع شریعت کو چونکہ یقین ہے کہ میں سیدھے راستہ پر ہوں اس لئے اس کو ساری مصیبتیں سہل معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ چند دن کی مصیبتیں ہیں پھر ختم ہو جائیں گی۔ کفار کو یہ دولت نصیب نہیں کیونکہ ان کو اپنی نجات کا کسی صحیح دلیل سے یقین ہی نہیں۔ اور باطل کا خاصہ یہی ہے کہ اس سے اطمینان و سکون کبھی حاصل ہوتا ہی نہیں ہاں کوئی جہل مرکب میں مبتلا ہو تو اور بات ہے مگر اس کو بھی اہل حق کی برابر ہرگز اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مصائب کے وقت جس قدر استقلال اہل حق میں ہوتا ہے کسی جماعت میں نہیں ہوتا۔

صاحبو! راستہ تو یہ ہے کہ خدا کو راضی کرو احکام کا اتباع کرو۔  
 شریعت میں گڑبڑ نہ کرو ان شاء اللہ تعالیٰ پھر کسی کی مجال نہیں کہ  
 مسلمانوں کو نگاہ بھر کر بھی دیکھ سکے۔ باقی جو راستہ تم نے اختیار  
 کر رکھا ہے اس کی تو یہ حالت ہے۔

ترجمہ نرسی بکعبہ اے اعرابی

کیں رہ کہ تو میروئی ترکستانست

اے اعرابی مجھ کو اندیشہ ہے کہ تو کعبہ نہ پہنچے گا اس لئے

کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے ترکستان کا ہے

خدا کی قسم اگر ہم کو پاخانہ اٹھانا پڑے اور خدا ہم سے راضی ہو

تو وہی ہمارے لئے سلطنت ہے اور اگر خدا راضی نہ ہو تو لعنت ہے

ایسی سلطنت پر جو خدا کو ناراض کر کے حاصل کی جاوے۔ یاد رکھو سلطنت

کوئی تقرب الی اللہ کا سبب نہیں۔

بعض انبیاء علیہم السلام ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو ساری عمر

سلطنت نصیب نہیں ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ

صرف ایک ہی آدمی ہوگا اور بعض کی ساتھ ایک بھی نہ ہوگا تو کیا

سلطنت نہ ہونے سے ان انبیاء کے درجہ میں کوئی کمی آگئی اگر محض

سلطنت کوئی قرب کی چیز ہوتی تو فرعون بڑا مقرب ہونا چاہئے جس نے

چار سو برس تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی تھی۔

لَا تَنْفَعُكَ دَوْلَتُكَ وَلَا تَنْفَعُكَ رِجَالُكَ وَلَا تَنْفَعُكَ ثَرَاكَ وَلَا تَنْفَعُكَ دِينُكَ، واللہ اس نبی کے مرتبہ کے سامنے جن

کی ساتھ صرف ایک آدمی ہوگا یا ایک بھی نہ ہوگا سلطنت فرعون کی کچھ

بھی حقیقت نہیں اتباع احکام کی دولت کے سامنے سلطنت بھی

کوئی چیز ہے کہ اس کی مصلحت سے دین میں تصرف کیا جاوے

اور احکام کو مصالح ملکی کا تابع بنایا جاوے ہرگز نہیں۔

الغرض ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو بعضوں کو علم نہیں وہ تو  
جہالت کی وجہ سے گناہوں میں زیادہ مبتلا ہیں اور بعضوں کو علم حاصل  
ہے تو علم صحیح حاصل نہیں انہوں نے غلط باتوں کو دین سمجھ رکھا ہے  
اور جن کو علم صحیح بھی حاصل ہے انہوں نے اس کو اغراض و مصالح  
کے تابع بنا رکھا ہے۔

میں نے اسی سفر میں ایک پردیسی مولوی صاحب کو دیکھا ہے کہ  
پہلے ان کے لڑکے انگریزی پڑھتے تھے اول تو یہی ان کو زیبا نہ تھا کہ  
مولانا ہو کر اپنی اولاد کو انگریزی پڑھاویں لیکن خیر اگر انہوں نے یہ سمجھ کر  
کہ دنیوی ضرورتوں کے لئے اس کا پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ درستی دین  
کا اہتمام کر لیا جاوے اور اس کا اہتمام انہوں نے کر لیا ہوگا کیونکہ  
خود عالم تھے۔ تو اب سنتے قوم نے ان پر دباؤ ڈالا کہ انگریزی اسکولوں  
میں لڑکوں کو پڑھانا موالات میں داخل ہے اپنے لڑکوں کو اٹھاؤ  
آخر انہوں نے مجبور ہو کر لڑکوں کو وہاں سے اٹھالیا اور اپنے وطن  
بچوں کو بھیجا اور وہاں بھی ان کو انگریزی ہی پڑھائی۔ بھلا ان سے  
کوئی یوچھے کہ اگر تم نے لڑکوں کو اسکول سے اس لئے اٹھایا تھا کہ انگریزی  
پڑھنا پڑھانا حرام ہے تو پھر تین سو کمرس پر ان کو بھیج کر انگریزی  
ہی کیوں پڑھائی اور اگر تمہارے نزدیک انگریزی پڑھانا جائز  
تھا تو پھر محض قوم کے کہنے سے ایک جائز کام کو ترک کرنا اولوگوں کی  
خوشامد کے لئے ان سے دبتا یہ کب مناسب تھا بھلا خدا کا طالب  
ہو کر مخلوق کی رضا جوئی کرے اور خوشامد کر کے ان سے دبے طالب  
کی یہ شان نہیں ہو کرتی واللہ اہل علم کا تو یہ حال ہونا چاہیے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگون باشی

بے ز رو گنج بصد حمتت قاروں باشی

(توجہ) اسے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب و عشق الہی سے تو مست

ر ہے بغیر سونے چاندی کے خزانوں کے تو دولت مند بن جائے گا)

ان کو اپنی فقیری میں مست رہنا چاہیے اور کسی مالدار یا رئیس سے دین کے معاملہ میں طمع یا ملامت کی وجہ سے نہ دبتا چاہیے اور اگر کوئی بُرا بھلا کہے تو کہنے دو اس کی ہرگز پروا نہ کرو خدا کے طالب ہو کر کسی کی ملامت و طعنہ کی پروا نہ ہونی چاہیے۔ ہاں اگر کسی جگہ خوف کی صورت ہو تو شریعت سے استفتاء کرو اگر وہ موقع خوف میں درجہ اکراہ سمجھ کر تم کو معذور سمجھے تو دینے کا بھی مضائقہ نہیں لیکن طمع اور حرص اور خوف زوال منفعت کی وجہ سے دبتا ہرگز نہ چاہیے اس میں علاوہ ذلت عند اللہ کے لوگوں میں بھی عزت نہیں ہوتی۔ حسد کی قسم جن عوام کی یہ پروا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہماری ساتھ لگے پسٹے رہیں ہم کو چھوڑ کر الگ نہ ہو جاویں اول یہ لوگ انہی کی نظروں سے گرتے ہیں کیونکہ حرص و طمع چھپی بہتی اور حریص کی عزت لوگوں کی نظروں سے گر جاتی ہے۔

يَسُّرُ اِمَّا طَاعِعٌ حَيْرٌ الذَّلِيلُ تَكْسِبُهَا

الْقَدْرُ مَمْتَنَّتْ صَبَّ وَ الْقَدْرُ حَفُوضٌ

وہ کھانا بہت بُرا جس کو ذلت سے کمایا جاوے انجام کار یہ ہوگا کہ ہانڈی تو چسٹھی ہوئی ہوگی اور عزت گری ہوئی قدر کی مناسبت سے۔

ایک لطیفہ یاد آیا۔ لکھنؤ میں ایک کھانا پکتا ہے جس کو شب دیگ کہتے ہیں۔ ایک طالب علم نے اس کا ترجمہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ (بکسر القاف) (رات کی دیگ) کیا تھا۔ شب کا ترجمہ لیلہ اور دیگ کا ترجمہ قدر بس لیلۃ القدر بن گیا۔ خوب سوچھی۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ (شب قدر) تو سنا کرتے تھے۔ اس نے لَيْلَةُ الْقَدْرِ بھی ایجاد کر دی۔ خیر یہ تو ایک

لطیفہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر حال میں احکامِ شرعیہ کو اپنا رہنما بنانا چاہیے خواہ مالِ بے یارے یا نہ بے، جاہ حاصل ہو یا نہ ہو طعنے سننے پر نہیں یا تعریف۔ کسی بات کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ کسی کے بُرا کہنے سے انسان بُرا نہیں ہو جاتا اور کسی کے بھلا کہنے سے اچھا نہیں ہو جاتا یاد رکھو اگر تم خدا کے نزدیک اچھے ہو تو چاہے ساری مخلوق تم کو کافر و فاسق و زندیق کہے کچھ اندیشہ کی بات نہیں اور اگر خدا کے نزدیک مردود ہو تو چاہے ساری دنیا تم کو غوث و قطب کہے اس سے کچھ بھی نفع نہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اہل حق کو اگر آج بُرا کہا جائے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن پھر ان کو اچھا کہا جائے گا اور اہل باطل کی اگر آج مدح ہوگی تو کسی دن ان کی فتلی ضرور کھلے گی اور ان کے معتقدیں ہی ان کو بُرا بھلا کہیں گے۔

شیخ ابن عربی کو ان کے زمانہ میں بہت لوگوں نے کافر و زندیق کہا حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی قبر پر ساہا سال پاخانہ پڑتا رہا تو کیا جہلار کے ان افعال سے نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) شیخ کا درجہ گھٹ گیا ہرگز نہیں تو اگر آج تم کو بھی لوگ بُرا بھلا کہنے لگیں تو کیوں ڈرتے ہو پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ شیخ ابن عربی امام اور شیخ اور صدیق کہلانے لگے اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔ حضرت شیخ نے اس کی نسبت پیشین گوئی بھی فرمائی تھی اِذَا دَخَلَ السَّيْنُ فِي السَّيْنِ ظَهَرَ الْمَيْمُ سَيْن سے مراد سلطان سلیم ہیں اور سَیْن سے مراد ملک شام ہے اور مَیْم سے مراد خود حضرت شیخ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب سلطان سلیم ملک شام میں داخل ہوں گے اس وقت نجی الدین بن عربی کا ظور ہوگا چنانچہ جب سلطان سلیم کا شام پر تسلط ہوا ہے اور شیخ کی قبر کا حال معلوم ہوا تو اس کو گندگیوں سے صاف کرایا۔ اور اس پر قبۂ تعمیر کیا

اس دن سے شیخ کی قبر زیارت گاہ خاص و عام بن گئی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کچھ معاملہ ہوا سب کو معلوم ہے۔ لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ ان کی کتاب احیاء العلوم کو جلایا گیا تو کیا اس سے ان کی وقعت کچھ کم ہو گئی ہرگز نہیں اس کے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ احیاء العلوم کو سونے کے پانی سے لکھوایا گیا اور آج امام غزالی کے نام کی جو وقعت ہے مخفی نہیں ہر شخص ان کو حجۃ الاسلام اور امام کے لقب سے یاد کرتا ہے اور وہ لوگ جو امام غزالی اور شیخ ابن عربی کو کافر و زندیق کہتے تھے جن کی وقعت اس زمانہ میں بہت کچھ تھی۔ خدا تعالیٰ نے آج ان کے ناموں کو ایسا مٹایا ہے کہ کوئی بھی ان کا نام نہیں لیتا۔

پھر اگر اتباع احکام کی وجہ سے لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ دیں اور تم کو سب کے سب برا بھلا کہنے لگیں تو اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے۔ بہت سے بہت جاہ زائل ہو جائے گی بدنام ہو جاؤ گے سو یہ کوئی نقصان نہیں بلکہ عین منفعت ہے۔ کیونکہ شہرت اور جاہ یہ وہ بلا ہے جو کہ دین و دنیا دونوں کو مضر ہے۔ دینی ضرر تو یہ ہے

۵ اشتہار خلق بند محکم است      بند ایں از بند آہن کے کم است  
خویش را رنجور سازد و زار زار      تا ترا بیرون کنند از اشتہار  
اینت گوید نے منم ابتاز تو      آنت گوید نے منم ہمہ از تو  
او چو بیند خلق را سرست خویش      از تکبر میرود از دست خویش

ترجمہ مخلوق کی شہرت اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کب کم ہے اپنے آپ کو رنجور اور کم نام رکھو تاکہ لوگ تم کو شہرت سے بازر کھیں۔ ایک کہہ رہا ہے میں آپ کا ہم راز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا

شریک حال ہوں وہ شخص بیچارہ جب ایک مخلوق کو اپنا  
سرپرست اور عاشق دیکھتا ہے پس تکبر کی وجہ سے ہاتھوں  
سے نیکل جاتا ہے۔

جب آدمی دیکھتا ہے کہ ساری دنیا مجھ پر فدا ہے تو اس میں  
عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے اپنے اوپر نظر کرنے لگتا ہے آخر کار  
اسی عجب و کبر کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے افسوس بہت لوگ  
اس ورطہ میں آکر ہلاک ہو گئے یہ تو دین کا ضرر ہوا۔ دنیا کا ضرر یہ  
ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ۵

خشمہا و چشمہا و رشکها

برسرت ریزد چو آب از مشکها

( غصے اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں

جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے )

یعنی مشہور آدمی کے حاسد بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس صاحب جاہ کو  
نہ دین کی راحت ہے نہ دنیا کی۔ اس کا دین کبھی خطرہ میں رہتا ہے اور  
دنیاوی خطروں کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ ہاں جب حق تعالیٰ کی طرف  
سے بدون تمہاری طلب کے جاہ عطا ہو وہ نعمت ہے اس میں دین کا  
خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ ادھر سے تمہاری حفاظت کی جاتی ہے ہاں بعض  
دفعہ امتحان کے طور پر دنیوی خطرات ایسے شخص کو بھی پیش آجاتے  
ہیں۔ لیکن جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے وہ خطرات سے گھبرا یا نہیں  
کرتا وہ سب کو خوشی کے ساتھ برداشت کر لیتا ہے۔

الغرض جاہ کا طالب ہونا بہت برا ہے اور طلب کے بعد جو جاہ  
حاصل ہوتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے  
پھر یہ ساری عزت و جاہ محض خیالی چیز ہے اس سے تم میں کیا کمال پیدا



ہو گیا۔ مر گئے تو کچھ بھی نہیں اب تم مخلوق کی نظر میں اچھے ہوئے  
تو کیا بُرے ہوئے تو کیا پس آج کل عموماً ایسا ہی علم لفظی و اسمی  
دیکھا جاتا ہے جو جاہ طلبی میں برباد کیا جاتا ہے حالانکہ واللہ اعلم  
وہ جو ہر ہے کہ اس میں خود ایسی لذت ہے جس کے سامنے سلطنت  
اور مال و دولت اور جاہ و عزت سب بیچ ہے مگر ایسا علم محض کتاب  
خوانی سے میسر نہیں ہوتا۔

در کتوز و ہدایہ نتوان یافت خدارا  
(محض کتوز و ہدایہ پر پڑھتے خدا تعالیٰ کو نہیں پاسکتے)

یہ علم تو اس طرح حاصل ہوگا کہ

قال را بگذار و مرد حال شو

پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو حال پیدا کرو اس حال کو پیدا کرنے کے لئے کسی

کامل مرد کی جوتیوں میں جا کر پامال ہو)

اگر یہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی کی جوتیوں میں جا کر پامال

ہو جاؤ اگر وہ سر پر جوتے بھی مارے تو خوش رہو پھر چند روز کے بعد

دیکھنا کہ تمہارے دل میں کیسا استغنا پیدا ہوتا ہے جو بادشاہوں کو بھی

نصیب نہ ہوا ہوگا۔ لیکن آج کل یہی بات تو نہیں رہی۔ مولوی اول تو اہل

کے سامنے جاتے نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم عالم ہو گئے اب ہم کو کسی کی

کیا ضرورت ہے اور اگر کبھی پیر کی تلاش کا خیال ہوگا اور کسی کے یہاں

جاویں گے تو ایسی جگہ تلاش کریں گے جہاں ان کی قدر ہو اور مشائخ

بھی علم کا ادب کر کے علماء کی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ اب یہ حضرت اس کے

منتظر ہوتے ہیں کہ پیر صاحب مجھے خلافت عطا فرمادیں پھر غضب یہ ہے

کہ بعض پیر بھی آج کل ایسے ہیں جو یہ سمجھ کر کہ یہ عالم ہم سے وابستہ ہیں گے

توان کی وجہ ہمارا سلسلہ بڑھے گا ایسوں کو خلافت بھی دیدیتے ہیں خوب یاد رکھو کہ ایسے طالب بھی خائن ہیں اور ایسے پیر بھی خائن ہیں بھلا اگر کسی مریض کو اپریشن کی ضرورت ہو اور ڈاکٹر اس خیال سے کہ یہ مریض مجھ سے خوش رہے گا تو زیادہ انعام دے گا بجائے اپریشن کے اس کے زخم پر مرہم لگا دے تو کیا وہ ڈاکٹر خائن نہیں۔ یقیناً اس نے خیانت کی اور بڑا اظلم کیا۔ پس اے وہ شیخ جو کہ مریدوں کے مکدر ہو جانے کے خوف سے ان کے امراض پر ان کو متنبہ نہیں کرتا خدا کے واسطے تو ان کے حال پر رحم کر اور اے وہ ڈاکٹر جو اپریشن کی جگہ مرہم لگا رہا ہے خدا کے لئے ایسا ظلم نہ کر ورنہ یاد رکھ کہ آج اگر یہ مریض تجھ سے خوش بھی ہو گیا تو کل کو جب یہ زخم ناسور بن جائے گا اس وقت یہ تیرے اوپر لعنت کریگا اسی طرح میں طالب سے کہتا ہوں کہ تجھ کو طبیب سے نشتروں پر صبر کرنا چاہیے جب ہی یہ ناسور اچھے ہو سکتے ہیں۔

نرم گوید گرم گوید خوش بگر

تارہائی یابی از نار سعیر

اس کی نرمی و گرمی کو خوشی سے برداشت کرو تاکہ تم دوزخ کی

آگ سے رہائی پاسکو

اور اگر یہ نہیں بلکہ تم ہر ڈانٹ پر غصے ہونے لگے تو اس طرح تمہاری صحت دشوار ہے۔ بھلا اگر کسی کے ناسور ہو اور وہ نشتر کے چبھانے پر طبیب سے خفا ہونے لگے تو اس شخص کی تندرستی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

وز بہر زخمے تو پر کیستہ شوی

پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

## ترجمہ

راگر ہرزخم پر کینہ ہوتے ہو یعنی مرشد کی ہر تبتیہ پر ناک بہوں  
چرٹھاتے ہو تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے  
مولانا نے اس مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں تفصیل سے  
بیان فرمایا ہے ۔

**حکایت** یہ ہے کہ ایک شخص ایک گودنے والے کے پاس  
گیا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنا دے۔ اس نے اپنا کام شروع  
کیا اور ایک جگہ سوئی کو لگایا اس نے آہ کی اور اس نے پوچھا  
کیا بتا رہے ہو کہا منہ بتا رہا ہوں کہنے لگا کہ یہ شیر کھا دے پیوگا  
تھوڑا ہی جو اس کو منہ کی ضرورت ہو بس منہ کو رہتے دو۔ اس نے  
دوسری جگہ سوئی کو کچ سے چھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا  
بتا رہے ہو کہا دم بتا رہا ہوں۔ کہنے لگا بعضے دم کٹے شیر بھی ہوتے  
ہیں دم کی ضرورت نہیں کچھ اور بناؤ اس کو رہتے دو۔ اس نے  
تیسری جگہ سوئی کو چھایا اس نے پھر آہ کی کہ اب کیا بتا رہے  
ہو آنکھیں بولا اس کو آنکھوں کی کیا ضرورت ہے کوئی دیکھتا  
تھوڑا ہی رہ گیا ہے اس کو بھی چھوڑو۔ اس نے چوتھی جگہ سوئی  
کو چھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بتا رہے ہو کہا شکم کہنے لگا  
اونہ اسے شکم کی کیا ضرورت ہے کچھ کھانا پیتا تھوڑا ہی ہے  
تو مصوّر نے جھلا کر سوئی پھینکی اور کہنے لگا

شیر بے گوش و سروا شکم کہ دید

این چنین شیرے خدا ہم نا فرید

شیر بے دم و سروا پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر

تو خدا نے بھی نہیں پیدا کیا

بندۂ خدا ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا جس کے نہ شکم ہو نہ  
مُسنم ہو نہ دم ہو نہ آنکھیں۔ جب تجھ کو سوئی کی تکلیف پر صبر نہیں  
تو شیر کی تصویر ہی کیوں بنواتا ہے جا اپنا کام کر ۵

چوں نداری طاقت سوزن زدن

بس تو از شیر زیاں کم دم بزن

(یعنی جب تم میں سوئی چبھنے کی طاقت نہیں ہے تو تم شیر ہونے

کا دعویٰ مت کرو۔)

صاحبو! اگر علم حقیقی اور علم نافع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا  
تو یہی راستہ ہے یہی طریقہ ہے نشتر اور زخم کھانے پڑیں گے یعنی اپنی  
طرف سے اس کے لئے بھی آمادہ ہونا پڑے گا۔ باقی اس کا میں تم کو اطمینان  
دلاتا ہوں کہ جب تم اپنی طرف سے ہر طرح کی ذلت اور رسوائی کے لئے  
آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر مشائخ کا ملین تم سے سختی کا برتاؤ نہ کریں گے  
یہ حضرات بہت رحمدل اور شفیق ہوتے ہیں۔ البتہ اگر تمہارے  
اندر عجب و کبر کا مادہ رہا تو پھر یہ ناسور تو اپریشن ہی سے اچھا  
ہوگا اس کا تو یہی راستہ ہے۔ اگر یہ راستہ پسند نہیں تو پھر تمہارا  
اس منزل میں آنا ایسا ہوگا جس کی بابت ارشاد ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِان تَا تَوَالِ بِيوتِ مَن ظَهَرَ هَا و لَكِن

الْبِرُّ مَن اتَّقَى وَا تَوَالِ بِيوتِ مَن ابْوَابَهَا۔

اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی

طرف سے آیا کرو لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے

بچے اور گھروں میں ان کے دروازہ سے آیا کرو)

ہر کام اصول سے اور انتظام ہی سے اچھا ہوتا ہے خلاف

اصول جو کام ہوگا خراب ہوگا۔

صاحبو! میں اس علم نافع کی ضرورت آپ کو بتلا رہا ہوں یہ وہ علم ہے جو خلوص سے حاصل ہوتا ہے اس کی کوشش کیجئے اور یاد رکھئے کہ احادیث و قرآن میں جہاں علم کی فضیلتیں مذکور ہیں وہاں یہی علم مراد ہے۔ جو خلوص کے ساتھ حاصل ہو اور جو علم طلب جاہ و غیرہ کے لئے ہو یا جو اغراض و مصالح کا تابع ہو وہ علم مراد نہیں۔ چنانچہ اس حدیث نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلے تین شخصوں کو بلا یا جائیگا اول شہید، پھر عالم، پھر سخی۔

شہید سے سوال ہوگا کہ تو نے ہمارے واسطے کیا کیا، وہ کہے گا الہی میں نے اپنی جان آپ کے واسطے فدا کر دی تھی۔ ارشاد ہوگا جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے جان اس واسطے دی تھی تاکہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا بہادر ہے۔ لَيْفَتَالِ اِنَّكَ بَحْرِيٌّ (تاکہ کہا جائے تو بڑا بہادر ہے، یعنی کیسی جان دی، عدالت میں کیسا اظہار دیا، بڑی جرات سے جواب دیا۔ نَقْلٌ قِيْلَ (تو بہادر کہا گیا) یعنی لوگوں میں بہت تعریف ہو چکی اور تمہارا مقصد پورا ہو چکا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو جہنم میں گھسیٹ کر ڈال دو۔

پھر عالم صاحب بلائے جائیں گے، اُن سے بھی یہی سوال ہوگا کہ تم نے ہمارے واسطے کیا کیا، وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو پڑھایا، فتوے دیئے، مسئلے بتلائے۔ ارشاد ہوگا جھوٹ۔ لولتے ہو بلکہ تم نے سب کچھ اس لئے کیا تھا تاکہ تم کو عالم کہا جائے فَقَدْ قِيْلَ (سو تم کو عالم کہا گیا) بہت لوگ آپ کو مولوی و مولانا کہہ چکے خوب تعریفیں ہو چکیں اور تمہارا مدعا حاصل ہو چکا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو بھی گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو۔

اسی طرح سخی کے بارے میں وارد ہے۔

صاحبو! ریا اور حپ جاہ سے بچو یہ بہت بُری بلا ہے۔  
اب میں علم کی اس تقسیم کی بابت جو اس آیت میں وارد ہوئی  
ہے کچھ عرض کر کے بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو کچھ خدا تعالیٰ نے  
میرے قلب میں ڈالا ہے میں وہ بیان کر دوں گا گو اس سے بھی اچھی  
توجیہ ممکن ہو جس کے پاس اس سے اچھی توجیہ ہو وہ اس کو  
پیش کر دے۔

میرے نزدیک اس آیت سے تمام علوم درسیہ کی ضرورت ثابت  
ہوتی ہے اس طرح کہ کتاب منیر سے تو مراد علم نقلی ہے کیونکہ کتاب  
میں اصلی نقلی ہی ہوتا ہے مگر مراد مطلق علم نقلی نہیں ہے بلکہ علم  
استدلالی مراد ہے۔ چنانچہ علم کے مقابلہ سے اس کی تعیین معلوم  
ہوتی ہے اور ہُدائی سے مراد علم عقلی ہے کیونکہ نقلی کا متبادل ہی  
کو مقتضی ہے۔ لیکن یہاں بھی علم استدلالی عقلی مراد ہے۔ مطلق عقلی  
مراد نہیں کیونکہ ہُدائی میں معنی دلالت کے ماخوذ ہیں اور استدلالی  
کی یہی شان ہوتی ہے اور اس سے پہلے فرمایا ہے بغیر علم  
علم کے بغیر اس سے علم ضروری مراد ہے کیونکہ اگر اس سے علم  
عقلی یا نقلی کسی مراد لیا جاوے تو تکرار لازم آئے گا اور اگر مطلق  
علم مراد لیا جاوے تو تقسیم کا مقسم بننا لازم آئے گا۔ شق اول غیر  
مناسب اور شق دوم ناجائز ہے اس لئے میرے نزدیک  
اس سے علم ضروری مراد ہے۔

پس یہاں علم کی یہ اقسام مذکور ہیں۔ علم ضروری و علم کسبی۔  
اور کسبی کی دو قسمیں استدلالی عقلی و استدلالی نقلی ایک مقدمہ  
تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اس کی ساتھ یہ ملایا جاوے کہ مقاصد کے

مقدمات بھی مقاصد کے حکم میں ہوتے ہیں لَٰكِنْ مُّقَدِّمَةٌ اَلْوَاجِبِ  
وَ اَجِبٌ (واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے)

اب تمام علوم درسیہ اس آیت میں داخل ہو گئے کیونکہ علوم  
درسیہ میں بعض علوم ضروریہ ہیں اور بعض استدلالی عقلی کی قسم  
سے ہیں اور بعض استدلالی نقلی میں داخل ہیں اور بعض علوم  
ان کے لئے مقدمات ہیں جیسے نحو و صرف و بلاغت وغیرہ۔  
اسی لئے میں اس وعظ کا نام

(تعظیم العلم مع تقسیم العلم)  
رکھتا ہوں

اگرچہ یہ نام طویل ہے مگر اس عنوان سے معنوں پر دلالت  
واضح ہے۔

خلاصہ بیان یہ ہے کہ علوم شرعیہ کی سحت ضرورت ہے اس کے  
حاصل کرنے کی کوشش کیجئے اگر تمام علوم درسیہ کی تحصیل دشوار  
ہو تو بقتدرہ ضرورت ہی حاصل کر لیجئے لیکن علم حاصل کرنے کے بعد  
بے فکر نہ ہو جانا کیونکہ مقصود محض علم ہی سے حاصل نہیں ہوتا  
ہاں یہ ضرور ہے کہ علم اس مقصود کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

اصل چیز کچھ اور ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر نیچ

بے عنایات خدا پیچ و ہسیچ

(یعنی گوہم نے بہت سی وعظ و نصیحت کی ہے لیکن کسی کام

کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالیٰ کی عنایت نہ

ہو ہم محض ہسیچ ہیں)

اصل مقصود جب حاصل ہوگا جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کی

کشش اور آپ پر عنایت ہوگی۔ چونکہ مولانا شیخ اور مربی ہیں اس لئے آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم ان عنایات الہیہ کے مورد کیونکر ہو سکتے ہو۔

بے عنایات حق و خاصان حق

گر ملک باشد یہ مستش ورق

(یعنی بغیر خدا تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرضاً فرشتہ

بھی تو اس کا ورق اعمال محض سیاہ ہوگا)

یعنی خدا تعالیٰ سے بلا واسطہ تعلق حاصل نہیں ہو سکتا یہ عادت اللہ کے خلاف ہے۔ بلکہ خاصان حق کے ذریعہ سے تعلق ہو سکتا ہے پھر تم بھی ان کی طرح مورد عنایت ہو جاؤ گے اور نصرت الہی تمہارے ساتھ ہو جائے گی خاصان خدا سے جدا رہ کر توفیق الہی تمہارے ساتھ نہیں ہو سکتی خوب سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ خاصان حق سے طریقہ اور تدبیر سیکھو اور خدا تعالیٰ سے دعا کرو پھر ان شاء اللہ کامیابی میں دیر نہ ہوگی اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم و عمل مستقیم کی توفیق عطا فرماوے آمین۔

صَلَّىٰ اللَّهُ تَعَالَىٰ عَلَىٰ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَىٰ آلِهِ

وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ

رَبِّ الْعَالَمِينَ

اس کے بعد حضرت حکیم الامت دام مجاہد نے تھوڑی دیر تک حسب عادت ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔ پھر اہل مدرسہ کے اصرار پر طلبہ کو انعام اور سند وغیرہ اپنے ہاتھ سے عطا فرمائی اس سے فراغت پا کر جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَىٰ ذَٰلِكَ (جامع عفا اللہ عنہم)

بِالْخَيْرِ



## البنیان المشید ترجمہ اردو البرہان الموبد

از عارف کامل ولی بے مثال مالک گنجینہ عوارف لدنی شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہ یہ وہی شیخ احمد کبیر قدس سرہ جنسی پیدا  
سے چالیس سال قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے ماموں کو بشارت دی تھی کہ تمہاری بہن کے ہاں ایک لڑکہ پیدا ہوگا اس کا نام  
احمر رکھا جائے اور اگر ام میں وہ ایسا ہی سردار ہوگا جس طرح کہ میں انبیاء کا سردار ہوں چنانچہ آپ کو وہ مرتبہ عطا ہوا تھا جو کسی دوسرے  
ولی اللہ کو میسر نہ ہوا ہوگا مثلاً جیسا آپ ۵۵ھ میں زیارت بیت اللہ کو تشریف لے گئے تو سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس  
کی زیارت کیلئے بھی حاضر ہوئے گئے حضرت اعلیٰ اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر آپ نے باوا بلند کہا السلام علیک یا جدی نور روضہ اطہر صلی اللہ علیہ  
وسلم سے ندا آئی وعلیکم السلام یا لدی اس نداء مبارک کو سنا آپ پر وجد طاری ہو گیا آپ کے علاوہ جتنے آدمی وہاں موجود تھے سب نے آواز  
کو سنا، تھوڑی دیر کے بعد آپ نے دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ تھا کہ جدائی دوری کی حالت میں تو اپنی روح کو روضہ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجتا  
تھا کہ میری طرف آپ کے آستانہ بوسی کاشرف حاصل کر لے اور جبکہ دولت دیدار مجھے اصالتاً حاصل ہے تو آپ اپنا مبارک ہاتھ دیکھے  
کہ میں اسے بوسہ دیکھ سکتا ہوں۔ اسی وقت روضہ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا۔ اور آپ نے اسے بوسہ  
دیا، اس وقت روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً نوے ہزار عاشقان جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشتاقان روضہ نبوی صلی اللہ علیہ  
وسلم کا مجمع تھا جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور سردار کا بیٹا فرزند موجود اعلیٰ اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی زیارت سے شرف ہوا۔ ان میں شیخ  
عبد القادر جیلانی نور اللہ مرقدہ اور حضرت شیخ عدوی اور حضرت شیخ عبدالرزاق حسینی دہلوی جیسے جلیل القدر بزرگ تھے، اس واقعہ کو اس  
کثرت سے بیان کیا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔ تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جب اس ترجمہ کا معائنہ فرما رہے تھے تو ایک روز  
اپنی مجالس خاص میں فرمایا کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی کتاب کے ترجمہ سے مجھے ایسی خوشی ہوتی ہو جیسی اس کتاب کے ترجمہ سے ہوتی۔  
ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ سالین روزانہ بطور روز کے اس کا مطالعہ کیا کریں، یہ کٹانا یا ہو چکی تھی اب دوبارہ طبع کی ہے۔  
اس کتاب کے ساتھ روح تصوف و عطرہ تصوف بھی شامل ہیں جس میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے  
موافق البرہان الموبد کے خاص قیمتی مضامین کو خلاصہ کے الگ کہ دیا گیا ہے، مناسب معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ حضرت حکیم الامت  
کے رسالہ مبادی التصوف بھی شامل کر دیا جائے جس کا مطالعہ مبتدیان سلوک کے لئے بہت مفید اور نافع ہے اس طرح یہ  
مجموعہ سب ہی لئے کافى شافی ہوگا۔ معرفت و حقیقت کا نایاب خوانہ ہے امید ہے کہ برادران اسلام عموماً اور برادران سلسلہ  
امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے۔ قیمت پچیس روپے علاوہ ڈاک خرچہ۔

لئے کاپیت لکھا  
مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی مل  
۱-۱۱۱-۱۱۱

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيَّ وَسَلَّمَ بَدِّعُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(رواه البخاری)

وصف مسمی بہ

# الْكَفَالُ فِي الدِّينِ

(للرَّجَالِ)

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحبہا

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ عقالتوی - دفتر الایقانہ

مسافر خانہ - بتدر روڈ کراچی  
ایم ای جیل روڈ

نہری اطلاع: خط و کتابت کتنے وقت یا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کیا کریں۔

# الکمال فی الدین

## (للرجال)

ابن	کہاں ہوا	دہلی - مسجد بجا بیان - محلہ بلہیا ران
مات	کس ہوا	۲۵ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ بروز یکشنبہ بوقت صبح شروع ہوا۔ بجکرہ منٹ پر ہوا۔
کہ	کتنی دیر ہوا	۳۰ گھنٹے ۲۰ منٹ ۱۱ بجے ختم ہوا
کیف	کیونکر ہوا	کھڑے ہو کر۔
ہا	کس ہوا	حافظ محمد اسماعیل تھا سو دگر کلکتہ کی دعوت پر تشریف لائے اور جیدہ خدیجہ کی درخواست پر وعاظ فرمایا۔
ما	کس ہوا	تنگیں میں کی ضرورت اور اس سبب تلاش اور ناکامی کا یہاں سے منظر تھا۔
من	کس طبقہ کو	عموماً ہر طبقہ کو بالخصوص ان لوگوں کو جو جاہل و ذلیل تھے زیادہ مفید تھا۔
من	زیادہ مفید تھا	احقر ظفر احمد تھا نوی مفا الشرح و عفر الالہ و شائخ واخوانہ اجمعین۔
من	کس ضابطہ کی	تقریباً تین ہزار سے زیادہ مجمع تھا۔
من	سائین کی	اس وعظ کا سامعین پر بہت گہرا اثر ہوا چنانچہ اس بہت جلد صاف کرنے اور شائع کر سکی درخواست کی گئی بلکہ بعض مخلصین نے جو تا مام ہوا عطا کی اشاعت کا سلسلہ قائم کر سکی خواہش ظاہر کی بابرک الشرح فہم۔
الاشتات	متفرقات	

### بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَحْمَدًا ۙ وَ سُنَّعَیْنِدْہٖ وَ سَتَقَفْرَہٗ وَ نُوْمِنْہٗ بِدُوْمُکَلِّ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْمِنَا ۙ وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۙ مَنْ یَّجِدْہٗ اَللّٰہُ فَلَآ مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُضِلّہٗ فَلَآ هَادِیَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ حْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ یٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ط

یہ ایک مختصر آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے ایک مقصود کا بیان فرمایا ہے اور اس کے

ساتھ ہی اس کے طریق کی تعیین فرمائی ہے اور آگے چل کر میں اس کو واضح کر دوں گا کہ وہ طریق نہایت ہی سہل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر انسان کا ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک اس کی تحصیل کا طریق ہوتا ہے۔ پھر طریق کبھی سہل ہوتا ہے کبھی دشوار۔ اگر مقصود متعین ہو اور اس کا طریق معلوم ہو اور وہ طریق سہل بھی ہو تو بہت جلد کامیابی ہو جاتی ہے ناکامی کا راز صرف یہی ہے کہ یا تو مقصود متعین نہ ہو یا طریق صحیح معلوم نہ ہو۔ یا وہ طریق دشوار ہو جس کے حاصل کرنے کی ہمت نہیں۔

مثلاً ایک شخص بیمار ہے اس کی ناکامی کا سبب کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس کو صحت کا مقصود ہونا معلوم نہ ہو اس لئے وہ صحت کے لئے کوشش اور تدبیر ہی نہیں کرتا یا صحت کا مقصود ہونا تو معلوم ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ صحت حاصل کرنے کا طریقہ معالجہ ہے یا یہ بھی معلوم ہے لیکن طریق معالجہ میں غلطی کر رہا ہے صحیح طریق پر نہیں چلتا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مقصود بھی معلوم، طریق بھی معلوم اور اس کا صحیح ہونا بھی معلوم مگر ہمت نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ معلوم ہے کہ مقصود صحت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا طریق معالجہ ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ طبیب ماہر فن ہے جو صحیح طریق سے معالجہ کرتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ حکیم صاحب نے سواروپہ کا نسخہ لکھ کر دیا ہے اور یہ شخص غریب ہے جو سواروپہ کا نسخہ استعمال کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح تمام دنیوی امور میں ناکامی کا سبب یہی ہوتا ہے کہ کبھی مقصود معلوم نہیں ہوتا کبھی طریق معلوم نہیں ہوتا کبھی طریق غلط ہوتی کبھی طریق دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو کسب کا مقصود ہوتا ہی معلوم نہیں اس لئے وہ ہاتھ پیر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے یا کسب کا مقصود ہونا معلوم ہے مگر اس کا طریق معلوم نہیں یہ دونوں شخص بھوکوں مریں گے۔ یا کسب کا طریق معلوم ہے لیکن سب نے معاش حاصل کرنے کا طریق تجارت کو بتلایا کیونکہ وہ لوگ تجارت کرنے والے تھے اور ان کو تجارت میں بہت کچھ نفع ہو چکا تھا اس لئے وہ ہر شخص کو یہی بتلاتے ہیں کہ معاش

کا طریق تجارت مگر اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس شخص نے کبھی روپیہ کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ شخص بھی بھوکا مرے گا کیونکہ گو اس کو مقصود بھی معلوم ہے طریق بھی جانتا ہے لیکن لوگوں نے اس کو ایسا طریقہ بتلایا ہے جو اس کے قبضہ سے باہر ہے۔ کسی شفیق نے اس کو مزدوری کا طریقہ نہیں بتلایا جس میں صرف ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت ہے۔ روپیہ کی کچھ ضرورت ہمیں۔ غرض اسی طرح تمام کاموں میں غور کر لیجئے تو ناکامی کا راز بھی معلوم گا۔

عدم تعیین مقصود۔ و عدم تعیین کا طریق یا عدم سہولت۔ اور ان دونوں کی تعیین و تسہیل کے بعد جو ناکام رہے گا وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام رہے گا یہ شخص حصول مقصود کا طریق محض تمنا کو سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے محض تمنا واسطہ ہونے کے قابل نہیں۔ مثلاً ایک شخص گھر میں غلہ جمع کرنا چاہے لیکن نہ کھیتی کرے نہ بیج ڈالے نہ کچھ کرے تو اس کا گھر غلہ سے ہرگز نہ بھرے گا۔ گو وہ کتنی ہی تمنا کرتا ہے کیونکہ عادت اللہ اس طرح جاری نہیں ہے کہ محض تمنا سے گھر بھر جایا کرے یوں قدرت ظاہر کرنے کے لئے کبھی حق تعالیٰ ایسا کر دیں تو وہ شاذ و نادر ہے و النادر کالمعدوم۔ خدا تعالیٰ کی قدرت میں یہ ضرور ہے کہ بدون کسب و غیرہ کے بھی گھر بھر دیں اور بعض دفعہ اس کا وقوع بھی ہوا ہے کہ بعض لوگوں کو بے گمان کسی جگہ سے خزانہ مل گیا اور وہ امیر کبیر ہو گئے مگر اس کا وعدہ نہیں ہے۔ پس جب نہ عادت اللہ اس طرح جاری ہے نہ کوئی وعدہ کیا گیا ہے پھر کس بھر سے ہاتھ پیر ہاتھ رکھ کر بیٹھا جاوے۔ مثلاً حق تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھلانے کے لئے حضرت مریم علیہا السلام کو ایک بیٹا بدون باپ کے دیا تھا مگر عادت اللہ یہی ہے کہ بدون باپ کے لڑکا نہیں ہوتا۔ اب اگر کوئی عورت اولاد کی تمنا کرے اور یوں چاہے کہ مریم علیہا السلام کی طرح میرے بھی بدون نکاح کے لڑکا ہو جائے تو اس کو سب پاگل کہیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس کو اولاد مقصود نہیں ہے اگر اولاد مقصود ہوتی تو یہ نکاح ضرور کرتی۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بدون ماں باپ کے پیدا کیا

تھا اب اگر کوئی مرد یہ تمنا کرنے لگے کہ میرے بھی کوئی لڑکا آدم علیہ السلام کی طرح ہو جائے کہ نہ مجھے نکاح کرنا پڑے نہ عورت کے پاس جانا پڑے۔ پس مٹی سے بنا بنا یا پتلا پیدا ہو جائے تو سب لوگ اس کو احمق سمجھیں گے اور یہی کہیں گے کہ اس کو اولاد مقصود نہیں ورنہ یہ نکاح ضرور کرتا۔ غرض دنیا کے کاموں میں تمام عقلاء اسباب کے اختیار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور محض تمنا کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ تمنا مجرد عن الاسباب کو حماقت پر محمول کرتے ہیں حالانکہ بعض اسباب پر مستیاب کا ترتیب یقینی بھی نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ تجارت کرتے ہیں اور ان کو نقصان ہوتا ہے۔ بعض ملازمت کرتے ہیں اور تنخواہ نہیں ملتی۔ بعض محنت مزدوری کرتے ہیں مگر مزدوری نہیں ملتی۔ بعض صنعت و حرفت جانتے ہیں اور ان کو کوئی کام پر نہیں لگاتا۔ لیکن محض توقع کی بنا پر سب عقلاء نے ان اسباب کی ضرورت پر اتفاق کر لیا ہے مگر حیرت درحیرت ہے کہ دین میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا حالانکہ وہ مقصودیت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے پھر اس کے طرق بھی معین و معلوم ہیں اور ان طرق کی صحت بھی معلوم ہے کیونکہ خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا صادق ہونا مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہے۔ پھر وہ طرق و اسباب دشوار بھی نہیں یہ مطلب نہیں کہ ان کے لئے ارادہ کی بھی ضرورت نہیں میں ارادہ کی نفی نہیں کرتا بلکہ مشقت کی نفی کرتا ہوں کہ اسباب دینیہ میں دشواری اور مشقت کچھ نہیں ارادہ کی بیشک ضرورت ہے۔ اور اس کی سب سے بڑھ کر دلیل حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

ما جعل علیکم فی الدین من حرج اور یرید اللہ بکھالیسر ولا یزید بکھالعیس (ترجمہ) خدا نے تمہارے لئے دین میں کچھ تنگی نہیں کی۔ جرح نہ کرو تحت نفی ہے جو عموم کو مفید ہے مطلب یہ ہوا کہ خدا نے دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ اس میں مطلق کچھ دشواری نہیں۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں تم کو دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ قرآن پر مسلمانوں کا

ایمان ہے اس لئے اس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے صرف اتنا کہدیتا کافی ہے کہ حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ دین میں کچھ تنگی نہیں لیکن میں اسی اکتفا نہیں کرتا بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ عقلاً بھی ثابت ہے کیونکہ جس وقت قرآن نازل ہوا ہے تمام کفار اس کی مخالفت پر آمادہ اور اس میں عیب نہکانے کے درپے تھے وہ قرآن کی تکذیب کے لئے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ اور حضرت قرآن میں تمام عالم کو دعوت دی گئی کہ وہ قرآن کا مثل بتالادیں جس سے ان کو اور بھی زیادہ اشتعال ہو گیا تھا پھر اس وقت سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں ملاحظہ اور مخالفین نے قرآن پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے اور قرآن میں یہ دعوے بڑے شدت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ دین میں کچھ تنگی نہیں اگر یہ دعوے کمزور ہوتا اور اس میں کچھ بھی خلاف واقع ہونے کی بوہوتی تو ملاحظہ اور کفار و مشرکین ہرگز اعتراض سے نہ چوکتے وہ ضرور اس کی تکذیب کرتے اور قرآن کی مخالفت کے لئے اچھا خاصہ بہانہ اُن کے ہاتھ آجاتا کہ دیکھئے قرآن کا یہ دعوے کتنا خلاف واقع ہے کہ جو دین اس قدر دشوار ہے اس کو آسان بتلایا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ تنگی نہیں ہے۔ لیکن کسی ملحد یا مخالفت نے آج تک قرآن کے اس دعوے کی تکذیب نہیں کی ورنہ اور اعتراضوں کی طرح یہ اعتراض بھی ضرور منقول ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مخالفین کو اس دعویٰ میں چون و چرا کی کچھ بھی گنجائش نہیں ملی۔ مگر افسوس ہے اس زمانہ میں قرآن پر اعتقاد رکھنے والے یعنی بعض مسلمان اس دعوے پر اعتراض کرتے ہیں جس پر مخالفین کو بھی حرف گیری کا موقع نہ ملا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو اس پر اعتقاد نہیں۔ اعتقاد تو ہے مگر حالت یہ ہے کہ اگر وہ قرآن کے اس دعوے کی تکذیب نہیں کرتے تو دل کھول کر تصدیق بھی نہیں کرتے اس کی تصدیق کرتے ہوئے ان کے دل رکتے ہیں۔ مگر جس مسئلہ کو مخالف بھی تسلیم کر چکا ہو اس پر مسلمانوں کا اعتراض کرنا بڑی شرم ناک بات ہے۔

صاحبو! میں یقیناً کہتا ہوں کہ قرآن کا یہ دعویٰ بالکل سچا اور صحیح ہے اگر اس میں

کچھ بھی کمزوری ہوتی تو ملاحظہ ہرگز نہ چوکتے خصوصاً جبکہ وہ ان کمزور مسلمانوں کے وہ دلائل بھی سن لیتے جو آج کل اس کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں کہ صاحب دین پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ اگر تجارت کرو تو بات بات پر شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں ربا لازم آگیا۔ اس صورت میں مٹن مہول ہے اس لئے بیع فاسد ہے۔ اس صورت میں یہ شرط فاسد ہے کسی صورت میں جہالت بیع کی وجہ سے بیع فاسد ہے اور ہم کو تجارتی معاملات اہل یورپ سے اس طریق پر کرنے پڑتے ہیں جو ان کے یہاں رائج ہے اور اہل یورپ بالکل آزاد ہیں ان کے معاملات کی اکثر صورتیں خلاف شریعت ہیں۔ اب اگر تجارت کریں تو دین پر کس طرح قائم رہیں اور دین پر قائم رہیں تو تجارت کس طرح چلے۔ قرض بلا سود کہیں سے نہیں ملتا اور تجارتی کاروبار بدون قرض کے نہیں چل سکتا اب کریں تو کیا کریں۔ ملازمت کا حال یہ ہے کہ اس میں بھی بعض کام خلاف شرع کرنے پڑتے ہیں۔ زراعت میں بھی قدم قدم پر شرعی احکام رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ میں ان سب اعتراضوں کا بھی جواب دوں گا بلکہ اور بھی کوئی اعتراض کسی کے ذہن میں ہو تو ان شاء اللہ وہ بھی اس جوآ سے حل ہو جائے گا۔ مگر جواب سے پہلے میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اگرچہ حکایت گندی ہے مگر اس حالت کے بالکل ہی مطابق ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ مثال سے مضمون جلدی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

ہمارے قصبے میں ایک عورت مغرب کے وقت اپنے بچہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی چاند رات کا موقع تھا بچے اور عورتیں عید کا چاند دیکھ رہی تھیں یہ عورت بھی بچہ کو پونچھ پانچھ کر چاند دیکھنے کھڑی ہوئی، جلدی میں کچھ پاخانہ انگلی کو لگا رہ گیا جلدی میں اُسے خبر نہ رہی کہ میری انگلی میں کیا لگا ہوا ہے۔ اس نے عورتوں کی عادت کے موافق تاک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو اس میں سے پاخانہ کی بدبو آئی۔ تو آپ فرماتی ہیں کہ اے ہے ایک عید کا چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ تو جس طرح اس عورت کو اپنی انگلی کا پاخانہ چاند میں محسوس ہوتا تھا اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ چاند سڑا ہوا نکلا ہے۔



اب صاجو! خدا کی قسم اسی طرح تم کو جو دین میں تنگی نظر آ رہی ہے یہ دین کی تنگی نہیں بلکہ حقیقت میں یہ تنگی تمہارے اندر ہے۔ تمہارے تمدن اور معیشت میں تنگی ہے جس کو میں آگے وضاحت کے ساتھ بتلا دوں گا مگر آپ کی یہ حالت ہے کہ اپنی انگلی کو تو آپ دیکھتے نہیں کہ اس میں بخاست لگی ہوئی ہے خواہ مخواہ ماہتاب شریعت کو بدبودار بتاتے ہیں حالانکہ وہ اتنی بلندی پر ہے کہ یہ گند گیا اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتیں۔

جیسے ایک حبشی کا قصہ ہے کہ اس کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا تو آپ نے اس کو اٹھا لیا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھنا شروع کیا تو ایک ڈراوٹی صورت بھدی شکل اس میں نمودار ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ یہ صورت اس آئینہ میں پہلے ہی سے بنی ہوئی ہے اپنی نسبت یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ شاید یہ میری ہی صورت دلفریب ہو کیونکہ آدمی کو اپنی صورت تو نظر نہیں آتی اس لئے اپنی صورت کا بُرا بھلا ہونا خود کو کم معلوم ہوتا ہے تو اس حبشی نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اُسے پھینک دیا اور کہا ایسی بُری صورت کا تھا جیسی تو مجھے کوئی یہاں پھینک گیا۔

صاجو! اسی طرح آپ کو اپنی مہیب صورت دین کے آئینہ میں نظر آتی ہے جس کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا بھد اپن نعوذ باللہ دین کے اندر ہے۔ حالانکہ اس میں تو اس قدر صفائی اور نور ہے کہ ظلمت اور سیاہی کا وہاں نام بھی نہیں لیکن شفاف ہونے کی وجہ سے آپ کو اپنی صورت اس میں نظر آ رہی ہے جس کو آپ مزین کی صورت سمجھے ہوئے ہیں اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں ۵

حملہ بر خود میسکنی اے سادہ مرد

ہمچو آل شیرے کہ بر خود حملہ کرد

رحملہ خود تو اپنے اوپر کرتا ہے اے سادہ مرد مثل اس شیر کے جس نے اپنے

اوپر خود حملہ کیا تھا

اس کا قصہ مولانا نے ثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ۔ ایک مرتبہ پنچیروں نے باہم مشورہ کیا کہ شیر روزانہ ہم کو پریشان کرتا ہے اور ایک دو کو شکار کر لیتا ہے جس سے ہر ایک کو روزانہ اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے اور اس خطرہ سے زندگی تلخ رہتی ہے آؤ ہم سب چل کر شیر سے یہ کہیں کہ وہ اس طرح ہم کو پریشان نہ کیا کرے ہم روزانہ اپنے میں سے ایک کو اس غذا کے لئے بھیج دیا کریں گے جس کے دوسروں کو تو اطمینان ہو جائے گا چنانچہ سب نے جا کر شیر سے یہ بات کہی اس نے منظور کر لیا کیونکہ اس میں اس کو بھی راحت تھی کہ روزانہ بے محنت و مشقت گھر بیٹھے غذا مل جا یا کرے گی۔ اب پنچیروں نے قرعہ ڈال کر روزانہ ایک شکار کو شیر کے پاس بھیجنا شروع کیا جس کا نام قرعہ میں نکل آتا سب اس کو مجبور کر کے شیر کے پاس بھیج دیتے۔

ایک دن خرگوش کی باری آئی سب نے اس سے کہا کہ جاؤ آج شیر کی غذا تم ہی ہو کہنے لگا کہ میں تو نہیں جاتا یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں چلا جاؤں۔ یہ تو خود کشی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی یہ بات مناسب نہیں شیر سے وعدہ خلافی ہوگی کہنے لگا کہ یہ وعدہ خود ہی نا جائز ہے کیونکہ یہ خود کشی کو مستلزم ہے اور نا جائز وعدہ کا ایفا واجب ہی نہیں اب تو پنچیروں میں کھلبلی پڑ گئی سارے اکھٹے ہو گئے اور خرگوش کو سمجھانے لگے کہ اگر تو نہ گیا تو شیر کو غصہ آجائے گا۔ اس نے کہا کہ بلا سے اگر اُسے غصہ آویگا تو سبھی پر آوے گا پھر جس کی موت آگئی ہوگی اسے کھالے گا۔ ممکن ہے کہ اس صورت میں میں بچ جاؤں اور جو صورت تم تجویز کر رہے ہو اس میں تو میری موت یقینی ہے اور موت متحمل پر موت یقینی کو کون گوارا کر سکتا ہے یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس وعدہ خلافی سے فتنہ برپا ہو جا سکتا اس نے کہا میرے لئے تو آج ہی فتنہ آگیا مجھے فتنہ کی کیا پرواہ ہے۔ میرے لئے موت سے بڑھ کر کیا فتنہ ہے۔ بیش پر نیست کہ وہ غصہ میں

آکر مجھے کھالے گا تو یہی تجویز تم میرے واسطے کر رہے ہو اتنا فرق ہے کہ اس وقت میں خود موت کے منہ میں جا رہا ہوں اور فتنہ کے وقت میں اپنے بچنے کی پوری کوشش کروں گا پھر بھی اگر مر گیا تو تقدیر ہے لیکن وہ صورت اس سے اہون ہے کیونکہ اُس میں خود کشتی تو نہ ہوگی۔ جب پنجیروں نے دیکھا کہ دلائل سے یہ قائل نہیں ہوتا تو اب برادری کے زور سے کام لیا اور سب نے اس پر دباؤ ڈالا کہ نہیں تم کو ضرور جانا ہوگا اگر تم نہ جاؤ گے تو ہم جبراً تم کو شیر کے سپرد کر دیں گے۔ بالآخر برادری کے دباؤ سے خرگوش مجبور ہو کر چلا۔ مگر راستہ میں سوچنے لگا کہ کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیے کہ جس سے جان بھی بچ جائے اور برادری بھی ناخوش نہ ہو۔ راستے میں اسے کنواں نظر پڑا جس میں پانی بھرا ہوا تھا، خرگوش بہت خوش ہوا کہ بس شیر کو اسی کنویں میں ڈبو دینا چاہیے۔ اس کے بعد وہ شیر کے پاس پہنچا۔ شیر کے راتب میں چونکہ آج بہت دیر ہو گئی تھی اس لئے وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا اور یہ خیال کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے ان پنجیروں نے اپنے وعدہ کو بدل دیا ہے پس میں آج جا کر ان کو کافی سزا دوں گا خرگوش کو دیکھ کر شیر بہت غرایا اور اس کو برا بھلا کہنے لگا کہ آج معمول سے زیادہ دیر کیوں ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے دلوں میں وعدہ خلافی کا خیال پیدا ہوا ہے۔ خرگوش نے کہا کہ حضور آپ پہلے ہمارا واقعہ تو سن لیں اس کے بعد ہی غصہ کیجئے گا۔ آج مجھ کو آنے میں دیر اس لئے ہوئی کہ آپ کی دارالسلطنت میں ایک قوی دشمن گھس آیا ہے جس نے راستہ روک رکھا ہے اور یوں کہتا ہے کہ تم بجائے فلاں شیر کے مجھ کو راتب دیا کرو اس کو مت دیا کرو۔ اور آج آپ کے راتب کے لئے ایک بڑا موٹا خرگوش تجویز ہوا تھا وہ میرے ہمراہ راستہ میں آ رہا تھا کہ اس کو دوسرے شیر نے پکڑ لیا میں بھاگ کر بچ گیا اور اطلاع کرنے کے لئے آپ کے پاس پہنچ گیا۔ پس اگر آپ کو اپنے راتب کی خیر منظور ہے تو اس

دشمن کو اپنی دارالسلطنت سے نکال دیجئے ورنہ کل سے آپ کا راتب بالکل بند ہے وہ کسی کو آپ تک پہنچنے نہ دے گا۔ شیر کو اپنے رقیب کا حال معلوم کر کے بڑا غصہ آیا اور کہا کہ میرے ساتھ چلو میں ابھی اس کو سزا دیتا ہوں وہ ایسا شیر کونسا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ زبردست ہے چنانچہ خرگوش اس کو ساتھ لیکر کنویں پر پہنچا اور کہا کہ حضور دیکھئے وہ اس کنویں میں رہتا ہے اور دیکھئے اس قبضے میں مجھ سے بھی زیادہ موٹا تازہ خرگوش ہے شیر نے جو کنویں میں جھانکا تو اس کو اپنی صورت نظر آئی اور اپنے ساتھ ہی خرگوش کی بھی صورت نظر آئی اور یہ قاعدہ ہے کہ پانی کی تہ میں ہر چیز بڑی نظر آیا کرتی ہے تو خرگوش کی صورت بھی بڑی معلوم ہوئی۔ شیر نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر غصہ میں اس پر حملہ کیا اور دھڑام سے کنویں کے اندر جا پہنچا۔ وہاں پانی کے سوا کیا تھا۔ اب خرگوش اوپر سے کہتا ہے کہ بس یہ تمہارا قید خانہ ہے تم اسی میں ڈوب کر جان دیدو اور میں جاتا ہوں میرا سلام لو۔ اس کے بعد خرگوش خوش خوش ہوتا ہوا اپنی برادری میں پہنچا انھوں نے کہا کہ کیا تو شیر کے پاس نہیں گیا اس نے جواب دیا کہ تم نے مجھے اس کا شکار بنا نا چاہا تھا میں نے اسی کو شکار کر دیا۔ اس پر مولانا فرماتے ہیں ۷

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد

ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

رحملہ تو خود اپنے اوپر کرتا ہے اے سادہ مرد مثل اس شیر کے جس نے

پانی کے اندر اپنی تصویر دیکھ کر اپنا رقیب اس کو سمجھ کر اس پر حملہ کر دیا،

صاحبو! یہی حال معترضین کا ہے کہ جو اعتراض وہ شریعت پر کرتے ہیں حقیقت

میں وہ اپنے اوپر اعتراض کر رہے ہیں۔ مگر ان کو خیر نہیں۔ شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو

ایک دعوائے ہوا۔ اس کی دلیل کیا ہے۔ اور شریعت میں تنگی کا ہونا تو ہم کو مشاہد

سے معلوم ہے کیونکہ خود دیکھ رہے ہیں کہ معاملات وغیرہ میں ہم کو شریعت پر

عمل کرتے ہوئے سخت تنگی پیش آتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس کی تردید و تکذیب نہیں کرتا کہ آپ کو معاملات وغیرہ میں تنگی پیش نہیں آتی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تنگی کا سبب شریعت مقدسہ ہے یا آپ کی معیشت اور تمدن کا خراب ہوتا یا درکھوسی قانون کو تنگ اس وقت کہا جاسکتا ہے جبکہ سب آدمی اس پر عمل کرنا چاہیں اور پھر بھی اس پر عمل کرنا دشوار ہو۔ اور اگر کسی قانون پر عمل کرنا اس لئے دشوار ہو جاوے کہ ہزار آدمیوں میں سے دس آدمی تو اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام جماعت اس ارادہ کی مخالفت کرتی ہے اس صورت میں قانون کو ہرگز تنگ نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہی کہا جائے گا کہ تمہاری قوم کا تمدن تنگ ہے ان کی معیشت میں تنگی ہے، اس قاعدہ کو سمجھ کر سوچئے کہ آپ کو شریعت پر عمل کرنے میں تنگی کیوں پیش آتی ہے محض اسی وجہ سے تاکہ آپ تنہا اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام تجار اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔ آپ سود کی ڈگری نہیں دینا چاہتے مگر مدعی سود لینا چاہتا ہے۔ اگر آپ ڈگری نہ دیں گے تو وہ اپیل کر کے سود وصول کر لے گا۔ ایک محکمہ میں ہزار آدمی ملازم ہیں ان میں دو چار آدمی نماز کے وقت کام کرنا نہیں چاہتے باقی تمام ملازم نماز کے ضائع کرنے پر راضی ہیں اس لئے ان دو چار آدمیوں کو تنگی پیش آتی ہے اگر سب اس کا ارادہ کر لیں کہ ہم نماز کو کبھی ضائع نہ کریں گے تو حاکم محکمہ ضرور اس کے لئے قانون بنانے پر مجبور ہوگا علیٰ ہذا تمام صورتوں میں غور کر لیجئے کہ شریعت پر عمل میں تنگی محض اسی وجہ سے پیش آئے گی کہ ایک کام کا تعلق پوری جماعت سے ہے جن میں صرف دو چار آدمی شریعت پر عمل کا قصد کرتے ہیں اور زیادہ حصہ عمل کرنا نہیں چاہتا اب آپ ہی بتلائیے کہ یہ تنگی احکام شرعیہ میں ہے یا آپ کے تمدن و معیشت میں۔ صاحبو! اس طرح تو آسان سے آسان کام بھی دشوار ہو جائے گا۔ دیکھئے کھانا کھانا کتنا آسان ہے لیکن اگر آپ کسی ایسے گاؤں میں پہنچ جائیں جہاں نہ آٹا بکتا ہو نہ لکڑی داموں سے ملتی ہو۔ نہ دال اور

اور گھی ملتا ہے تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھانا بہت دشوار چیز ہے ہرگز نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ اس گاؤں کا تمدن تنگ ہے یا آپ کھانا چاہتے ہوں لیکن آپ کے سر پر دس ڈاکو آکر کھڑے ہو جائیں کہ جب لقمہ اٹھاؤ وہ چھین کر کھا جاتے ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھانا مشکل کام ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ آپ کی معاشرت تنگ ہے ڈاکوؤں کی جگہ سے علیحدہ ہو کر رہو پھر دیکھو کھانا کتنا آسان کام ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ آپ کسی ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں عموماً سب لوگوں کو شریعت پر عمل کرنے کا اہتمام ہو پھر بتلائیے کہ شریعت میں کیا تنگی ہے۔ دیکھو اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جائے اور وہ اس کو ایسا نسخہ لکھ کر دے جس کی قیمت دو پیسے ہے سستی دوائیں لکھے اور معمولی دوائیں بتلائے جو عموماً ہر جگہ مل جاتی ہیں۔ لیکن مریض ایسے کورہ کارہنے والا ہے جہاں قسمت سے معمولی دوائیں بھی نہیں ملتیں نیز حکیم صاحب نے معمولی پر ہیز بتلایا تھا اور دس پندرہ چیزوں کی اجازت دیدی تھی کہ پاک کا ساگ۔ تری۔ کدو۔ مونگ کی دال۔ بکری کا گوشت۔ شلجم کی بھجیا وغیرہ کھا سکتے ہو لیکن اس کورہ میں کوئی چیز بھی مریض کے کھانے کے قابل نہیں ملتی ہاں بیگن۔ کریلے اور مسور کی دال بہت ملتی ہے جس سے طبیب نے پرہیز بتلایا ہے اب یہ مریض اگر یوں کہنے لگے کہ اس طبیب کے مطلب میں بہت تنگی ہے یا یوں کہنے لگے کہ علم طب ہی بہت تنگ ہے جس پر عمل کرنا دشوار ہے تو کیا کوئی عاقل اس کی بات کو تسلیم کر سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ سب یہی کہیں گے کہ ظالم علم طب میں تو بہت وسعت ہے کہ سنگین سے سنگین مرض کا علاج ہزار روپیوں میں بھی ہو سکتا ہے اور چار پیسے کی دوائیں بھی۔ لیکن تیرا گاؤں ہی بہت تنگ ہے جس میں معمولی چیزیں بھی ملنا دشوار ہے۔ صاحبو! بعینہ یہی مثال ان اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کی ہے کہ وہ اپنے تمدن اور معاشرت کی تنگی کو تو دیکھتے نہیں خواہ مجزاہ شریعت پر الزام لگاتے ہیں کہ اس میں تنگی

اور دشواری ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ قانون شریعت سے زیادہ کوئی قانون ہو ہی نہیں سکتا جس میں مصالح دنیا و آخرت کی پوری پوری رعایت کی گئی ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جس جگہ زیادہ حصہ مسلمانوں کا شریعت پر عمل نہ کرنا چاہے بلکہ عمل کرنے والوں کو بھی اس سے روکنا چاہے تو ان ڈاکوؤں کی وجہ سے تنگی پیش آجائے گی ورنہ احکام شرعیہ فی نفسہا بہت سہل ہیں جن پر اگر سب مل کر عمل کرتا چاہیں تو نہایت راحت و اطمینان سے زندگی بسر ہو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا يَكْفُرُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا دُسَّهَا پھر یہ کیونکر تسلیم کر لیا جاوے کہ شریعت کے احکام وسعت انسانیہ سے باہر ہیں یا ان میں کچھ بھی دشواری ہے خدا تعالیٰ کا کلام کبھی ٹوٹ نہیں سکتا نہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے اس مضمون کو میں نہایت تفصیل کیسا بیان کر سکتا ہوں لیکن میں اس مضمون پر پہلے عرصہ ہوا کہ ایک مفصل تقریر کر چکا ہوں۔ جس کا نام نفی الحرج ہے اور وہ اب قریب المطبع ہے۔ اہل مطبع کہتے تھے کہ ہم اس کو بہت جلد شائع کریں گے۔ اس میں ہر پہلو سے اس دعوے کو خوب اچھی طرح ثابت کر دیا گیا کہ دین میں ہرگز تنگی نہیں اور اس وعظ میں تو تعلیم یافتہ طبقہ کے بھی بہت حضرات موجود تھے سب نے اس کو شکر گردنیں جھادیں اور اس کا اقرار کیا کہ واقعی یہ دعویٰ اچھی طرح ثابت ہو گیا اور ہمارا عرصہ کا اثر کال رفع ہوا۔ اس وعظ کی ایک کاپی ہر مسلمان کے گھر میں رہتی چاہیے خصوصاً تو تعلیم یافتہ حضرات تو ایک کاپی ضرور رکھیں کیونکہ ان کو اس قسم کے اشکالات زیادہ پیش آتے ہیں اور دین میں شک و شبہ کا بڑا سنا بڑا سنگین مرض ہے اس کا علاج بہت اہم ہے۔ ان شاء اللہ اس وعظ سے بہت سے اشکالات رفع ہو جائیں گے۔ حاصل یہ کہ دین مقصودیت میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہے اور اس کا طریق بھی متعین ہے اور طریق میں تنگی بھی نہیں بلکہ سہل اور بہت سہل ہے اور پھر اس طریق پر مقصود کا ترتیب بھی یقینی چنانچہ اوپر بھی مذکور ہوا ہے اور یہاں اس کا راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دین کے کاموں میں ثمرہ کا وعدہ

فرمایا ہے اور اسباب دنیویہ میں اس کا وعدہ نہیں فرمایا چنانچہ دنیا کے متعلق ارشاد ہے من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن یرید یعنی جو کوئی دنیا کا قصد کرے گا ہم اس کو دنیا میں جس قدر ہم چاہیں گے اور جس کے لئے چاہیں گے سردست دیدیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیوی مراد کا حصول مشیت پر موقوف ہے یہ وعدہ نہیں کہ جو تم چاہو وہی مل جائے اور یہ بھی وعدہ نہیں کہ ہر ایک کا مقصود پورا ہو جائے بلکہ بعض کا مقصود حسب مشیت الہی حاصل ہو جاتا ہے اور بعض کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوتا اور اعمال آخرت کے متعلق ارشاد ہے ومن اراد الاخرۃ وسعی لہا سعیہا وہو مؤمن فاولئک کان سعیہم مشکوراً اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرے اور مؤمن بن کر اس کے لئے کوشش کرے جو اس کے مناسب ہے تو ان لوگوں کی کوشش مشکور ہے یعنی حق تعالیٰ اس کی قدر فرمائیں گے اس آیت میں سعی لہا سعیہا۔ ارادہ کا بیان ہے یعنی ارادہ سے مراد محض تمنا نہیں کیونکہ خالی تمنا کافی نہیں بلکہ ارادہ سے مراد قصد جائز ہے جس کے لئے سعی لازم ہے آگے اس کی جزا مذکور ہے اولئک کان سعیہم مشکوراً کہ ان کی سعی کی قدر کی جائے گی اور ظاہر ہے کہ شاہی محاورہ میں یہ جملہ بہت امید افزا ہے جب کوئی بادشاہ اپنے کسی خادم سے یہ کہدے کہ ہم تمہاری خدمات کے قدر دان ہیں تو اس کو انعامات جلیلہ کی پختہ امید ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھ کو میری خدمات سے بدرجہا زائد صلہ ملے گا۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ حاکم کے کلام میں ایسے جملہ سے بہت کچھ امیدیں پختہ ہو جاتی ہیں تو احکم الحاکمین کے کلام میں اس جملہ سے کیا کچھ امیدیں پیدا ہونی چاہئیں اس کا فیصلہ اہل ذوق خود کر سکتے ہیں دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں من کان یرید حوث الاخرۃ نزلہ فی حوثہ ومن کان یرید حوث الدنیا نزلہ منہا۔ دنیا کے متعلق نوتہ منہا فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا قصد کرتا ہے اس کو ہم کچھ دیدیتے ہیں تو وعدہ نہیں کہ جو وہ چاہتا وہی دیدیں اور آیت سابقہ کے قید لمن یشاء یہاں بھی ہے اور آخرت کے



متعلق ترقی کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی اطلاق کے ساتھ ہے جس میں مشیت وغیر  
کی قید مذکور نہیں نہ من تبعیفیہ لایا گیا ہے جس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ راز  
آخرت کے بعد تو مراد ضرور حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عطا ہوتا ہے  
سبحان اللہ دنیا کے متعلق تو یہ بھی وعدہ نہیں کہ جو مانگے وہی مل جائے اور یہاں  
زیادت کا بھی وعدہ ہے اور یہ ترقی محض آخرت ہی میں نہیں بلکہ دین اختیار کرنے  
والوں کو دنیا میں بھی ان کے اعمال سے زیادہ جزا مل جاتی ہے۔ دینداروں کو دنیا  
میں بھی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ان کو پہلے سے خبر بھی نہیں تھی آخرت کے متعلق  
تو مسلمانوں کو اس کا علم عام طور پر ہے سب جانتے ہیں کہ آخرت میں عمل سے زیادہ  
صلہ ملے گا کیونکہ وہ یہ حدیث سُنئے ہوئے ہیں اعدت لعباد فی الصالحین صا کا  
عین رأی ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ میں نے اپنے نیک برادر  
کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر  
کے دل پر ان کا خطرہ گذرا لیکن دنیا میں زیادت اور ترقی کا علم بہت لوگوں کو نہیں  
ہے اکثر مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ دین کا ثمرہ عمل سے زیادہ آخرت ہی میں ملیگا۔  
اور دنیا میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ نہیں ملتا یا کم ملتا ہے مگر یہ خیال بالکل  
غلط ہے حق تعالیٰ اعمال دینیہ کا ثمرہ دنیا میں بھی امید اور خیال سے زیادہ عطا فرماتے ہیں اور اس ثمرہ کی  
بھی وہی شان ہوتی ہے ولا خطر علی قلب بشر کہ انسان کے دل میں پہلے سے اس کا خطرہ بھی نہیں گذرتا  
شاید آپ یہ سوال کریں کہ وہ ثمرات کیا ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ دین کو اختیار کر لو خود ہی تم کو وہ ثمرات  
حاصل ہو جائیں گے میراں کو بیان نہیں کر سکتا اور وہ بیان میں آ بھی نہیں سکے کیونکہ ان کی تو شان ہے  
ولا خطر علی قلب بشر اور بیان کرنے سے قابلِ خطور ہونا لازم آجائیگا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں بھی اہل  
دین کو وہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں جن کے بیان کیلئے الفاظ بھی نہیں ملتے ہاں کچھ کچھ یہ ان کا بزرگوں کے  
کلام سے معلوم ہوتا ہے جن کا صادق ہونا امارات یقینیہ سے معلوم ہے ایک کتاب میں ایک  
بزرگ کا قول ہے۔ لکھا ہے لو علمت الملوک بما عندنا من النعمہ  
لجادلون بالسیوف کہ اگر سلاطین کو ان نعمتوں کا علم ہو جائے جو ہمارے پاس ہیں

تو وہ تلواریں لے کر ہم پر چڑھائی کر دیں اور ان کو چھیننا چاہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے پاس وہ نعمتیں ہیں جن کی لذت کے سامنے سلطنتِ نہفتِ اقلیم کی بھی کچھ حقیقت نہیں کیونکہ سلاطین تو اسی چیز کے طالب ہو سکتے ہیں جو ان کی دولت موجودہ سے بڑھ کر ہو اگر وہ نعمتِ سلطنت سے کم ہوئی تو بادشاہوں کو ادھر توجہ کرنے کی کیا ضرورت پڑتی ہے جبکہ وہ اس سے زیادہ نعمت لئے بیٹھے ہیں۔ پس یقیناً وہ نعمت ایسی ہے جس کی سلاطین کو ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر یہی نہیں کہ بزرگوں کی یہ باتیں ہی باتیں ہیں بلکہ جس کو وہ نعمت حاصل ہوئی ہے اس نے سلطنت پر لات مار کر بھی دکھلا دیا ہے۔ ابراہیم ادہم کا قصہ مشہور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے ان کو اپنی خاص نعمت سے نوازا ہے تو تختِ سلطنت چھوڑ کر فقر و فاقہ کو اختیار کر لیا۔ پس وہ ایسی نعمت ہے کہ جس کے سامنے وہ سلطنت کو بالکل بیچ سمجھتے ہیں مگر ظاہر میں یہ حالت ہے کہ نہ کپڑے درست ہیں نہ صورت ٹھیک ہے اور باطن میں بھی وہ ایسے غنی ہیں کہ سلاطین کو بھی منہ نہیں لگاتے بلکہ خود سلاطین ان کی غلامی کو اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں اس نعمت کو عارف شیرازی اس طرح بیان فرماتے ہیں ۷

میں حقیقہ گدایانِ عشقِ را کین قوم

شہاں بے کمر و خسرواں بے گلہ اند

(حق تعالیٰ کے عاشقوں کو حقیر مت سمجھو کہ یہ بے تخت و تاج ہی باطنی سلطنت کے بادشاہ ہیں)

نیز عارف شیرازی اس نعمت کا کسی قدر پتہ بھی بتلاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ۸

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہرے

یہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ وزہا دہوئے

(فراغِ دل سے ایک لمحہ کو بھی اس محبوب کی یاد میں لگتا اس سے بہتر ہے کہ شاہی

چھتری سر پر ہو اور سلطنت کا شور و غل ہو۔)

معلوم ہوا کہ وہ نعمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف کامل توجہ اور اس سے کامل  
معلق ہو جاوے۔ اس نعمت کی یہ خاصیت ہے کہ پھر یہ شخص دنیا سے مستغنی ہو  
جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جس دل میں خدا ہوگا اس میں کوئی دوسری چیز کب رہ سکتی ہے

عشق آل شعلہ است کہ چوں بر فروخت

ہر چہ بجز معشوق باقی جملہ سوخت

عشق وہ آگ ہے جب دل میں روشن ہوتی ہے معشوق کے علاوہ سب غیر کو

جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت

مرحباے عشق شرکت سوز رفت

(صرف حق تعالیٰ ہی کی ذات دل میں باقی رہتی ہے مبارک ہوائے عشق

تجھ کو کہ تو نے غیر اللہ کو جلا کر دل کو غیر حق کی شرکت سے پاک کر دیا)

لیکن یہ بھی اس نعمت کا اجمالی ہی پتہ ہے کیونکہ اس سے بھی یہ نہ معلوم ہوا کہ خدا

تعالیٰ سے کامل تعلق کیونکر ہوا کرتا ہے اسی لئے اس میں غلطی بھی ہوتی ہے چنانچہ

بعض لوگ محض ملکہ یادداشت کو کامل تعلق کا مصداق سمجھتے ہیں اور نسبت کی حقیقت

اسی کو سمجھتے ہیں۔ اور ایک زمانہ تک میں بھی یہی سمجھتا رہا مگر الحمد للہ کہ اب حق تعالیٰ

نے حقیقت منکشف فرمادی حق تعالیٰ سے تعلق و نسبت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں

طرف سے تعلق ہو بندہ کو خدا سے تعلق ہو اور حق تعالیٰ کو بندہ سے تعلق ہو اگر صرف

بندہ کو تعلق ہو اور ادھر سے تعلق نہ ہو بلکہ حجاب رہا تو یہ نسبت مطلوبہ نہیں بغرض

لوگ محض یادداشت کو نسبت مطلوبہ سمجھتے ہیں حالانکہ یادداشت تو مشق سے

حاصل ہو سکتی ہے نسبت مقصودہ یہ ہے کہ تم خدا سے راضی رہو وہ تم سے راضی

رہیں اور یہ بات محض مشق ذکر سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے کثرت ذکر کے

ساتھ اجتناب معاصی و ادائے طاعات بھی شرط ہے اگر ذکر کے ساتھ معاصی

سے اجتناب کا اہتمام نہیں اور طاعات کے بجالانے کی فکر نہیں تو نسبت مطلوبہ

حاصل نہیں۔ بہت لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ جہاں ان کو ذکر کی مشق ہو گئی اور ہر وقت خدا کا دھیان رہنے لگا بس وہ اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگے۔ پھر چونکہ موصیت سے اس مشق میں دستور نہیں آتا اس لئے یہ شخص یوں سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ کو معاصی مضر نہیں حالانکہ صوفیہ کا قول ہے کہ موصیت سے نسبت باطنیہ کمزور ہو جاتی ہے اور معاصی پر اصرار کرنے سے وہ رفتہ رفتہ زائل ہو جاتی ہے بلکہ بعض لوگ یہاں تک دھوکہ میں پڑ گئے کہ بعد حصول نسبت کے ایک مقام ایسا آتا ہے جس میں اس شخص سے تکالیف شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں اور کوئی حرام اس کے لئے حرام نہیں رہتا۔ یاد رکھو یہ صریح زندقہ ہے تکالیف شرعیہ جب تک ہوش و حواس درست رہیں کسی سے بھی کسی وقت ساقط نہیں ہوتیں۔ پس نسبت ایک ایسا تعلق ہے جو طرفین سے ہوتا ہے اگر صرف ایک طرف سے ہو اور دوسری طرف سے نہ ہو تو وہ نسبت ایسی ہے جیسے ایک طالب علم سے کسی نے پوچھا تھا کہ آج کل کس فکر میں ہو کہنے لگا کہ شاہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں اُس نے پوچھا کہ پھر اس کے لئے کیا سامان کیا کہنے لگا کہ ادھا سامان تو ہو گیا ادھا باقی ہے اس نے پوچھا کیونکر کہنے لگا میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں ہے تو جیسا کہ یہ شخص اپنی رضا مندی سے ادھا سامان مکمل کئے ہوئے تھا اسی طرح ان لوگوں کی نسبت ہے اور ظاہر ہے کہ نکاح میں ایک طرف کی رضا بدون رضا دوسرے کی کچھ بھی وقعت نہیں رکھتی۔ اسی طرح ان لوگوں کی نسبت جو کہ محض ایک طرف سے ہے محض بالکل کالعدم ہے اس صحیح نسبت ہی میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جس کے سامنے سلطنت کی کچھ حقیقت نہیں۔

حضرت عوث اعظمؓ کی خدمت میں ایک مرتبہ ملک سجنر نے یہ لکھا کہ میں حضرت کی خانقاہ کے مصارف کے لئے ملک نیمروز کے ایک حصہ کو نامزد کرنا چاہتا ہوں حضرت اس کو قبول فرمائیں تو آپ نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھ کر

بھیجی

چوں چتر سجری رخ بختم سیاہ باد

در دل اگر بود ہوس ملک بخرم

(مثل شاہ سنجر کے اس سیاہ چھتری کے جو اس کے سر پر لگائی

جاتی تھی ہمارا نصیبہ سیاہ ہو جاوے اگر ہمارے دل میں ملک سنجر کی ہوس درکھی ہو)

اس زمانہ میں ان سلاطین کا پرچم سیاہ رنگ کا ہوا کرتا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ

اگر مجھ کو ملک سنجر کی ہوس ہو تو چتر سجری کی طرح میرا بخت سیاہ ہو جائے

زانکہ کہ یا فتم خبر از ملک نیم شب

من ملک نیمروز بیک جوئی خرم

(جس وقت سے ہم کو آدھی رات (نماز تہجد) کی دولت کی خبر لگ گئی ہے

میں ملک نیمروز کو ایک جو کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوں)

ملک نیم شب اور نیمروز میں صنعت تقابل کس قدر عجیب ہے۔ ان حضرات کے کلام

میں علاوہ باطنی صولت و شوکت کے ظاہری خوبیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ آخر وہ

لیا چیز تھی جس نے ان حضرات کے دل کو سلطنت سے اس درجہ بے نیاز کر دیا

تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو دنیا میں بھی وہ نعمتیں ملتی ہیں جن کا اہل دنیا کو

خطرہ بھی نہیں گذرا اسی طرح ایک اور بزرگ کا قصہ ہے جو اہل دلال میں سے تھے

مگر اہل ضلال میں سے نہ تھے یہ ایک حال ہوتا ہے جو متوسطان سلوک پر وارد ہوتا

ہے کالمین اہل دلال نہیں ہوتے ان میں عجز و نیاز غالب ہوتا ہے ہاں وسط سلوک

میں بعض لوگوں پر غلبہ بسط سے دلال کا حال وارد ہو جاتا ہے وہ اس وقت ناز

میں آکر بعضی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو دوسرا اگر کہے تو مردود ہو جاوے۔

مولانا فرماتے ہیں ۵

چوں نداری گرد ہد خوئی مگرد

عیب باشد چشم نابینا و یاز

جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

۱ ناز را روے بساید ہجو درد

۲ زشت باشد روئے نازیبا و ناز

۳ پیش یوسف نازش و خوبی مکن

(ترجمہ) عا ناز کے لئے چہرہ مثل گلاب کے پھول کے چاہئے جب تو ایسا چہرہ نہیں رکھتا ہے تو بد خوئی کے قریب بھی نہ جائیو۔

۲۷ بری صورت کے لئے ناز کرنا برا معلوم ہوتا ہے جس طرح کہ نابینا کا اپنی آنکھوں کا کھلا رکھنا برا معلوم ہوتا ہے۔

۲۸ یوسف کے سامنے ناز اور خوبی مت دکھا ہوائے نیاز مندی اور آہ یعقوبی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

یعنی ناز کے لئے بھی سمجھنا چاہیے۔ ہر ایک کا منہ ناز کے قابل نہیں ہوتا اگر کسی کو یہ حال حاصل ہو اس کے لئے ناز بجا ہے اور اگر حال نہ ہو تو بجز آہ و نیاز کے کچھ مناسب نہیں اور کبھی تو اہل دلال کی بات سن کی جاتی ہے اور گاہے اُن کی گوش مالی بھی کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ بزرگ اہل دلال میں سے تھے۔ ایک مرتبہ دن میں وہ کسی شہر پر گزرے دیکھا تو شہر پناہ کا دروازہ بند تھا دربانوں سے پوچھا کہ بھائی یہ دن میں دروازہ کس لئے بند کیا گیا ہے انہوں نے کہا کہ بادشاہ کا بازار ڈگیا ہے اس لئے اس نے حکم دیا ہے کہ شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں کہیں دروازوں سے نکل کر نہ بھاگ جاوے۔ یہ قصہ سن کر وہ بزرگ بہت ہنسے کہ معلوم ہوتا ہے بادشاہ عقل سے بالکل ہی کورا ہے بھلا بازو دروازے سے کیا نسبت وہ اگر بھاگنا چاہے گا تو اوپر سے اڑ جائے گا دروازے بند کرنے سے اس کی کیا روک ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہنس کر آسمان کی طرف منہ کیا اور حق تعالیٰ سے عرض کی کہ اچھے احمق کو آپ نے بادشاہت دی ہے۔ جس کو اتنی بھی عقل نہیں کہ بازو دروازے سے جا یا کرتا ہے یا اوپر سے اور ہم تو اتنے عاقل ہیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ نہ پیر میں جو تہ درست ہے نہ لباس اچھا ہے فوراً ادھر سے عتاب ہوا کہ بہت اچھا ہم آپ کو بھی سلطنت دیئے دیتے ہیں لیکن کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہاری معرفت اور ولایت اور تمام کمالات مع تمہارے فقرو و فاقہ کے اس بادشاہ دیدیئے جائیں اور اس کی سلطنت وغیرہ مع اس کی

حماقت کے اس کو دیدی جائے۔ بس یہ عتاب سن کر ان بزرگ کا رنگ زرد ہو گیا اور جلال خداوندی سے ڈر گئے فوراً سجدہ میں گر پڑے اور عرض کرنے لگے کہ میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہوں پھر ایسی گستاخی نہ ہوگی میں اپنی نعمتوں کو ہزار سلطنتوں کے بدلے میں بھی دینا گوارا نہیں کر سکتا۔ خوب کہا ہے ۷

لضیقتنا قسمة الجبار فیتا لنا علم و للجهال مال

فان المال یفنی عن قریب و ان العلم باق لا یزال

ہم خدا کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمارے لئے علم و معرفت ہو اور جاہلوں کے پاس مال و دولت ہے کیونکہ مال و دولت تو عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم و معرفت کیلئے فنا نہیں ہے۔ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ دنیا میں نہیں ملتا وہ اس حکایت میں غور کریں کہ ان بزرگ نے فقر و فاقہ کو کیوں گوارا کیا اور ملنے والی سلطنت پر کیوں لات مار دی آخر وہ کوئی نعمت تھی جس کے سلب ہو جانے کا نام سن کر وہ لرز گئے۔ کانپ اٹھے اور سلطنت کے بدلے میں بھی اس کو دینا گوارا کیا۔

صاحبو! خدا کی قسم جن لوگوں کو اس دولت کی خیر ہوگئی ہے ان کی مستی کی کچھ حد نہیں وہ سلطنت و غیرہ کو مجھ کے پر کی برابر بھی نہیں سمجھتے ۷

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند

فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ دین کے کاموں کا ثمرہ آخرت میں تو ملتا ہی ہے اس کو تو سب تسلیم کرتے ہیں دنیا میں بھی اعمال سے زیادہ ملتا ہے اور ایسی ایسی نعمتیں ان پر فائز ہوتی ہیں جن کے سامنے اہل دنیا کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔ پس دین کا مقصود ہوتا بھی معلوم ہے اس کا طریق بھی معلوم ہے اور وہ طریق آسان بھی بہت ہے اور طریق پر مقصود کا ترتیب بھی لہنتی ہے اور دنیا و آخرت میں امید سے بھی زیادہ ثمرہ اس پر مرتب ہوتا ہے اور چوتھی بات یہ ہے کہ اس کے ثمرات دائم بھی ہیں اور دنیا کے ثمرات فانی ہیں مگر باوجود اس کے حیرت در حیرت ہے کہ لوگ

اس کے لئے سعی نہیں کرتے اور اس کے لئے اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔ جو لوگ کچھ سعی کرتے بھی ہیں وہ محض تمنا کا درجہ رکھتے ہیں اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔ حالانکہ دنیوی امور میں محض تمنا بلا اسباب کو سب لوگ حماقت اور پاگل پن سمجھتے ہیں مگر نہ معلوم دین کے معاملہ ہی میں کیوں سب کی عقلیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ پس اسکو سعی سمجھ لیا ہے کہ تھوڑی دیر بزرگوں کے پاس بیٹھ کر ولے یا وعظ میں آسو یہاں سو یاد رکھو محض رونے سے کچھ نہیں ہوتا کام کو اُس کے طریقہ سے کرنا چاہیے۔

عرفی اگر بگر یہ میتر شدے وصال

صد سال می تو اوں بتنا گریستن

اے عرفی اگر صرف رونے سے وصال اور قرب مل جاتا تو سو برس تک ہم رونے کی تمنا کرتے۔

ان لوگوں کی اس تمنا کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی صاحب بزرگوں سے جا کر کہیں کہ حضور دعا کیجئے ہمارے لڑکا ہو جاوے مگر یہ حضرت نکاح کرتے نہیں تو اب بتلائے ان کے لڑکا کہاں سے ہو۔ اسی طرح ان کا یہ کہتا کہ حضور دعا کر دیجئے ہم بھی دین میں کامل ہو جائیں مگر جو اس کا طریقہ ہے اس کو اختیار نہیں کرتے تو یہ لغو حرکت ہے یا نہیں۔ یاد رکھو ہر کام طریقہ ہی سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَتُوا الْبَيُوتَ مِنْ ابْوَابِهَا گو شانِ نزول اس کا خاص ہے مگر اعتبارِ عموم الفاظ کا ہوتا ہے اس لئے یہ حکم عام ہے۔ پس دین ایک گھر ہے اور اس کا دروازہ وہ طریق ہیں جو شریعت نے بتلائے ہیں اس دروازہ سے داخل ہو گئے جیسی دین کامل ہو سکتا ہے۔ مولانا اس مضمون کو نظم میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اطلبوا الارزاق من اسبابہا

وادخلوا الابیات من ابوابہا

رزق کو حاصل کرو اس کے اسباب سے اور گھروں میں داخل ہو

اس کے دروازوں سے)



اطلبوا الارزاق کو پہلے بیان فرمایا جس میں نظیر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح تم رزق کے واسطے اسباب کو اختیار کرتے ہو اسی طرح دین کے لئے بھی اس کے طریقے اختیار کرو۔ آپ دین کے کام کرنا شروع کریں۔ ان شاء اللہ دروازہ خود بخود کھل جائیگا اور پھر آپ کو دین کے ثمرات بھی حاصل ہو جائیں گے جن میں ایک ثمرہ یہ ہے کہ آپ کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جائے گا زندگی پر لطف ہو جائے گی باقی وہ دولت باطنیہ جو اہل اللہ کو حاصل ہے اس کی کیفیت میں آپ کو بتلا نہیں سکتا کیونکہ وہ ذوقی چیز ہے جس کو اہل ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دین کے کاموں میں لگئے۔ ان شاء اللہ آپ کو بھی وہ ذوق ہوتا ہے اور اس سے پہلے کتنا ہی سمجھایا جائے آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اہل اللہ کو کیا دولت عطا ہوتی ہے نامرد کو عورت کی لذت کا کبھی ادراک نہیں ہو سکتا گو اس کے سامنے کتنی ہی وضاحت کر دی جائے۔ یہاں جب خدا کرے گا اس کو اس مرض سے شفا ہو جائے گی۔ اس وقت وہ خود بخود اس لذت کو سمجھ جائے گا۔ پھر کسی کے بتلانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ پس خدا کے لئے آپ اس بے حسی کا علاج کیجئے۔ کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو مگر علاج شرط ہے اور طریقہ پر عمل کرنا ایک فرق دنیا اور دین میں اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ دنیوی مقاصد کے حصول کا وعدہ بدون سعی کے بھی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ ہر جاندار کی روزی خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے جو بدون سعی کے بھی اس کو مل سکتی ہے مگر اس پر بھی لوگ دنیوی مقاصد میں سعی کو ضروری سمجھتے ہیں اور آخرت کے ثمرات کا وعدہ تو بدون سعی کے ہے ہی نہیں چنانچہ صاف ارشاد ہے مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ پھر تعجب ہے کہ لوگ دین میں سعی کو کس لئے ضروری نہیں سمجھتے جبکہ بدون سعی کے اس کے حصول کا وعدہ نہیں اہل اللہ نے اس فرق پر نظر کر کے دنیوی مقاصد کے لئے سعی کو ترک کر دیا ہے

وہ کہتے ہیں کہ روزی کا ذمہ تو حق تعالیٰ نے لے لیا ہے اس کے لئے سعی کی کیا ضرورت ہے اور دین کے کاموں کو ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے ہم کو اس کیسے سعی کرنا چاہیے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی نماز کا سلام پھیر کر امام صاحب نے ان بزرگ سے ملاقات کی اور یہ سوال کیا کہ آپ کھاتے پیتے کہاں سے ہیں کیونکہ آپ کوئی کام کسب وغیرہ کا نہیں کرتے۔ بزرگ نے فرمایا کہ ذرا اٹھریئے میں آپ کے سوال کا جواب ابھی دیتا ہوں یہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی سلام پھیر کر فرمایا کہ اب پوچھئے آپ کیا پوچھتے ہیں امام نے کہا اب تو مجھے ایک سوال اور پیدا ہو گیا وہ یہ کہ آپ نے یہ نماز دوبارہ کیسی پڑھی ہے آپ تو ابھی نماز سے فارغ ہو چکے تھے فرمایا کہ میں نے اُس نماز کا اعادہ کیا ہے کیونکہ مجھے آپ کے سوال سے یہ شبہ ہو گیا تھا کہ شاید آپ کو خدا تعالیٰ کے اس ارشاد پر یقین نہیں وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا تُوَجَّهْتُ إِلَى اللَّهِ فِي الْيَوْمِ هَذَا فِي الْبَيْتِ الْمَقَامِ اس لئے میں نے جلدی سے اپنی نماز کا اعادہ کیا کہ مبادا کہیں موت نہ آجائے اور یہ نماز میرے ذمہ ہی رہے اس کے بعد فرمایا کہ بتدہ خدا کیا روزی کا ملنا کمانے ہی پر موقوف ہے حالانکہ خدا تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ روزی میرے ذمہ ہے پھر تمھارے قلب میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا کیا تم کو خدا کے اس ارشاد پر اعتماد نہیں وہ امام بہت شرمندہ ہوئے۔

ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے کہ دنیا خدا کا ایک گھر ہے اور ہم یہاں مہمان ہیں اور حدیث میں وارد ہے الضیافة ثلاثتہ ایام کہ مہمانی تین دن تک کرنی چاہیئے جب ہم دنیا میں آئے تو تین دن تک تو ہم خدا تعالیٰ کے مہمان ہیں اور خدا تعالیٰ کے یہاں ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے  
وَأَنْتَ يَوْمَ عَرَشِ رَبِّكَ كَأَنْتَ بِنِعْمَتِنَا تَعْدُوْنَ تو ہم کو تین ہزار سال

کے لئے تو بالکل بے فکری ہے اگر اس سے زیادہ عمر ہوئی تو پھر کچھ انتظام سوچ لیا جائے گا۔ ظاہر میں یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر اس سے اہل اللہ کے مذاق کا پتہ چلتا ہے کہ دنیوی کاموں میں وہ سعی اور اہتمام کو ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ روزی کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود لے لیا ہے لیکن اعمالِ آخرت کا انہوں نے ذمہ نہیں لیا۔ اگر تم آخرت کے لئے ارادہ و سعی نہ کرو جب بھی وہ تم کو جنت دیدیں گے یا کہ از خود تم سے جنت کے کام لے لیں گے بلکہ اگر اس کے متعلق تو یہ ارشاد ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ اور ارشاد ہے۔

أَنْتُمْ لَكُمْ مَوَاطِنُ لَهَا كَارِهُونَ۔ اور رزق کے بارے میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وارد ہے وَمَنْ كَانَ لَهُ رِزْقٌ فِي رَأْسِ جَبَلٍ أَوْ حَضْبٍ يَأْتِ بِهِ اللَّهُ

گہرے ستانی پستہ میرسد۔ پھر حیرت ہے کہ اتنے فرقوں کے ہوتے ہوئے ہم کو اعمالِ آخرت کی فکر نہیں اور دنیا کی فکر ہے حالانکہ ان فرقوں کے ہوتے ہوئے دنیا کسی درجہ میں بھی توجہ کے قابل نہیں اور ان کا مقتضا تو یہ تھا کہ دنیا کے لئے سعی اور عمل کو ناجائز ہی کر دیا جاتا مگر خدا تعالیٰ کی شفقت و رحمت ہے کہ انہوں نے ہمارے ضعف پر نظر فرما کر دنیا کے لئے بھی اسباب اختیار کرتے کی اجازت دیدی ہے اور صرف اجازت بھی نہیں بلکہ بعض مواقع میں دنیا کے لئے سعی کو فرض کر دیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ کہ حلال روزی کا طلب کرنا بھی فریضہ شرعی کے بعد ایک فرض ہے بلکہ حکماء امت تو یہاں تک ان اسباب کی رعایت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حرام ملازمت میں بھی گرفتار ہو اور قرأت سے ان کو اس کا ضعیف الہمت ہونا معلوم ہو تو اس کو فوراً حرام ملازمت چھوڑنے کا امر نہیں فرماتے بلکہ یہ فرمادیتے ہیں کہ پہلے کوئی حلال ملازمت تلاش کر لو اس کے بعد اس کو چھوڑنا اور جب تک حلال ملازمت نہ ملے اسی میں گرفتار رہو اپنے کو گنہگار سمجھتے رہو اور خدا تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو کیونکہ بعض لوگ تنگی معاش سے گھبرا کر عیسائی یا آریہ، قادیانی ہو گئے ہیں

اہل باطل اپنے گروہ میں بلانے کے لئے لوگوں کو طرح طرح کی طمع دلاتے ہیں جن کے سامنے فقر و فاقہ کے ساتھ اپنے دین پر جھار ہٹا ہمت والوں کا کام ہے بعض لوگ تنگی معاش سے پریشان ہو کر پیری مریدی کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں اور مخلوق کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ع اور خویشتن گم ست کہ راہبری کندہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے جو پیر بنے پھرتے ہیں کہ اپنے گھر پر آکر وہ نماز بھی نہیں پڑھتے اور یا ہر جا کر مقدس بن جاتے ہیں۔ اور ایک واقعہ تو ایسا سنگین سنتے میں آیا جس کی نظر نہیں سنی گئی۔

میرے ایک دوست مولوی بیان کرتے تھے کہ ہندوستان سے ایک جاہل شخص ضلع بردوان میں جا کر پیری مریدی کرتا تھا۔ یہ شخص ضلع الہ آباد کا رہنے والا تھا اور تکیہ دار فقیر تھا۔ بردوان کے ایک رئیس اس کے پھندے میں پھنس گئے ان رئیسوں کو اکثر دنیا کی ہی عقل ہوتی ہے، دین کی عقل نہیں ہوتی اس لئے جاہل درویشوں اور طریق کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں اکثر رؤسا اور مالدار لوگ ہی پھنستے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش کی طرف زیادہ رجوع اہل دنیا کا ہو وہ درویش نہیں بلکہ دنیا دار ہے کیونکہ قاعدہ ہے الجحس یمیل الی الجحس۔ اگر اس میں دین کا ہل ہوتا تو دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ رجوع کرتے۔ چنانچہ حدیث ہرقل میں بھی مضمون آیا ہے۔ ہرقل نے ابوسفیان سے دریافت کیا کہ نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع زیادہ ترکون لوگ کرتے ہیں اغنیاء یا ضعفاء تو انہوں نے جواب دیا کہ زیادہ تر ضعفاء اتباع کرتے ہیں تو ہرقل نے اس پر کہا ہم اتباع الرسل کہ رسولوں کا اتباع کرتے والے ضعفاء ہی ہوتے ہیں چونکہ حضرات صحابہؓ نے ہرقل کے اس قول پر اذکار نہیں کیا بلکہ سکوت فرمایا اس لئے تقریر صحابہؓ کی وجہ سے یہ قول حجت ہو گیا (۱۲ جامع) الحمد للہ کہ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں زیادہ تر غرباء و طلباء ہی کی جماعت ہے رؤسا و امراء کم ہیں (اور جو رؤسا ہیں بھی وہ عقلا اور دیندار ہیں بد دین اور کم عقل نہیں ہیں دینداری کی وجہ سے وہ نعم الامیر علی باب الفقیر کے مصداق ہیں (۱۲ جامع)

غرض ایک بار وہ بنگالی رئیس کسی کام سے ہندوستان آئے الہ آباد پہنچ کر ان کو اپنے مرشد سے ملنے کا اشتیاق ہوا اس کے گاؤں میں پہنچ کر کوئی چودہری چارپائی بچھائے بیٹھے تھے ان سے بڑی تعظیم کے ساتھ اس کا نام لیکر دریافت کیا کہ وہ کہاں رہتے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ تو تکیہ دار فقیر ہے آپ اس کے ہاتھ میں کہاں بھنس گئے وہ بنگالی صاحب بولے کہ آپ جو چاہیں کہیں میرے تو وہ مالک اور مرشد ہیں وہ سمجھ گئے کہ بیچارہ عقل سے کورا ہے انہوں نے اپنے کسی نوکر سے کہا کہ فلا نے تکیہ دار کو پکڑ لالا۔ بنگالی رئیس نے کہا کہ حضور کے ساتھ ایسی گستاخی مجھ کو زیبا نہیں میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا آپ صرف اتنا کام کر دیجئے کہ راستہ بتلانے کے لئے خادم کو میرے ساتھ کر دیجئے انہوں نے خادم کو ساتھ کر دیا وہ ایک تکیہ میں رہتا تھا وہاں پہنچے اور بڑی تعظیم سے سلام و کلام کیا اس کی حالت یہ تھی کہ تکیہ میں اس کے پاس چند بد معاش رہتے تھے اور ہر وقت بھنگ و غیرہ پیتا رہتا تھا۔ ان رئیس صاحب کا اعتقاد اس حالت کے مشابہہ سے بھی نہ گیا۔ یہ پیری ایسا پیشہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کسی کے تقدس کا اعتقاد ہو جاوے تو پھر بیوی تیزہ کے وضو کی طرح وہ تقدس کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ تیزہ ایک فاحشہ تھی جو نماز بھی نہ پڑھتی تھی۔ ایک بزرگ نے اس کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا دیا نماز کی ترکیب بتلا دی جب سال بھر گزر گیا تو وہ بزرگ پھر آئے اور بی تیزہ سے پوچھا کہ نماز بھی پڑھتی ہو کہا حضور روزانہ پڑھتی ہوں پوچھا وضو بھی کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ حضور نے تو وضو کرا دیا تھا اسی وضو سے اب تک نماز پڑھتی رہی ہوں تو جس طرح بی تیزہ کا وضو نہ پیشاب پاخانہ سے ٹوٹتا تھا نہ زنا اور کاری سے وضو کیا لوہا لٹ تھا، اسی طرح آجکل کی پیری جب چل جاتی ہے تو وہ شراب و خمر سے ایسے ٹوٹتی ہے نہ زنا کاری سے نہ صوم و صلوٰۃ کے چھوڑنے سے نہ ڈاڑھی منڈانے سے نہ ننگا پھرنے سے بلکہ اگر کوئی لنگوٹ بھی اتار پھینکے تو اس کے اور نہ زیادہ معتقد ہوتے ہیں۔ اگر پیر صاحب خاموش رہیں تو چپ شاہ بلکہ قناتی اللہ ہیں۔ اگر اینڈی بینڈی باتیں ہانکنے لگیں تو رموز ہیں گو وہ کفریات ہی کیوں نہ ہوں اور

کوئی ٹھیک بات کہدی تو عارف اور محقق ہیں اور منشاء اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات جم رہی ہے کہ شریعت اور ہے طریقت اور ہے اس لئے اگر کوئی شخص ظاہر میں شریعت کے بالکل خلاف ہو اس سے بھی ان کا اعتقاد زائل نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ بھی طریقت کا کوئی رمز ہوگا۔ استغفر اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ غرض اس فقیر نے چند روز تک ان رئیس صاحب کی دعوت کی آرام سے اپنے پاس رکھا۔ دو چار دن رہ کر رئیس نے واپسی کی اجازت چاہی فقیر نے اجازت دی اور کہا میں اسٹیشن تک آپ کو خود پہنچا دوں گا چنانچہ وہ اور اس کے بھائی اسٹیشن تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہوئے اور اس کو ایسے راستے سے لے چلے جہاں آدمی بہت کم چلتے تھے جب چلتے چلتے دیر ہو گئی تو رئیس کو خطرہ ہوا اس نے کہا کہ حضور یہ تو وہ راستہ نہیں جس سے میں آیا تھا کہنے لگا کہ میں آپ کو قریب کے راستے سے باہر باہر لے چلتا ہوں۔ یہ غریب خاموش ہو گیا یہاں تک کہ ایک ایسے بن میں اس کو جا پہنچا یا جہاں نہ آدمی کا پتہ نہ جانور کا اگر آدمی گلے پھاڑ پھاڑ کر بھی چلاوے تو بھی کوئی مدد کو نہ آسکے وہاں پہنچ کر فقیر نے کہا جو کچھ ساتھ لے رہے ہو رکھو اس بے چارہ نے جو کچھ ساتھ تھا رکھ دیا کہا کپڑے بھی اتارو اس نے کپڑے بھی اتار دیئے۔ اس کے بعد اس نے رئیس کے قتل کا ارادہ کیا اس نے بہت کچھ ہاتھ پیر جوڑے اور خوشامدیں کیں کہ آپ مجھے قتل نہ کریں میں اس سے دو چتر اور چند روپیہ گھر جا کر بھیج دوں گا، کہنے لگا کہ اب تمہارا زندہ چھوڑنا مصلحت نہیں تم ہمارا راز کھول دو گے۔ اس نے بہت قسمیں کھائیں کہ میں کسی سے یہ معاملہ ظاہر نہ کروں گا مگر اس سنگدل نے ایک نہ سنی اور اس غریب کا کام تمام کر دیا اور نعش کو ایک کنویں میں پھینک دیا کتنے دنوں کے بعد اتفاقاً ایک چرواہا اس کنویں پر آیا تو اس کو کنویں میں سے بد بو آئی اس نے جھانک کر دیکھا تو ایک نعش تیرتی ہوئی نظر آئی اس نے فوراً پولیس کو اطلاع دی پولیس نے نعش کو نکالا تو اس کا پہچاننے والا وہاں کوئی نہ تھا مگر اس کی جیب میں سے کچھ کاغذات نکلے جنہیں

برودان کا پتہ لکھا ہوا تھا لیس اب کیا تھا پولیس کو پتہ چلانے کے واسطے اتنا کافی تھا سراغ لگاتے لگاتے رتب واقعہ منکشف ہو گیا پولیس نے اس فقیر کو پکڑا اور اس سے انہار لیا آخر اس نے اقرار کیا کہ میں نے اس کو قتل کیا ہے چنانچہ اس کو پھانسی دیکھی سو دیکھے تنگی معاش سے پریشان ہو کر انسان کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ بعض لوگ تنگی معاش سے پریشان ہو کر دوسری طرح حقوق العباد کو ضائع کرتے ہیں کسی سے قرض لے لیا اور مار لیا۔ کسی کی امانت لیکر اذکار کر دیا۔ کسی کی کوئی چیز مانگ لی اور اس کو رہن رکھ دیا اور بہت سے کرتب لوگ کرنے لگتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ حقوق العباد کے تلف کرنے کا ضرر متعدی ہے جو ضرر لازم سے اشد ہے اگر یہ شخص کسی حرام ملازمت میں مبتلا رہا بشرطیکہ اس ملازمت کا قرض منصبی کسی کا اصرار نہ ہو تو اپنا ہی نقصان کرے گا مخلوق کو تو پریشان نہ کرے گا لیکن اگر اس نے بدون حلال روزی تلاش کئے حرام ملازمت کو بھی چھوڑ دیا تو پھر دوسروں کو نقصان پہنچائے گا اس لئے حکمائے امت ان اسباب معیشت کی اتنی رعایت کرتے ہیں کہ حرام سبب کو بھی حکمت سے چھوڑواتے ہیں تو حلال سبب کو تو وہ کیوں چھڑاتے لگے بعض کم فہم لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ حرام ملازمت کی اجازت دے دی حالانکہ وہ حرام ملازمت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ اس کے ایمان کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت تو گستاہ ہی میں مبتلا ہے پھر کہیں ایمان سے بھی نہ ہاتھ دھولے نیز اس وقت تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے اس کو چھوڑ کر کہیں مخلوق کو پریشان میں ڈال دے اور قاعدہ فقہیہ ہے کہ مفسدہ سیرہ کو مفسدہ عظیمہ سے بچنے کے لئے گوارا کیا جاتا ہے لیکن اس قاعدہ سے کام لینے کا ہر ایک کو حق نہیں۔ اس کا موقع و محل محقق ہی سمجھ سکتا ہے خوب یاد رکھو۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسباب دنیا اسباب دین کے مقابلہ میں تو اس قابل نہیں کہ ان کے لئے سعی کی جائے نہ کہ ایسی سعی کریں کہ آخرت کی سعی کو بھی چھوڑ دیں مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اسباب دنیا کے اختیار کرنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے

بارہ میں اسباب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ پھر بعض لوگ جو دین ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ تو قابل خطاب ہی نہیں۔ شکایت تو ان لوگوں کی ہے جو دین کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں اور پھر اس کے اسباب اختیار نہیں کرتے۔ بزرگوں کے پاس آتے جاتے ہیں لیکن ان سے دین کا راستہ پوچھتے بڑی دوطرفہ انداز میں یہ ہے کہ بزرگوں سے جا کر عرض کرتے ہیں کہ ہم کو ایک توجہ سے کامیاب کر دیجئے گویا وہ بھی اسی طرح کامیاب ہو گئے تھے۔ میں کہتا ہوں اسی پر فیصلہ ہے اگر محض توجہ سے دین کامل ہو سکتا ہے تو ان بزرگ ہی سے پوچھ لو کہ حضور آپ بھی توجہ ہی سے کامیاب ہوئے تھے یا آپ کو کچھ کرنا بھی پڑا تھا اگر وہ محض توجہ سے کامیاب نہیں ہوئے تو پھر آپ کو ان سے ایسی درخواست کرنے کا کیا حق ہے۔ صاحبو! یہ سب نفس کے بہانے ہیں وہ آپ کو ان دھوکوں سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ اور منشاء اس کا محض کم ہمتی اور قلت ہمالاۃ بالذین ہے کہ ہم کو خدا کی طاعات میں وہ اہتمام نہیں جو دنیا کے کاموں میں ہے۔ بعض لوگ دھوپ کی وجہ سے جماعت کی نماز ترک کر دیتے ہیں لیکن اگر اس وقت حاکم بلاگ تو دھوپ کبھی مانع نہ ہو۔ عین دوپہر کے وقت حاکم کے پاس جا وینگے پھر وہاں سے آگر دھوپ کی کچھ شکایت نہ کریں گے بلکہ حاکم سے ملاقات کرنے پر فخر کریں گے کہ ہم سے آج خوب باتیں ہوئیں حاکم نے فتلاں مقدمہ کی بابت یوں سوالات کئے ہمارے فلاں معاملہ کے متعلق یوں کہا۔ حالانکہ یہ کوئی فخر کی بات نہ تھی آخر حاکم کون ہے تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ فخر کی بات تو یہ ہے کہ نماز میں حق تعالیٰ سے باتیں ہوتی ہیں ہم اس قابل تو کہاں تھے کہ خدا تعالیٰ ہم سے باتیں کریں واللہ ہم تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ہم ان کا نام ہی لیں۔

ہزار بار یشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست  
 اگر ہم ہزار بار بھی اپنے منہ کو مشک اور عرق گلاب سے دھولیں لیکن پھر بھی اے خدا  
 آپ کا نام پاک لینا کمال بے ادبی تھا مگر آپ کے کرم نے ہم کو اجازت دیدیا کہ ہمارا نام لیا کرو



مگر یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انھوں نے ہم کو اجازت دیدی کہ نماز میں جب چاہو ان سے باتیں کر لو۔ پھر وہ ہماری باتوں پر توجہ بھی فرماتے ہیں ہماری عرض و معروض کا جواب بھی دیتے ہیں۔ پھر نماز میں ہم کو قرآن پڑھنے کی اجازت دی بلکہ اس کو فرض کر دیا جو کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے گویا اس طرح حق تعالیٰ بھی ہم سے باتیں کرتے ہیں پھر یہ کس قدر رحمت ہے کہ ہم کو اسمِ علم سے پکارنے کی یعنی یا اللہ کہنے کی اجازت دی کہ ان کا نام لے کر ان کو پکار سکتے ہیں ذرا کسی حاکم کو تو نام لے کر پکارو۔ فوراً جرم قائم ہو جاوے گا پھر نام بھی اتنا آسان کہ بچہ سب سے پہلے اللہ کا نام یاد کر لیتا ہے۔ افسوس ایسے رحیم و کریم خدا سے باتیں کرنے کے لئے لوگوں کو دھوپ مانع ہوتی ہے اور بلا وجہ جماعت کی نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر ایک رحمت یہ ہے کہ وہ ہماری طاعات ناقصہ کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ باقی یہ بات کہ کیسے معلوم ہوا کہ ہماری یہ طاعات ناقصہ قبول ہوتی ہیں۔ سو حضرت حاجی حسناؒ نے قبول طاعات کی ایک علامت عجیب بیان فرمائی۔ فرمایا کہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کے آنے سے کسی کو ناگواری ہوا کرتی ہے تو اگر وہ قادر ہو تو دوسرے وقت اس کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیا کرتا تو یاد رکھو اگر حق تعالیٰ کو تمہاری پہلی عبادت ناگوار ہوئی ہوتی تو وہ دوسرے وقت تم کو مسجد میں نہ گھسنے دیتے نہ نماز کی توفیق دیتے۔ پس جب ایک نماز کے بعد دوسرے وقت تم کو پھر اسی نماز کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلے وقت کی نماز قبول ہو چکی اسی طرح تمام طاعات میں سمجھ لو۔ واقعی عجیب بات بیان فرمائی گو یہ حجت قطعہ نہ ہو مگر انا عند ظن عبدی بی کے ساتھ ملا کر امید ہے کہ اگر ہم حق تعالیٰ کے ساتھ یہی گمان رکھیں تو قبولیت کا اچھا قرینہ ہے۔ آخر کوئی توجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو تو پانچوں وقت مسجد میں آنے کی توفیق دیدی اور بہت سی مخلوق ایسی ہے جن کو سال میں ایک وقت آنے کی بھی توفیق نہیں دی معلوم ہوتا ہے خدا تعالیٰ کو ان کا مسجد میں آنا گوارا نہیں۔

(ان شاء اللہ باقی آیتہ)

ایک گنوار کا قصہ ہے کہ اس کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا۔ ملاحظہ ہونے لگا کہ لوگ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ کچھ کرتے ہیں اور جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں۔ گنوار نے ملا سے کہا کہ کیوں بڑ بڑ کرتا ہے جانور تھا مسجد میں گھس آیا کبھی ہم کو بھی آتے ہوئے دیکھا ہے۔ دیکھئے توفیق نہ ہونا اس کا نام ہے۔ اسی طرح ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ آقا اور غلام بازار میں کسی کام کو گئے تھے راستہ میں نماز کا وقت آگیا، غلام نمازی تھا اس نے آقا سے نماز کی اجازت مانگی اس نے اجازت دیدی کہ اچھا جلدی نماز پڑھ کر چلے آؤ میں مسجد کے باہر بیٹھا ہوا ہوں۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ غلام کو تو مسجد میں آنے کی اجازت دی گئی اور آقا کو باہر ہی سے روک دیا گیا۔ غلام نے آکر تمام پڑھی اور نہایت اطمینان سے فرض و نوافل کو پورا کیا حتیٰ کہ سب نمازی فارغ ہو کر چلے گئے اس کا آقا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اس نے ایک شخص سے جو سب کے آخر میں مسجد سے نکلا تھا پوچھا کہ اب مسجد میں کتنے آدمی ہیں کہا صرف ایک آدمی ہے وہ سمجھا کہ شاید اب جلدی آجائے گا۔ مگر غلام نے وہاں تہنائی میں کوئی وظیفہ شروع کر دیا پھر بھی نہ آیا آخر آقا نے تنگ ہو کر آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے باہر کیوں نہیں آتے، غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا آقا نے پوچھا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تم کو باہر سے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو اندر سے باہر نہیں جانے دیتا۔ سبحان اللہ خوب جواب دیا صاحبو!

توفیق الہی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دین کے کام وہی کرتا ہے جس کو خدا توفیق دیتا ہے اور یہاں سے اہل طاعات کو سبق لینا چاہیے اور ان کو اپنی طاعات پر غور نہ کرنا چاہیے نہ کسی محروم الطاعت کو حقیر سمجھنا چاہیے کیونکہ تم جو کچھ کر رہے ہو محض توفیق الہی سے کر رہے ہو اپنا کما امت سمجھو بلکہ ڈرتے رہو کہ ہمیں حق تعالیٰ تم سے یہ توفیق سلب نہ کر لیں جس طرح دوسروں سے سلب کر لی ہے۔ (اللہم

انا نعوذ بك من المحور بعد الكور ۱۳)

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں

غرض مسئلہ توفیق پر نظر کرنے سے حضرت حاجی صاحب نے قبول طاعت کی جو علامت بیان فرمائی ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور اس سے حق تعالیٰ کی رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بہت ہی رحمت ہے کیونکہ ہم لوگ جیسی نماز پڑھتے ہیں ظاہر ہے نہ خضوع ہے نہ خشوع نہ ذکر ہے نہ فکر۔ بس گھڑی کی کوک ہے جس سے سوئی خود بخود چل رہی ہے۔ دنیا بھر کے خیالات نماز ہی میں ہم کو سوچتے ہیں مگر بقاعدہ مذکورہ بھی قبول ہوتی معلوم ہوتی ہے تو اس رحمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ بھلا تم کسی حاکم کے سامنے کھڑے ہو کر تو دوسری طرف توجہ کرالو جو فوراً دربار سے نہ نکال دیئے جاؤ۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

اس قبول ذکر تو از رحمت ست

چوں نماز مستحاضہ رخصت ست

دائے خدا آپ کا ہمارے ذکر کو قبول فرمالینا آپ کی رحمت ہے جس طرح سے استحاضہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی آپ نے اجازت عطا فرمادی ہے، واقعی خوب مثال دی کہ جیسے مستحاضہ کی نماز محض رحمت سے قبول ہوتی ہے حالانکہ اس کو نہ طہارت حاصل ہے نہ تطافت خون ٹپک رہا ہے اور نہ رعیت فتویٰ دیتی ہے کہ کچھ حرج نہیں نماز پڑھے جاؤ سب قبول ہے۔ یہی حال ہماری نمازوں کا ہے۔ مگر اس رحمت کا حال معلوم کر کے بے فکر نہ ہونا چاہیے کہ جس جب وہ ہر طرح قبول کر لیتے ہیں تو خشوع و خضوع کی کیا ضرورت ہے کیونکہ اس حالت میں نماز کا قبول ہونا قاعدہ کے خلاف ہے۔ قاعدہ وہی ہے کہ نماز جبھی قبول ہوگی جبکہ واجبات و شرائط کے ساتھ ادا کی جائے بعض علماء کا قول ہے کہ خشوع و خضوع نماز میں فرض ہے اور بعض نے اس کو سنت کہا ہے۔ بہر حال بے فکری کسی حال میں نہیں ہونی چاہیے غیرت مند طبائع تو اس رحمت و شفقت کا حال معلوم کر کے مارے شرم کے گرے جاتے ہیں کہ افسوس ادھر سے

اتنی توجہ اور ہماری طرف سے ایسی بے رحمی مر جانے کی جگہ ہے اور شرم سے اور لڑاؤ سخی اور خدمت کرتے ہیں الغرض دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ دین کو دنیا پر بہت سے وجوہ سے ترجیح ہے اور دنیا کے کاموں میں اسباب و طرق کے اختیار کرنے کی ضرورت عقلاء کے نزدیک مسلم ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دین کے اسباب اختیار نہیں کئے جاتے۔ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ ناکامی کا راز عدم علم مقصود ہوتا ہے یا عدم تعین طریق و صعوبت طریق۔ یا عدم ترتیب مقصود علی الطریق۔ اور جہاں ان میں سے کسی کا وجود نہ ہو وہاں ناکامی کا سبب بجز کم ہمتی اور سستی اور کاہلی کے کچھ نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ جو لوگ دین میں ناکام ہیں وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام ہیں اس کے سوا کوئی سبب ناکامی کا نہیں نکل سکتا کیونکہ دین کا مقصود ہونا معلوم اس کا طریق بھی معلوم۔ اور میں دعویٰ کے ساتھ اس کو بیان کر چکا ہوں کہ دین میں تنگی کچھ نہیں اس لئے صعوبت طریق بھی معدوم یہ بھی نصوص سے میں بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد دنیویہ کا ترتیب اسباب دنیویہ پر لازم نہیں مگر مقاصد دینیہ کا ترتیب اسباب دینیہ پر ضروری ہے کیونکہ نصوص میں اس کا وعدہ بطور جزم کے ہے بلکہ ترقی عطا کرنے کا بھی وعدہ ہے اور اعانت الہیہ کا بھی وعدہ ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی دین میں ناکام رہا تو اس کا سبب بجز بذختی اور کاہلی اور سستی کے کیا کہا جاوے۔ اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں بھی حق تعالیٰ نے اسی مقصود دینی کو بیان فرمایا ہے اور ایک اس کا طریق بتلایا ہے۔ آئندہ آپ کو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس آیت میں جو طریق حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وہ کتنا سہل اور آسان طریق ہے جس سے زیادہ آسان کوئی دوسرا طریق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تفصیل سے پہلے میں آیت کی تفسیر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا**

مع الصدقین ۱۵ اس آیت کے دو جزو ہیں۔ (۱) اتقوا اللہ (۲) کونوا  
 مع الصدقین۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ دو جملوں میں دریا کو بھر دیا ہے۔  
 چنانچہ ابھی تفصیل معلوم کر لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ  
 ان دو جملوں میں کتنے بڑے مضمون کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔  
 قرآن کے جملوں کی تفسیر مختلف عنوانات سے ہو سکتی ہے اس لئے ممکن  
 ہے کہ اس آیت میں بھی کسی مفسر نے دوسرا عنوان اختیار کیا ہو مگر وہ اختلافاً  
 محض عنوان ہی کا ہوتا ہے معنوں میں ایک ہوتا ہے۔ اس آیت کا جو معنوں  
 میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اتقوا اللہ میں مقصود کا ذکر ہے اور کونوا مع  
 الصدقین میں اس مقصود کے طریق کا ذکر ہے کیونکہ جن لوگوں نے قرآن کو  
 نظر غائر دیکھا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ قرآن میں مقاصد کے  
 ساتھ طرق کا ذکر بھی اکثر فرما دیا کرتے ہیں اور یہ ان کی غایت شفقت و رحمت  
 ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کسی بات کا حکم فرما کر حیران و پریشان نہیں چھوڑتے  
 بلکہ اس کا طریق بھی ساتھ کے ساتھ بتلا دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح سے ہوگا  
 یہ طریقہ اختیار کرو۔ اس عادت پر نظر کر کے میرا ذوق یہ بتلاتا ہے کہ اس  
 آیت میں بھی جملہ اولیٰ میں مقصود کا بیان ہے اور ثانیہ میں طریق کا یعنی تقویٰ  
 مقصود ہے اور معیت صادقین اس کے حصول کا طریق ہے۔ عبارت دیگر  
 یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا امر فرمایا ہے اور معیت کاملین  
 اس کا طریق بتلایا ہے اس کو میں آگے چل کر واضح کر دوں گا کہ تقویٰ کی تفسیر  
 کمال دین ہے یا نہیں۔ اس وقت میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ کمال دین مقصود  
 و مطلوب ہے یا نہیں تو سمجھ لیجئے کہ مقاصد میں ہمیشہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے  
 ناقص حالت میں کوئی قناعت نہیں کرتا۔ تجارت کرتے ہیں تو اس میں بھی کمال  
 مطلوب ہوتا ہے۔ لاکھ دو لاکھ پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ جس قدر ترقی ہو اس سے  
 آگے کے طالب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی نہیں کرتا کہ جب ضرورت سے زیادہ

آمدنی ہو جائے تو آئندہ کے لئے سعی اور کوشش چھوڑ دے۔ نہیں بلکہ قسم قسم کی تجارتیں نئی نئی شروع کر دیتے ہیں اگر ایک شخص کے یہاں بساط خانہ کی تجارت ہے۔ اور اس سے معقول آمدنی ہو رہے ہے تو سرمایہ زیادہ ہو جانے کے بعد وہ کپڑے کی بھی ایک دوکان کھول دیتا ہے اور ترقی ہوئی تو جو تلوں کی دوکان بھی کر لیتا ہے یہاں تک کہ پہلے اگر باپ بیٹے سب مل کر ایک دوکان کر رہے تھے تو اب ہر بیٹے کی الگ دوکان کھول دی جاتی ہے چنانچہ مشاہدہ ہے پھر بہت سے مکان خرید کر ایہ پر دیدیئے جاتے ہیں۔ غرض ہر وقت ترقی کی دھن لگی رہتی ہے کسی حد پر بس نہیں کرتے وہ حال ہو جاتا ہے۔

ع: لا ینتھی ارب الا الی ارب + اگر کسی کے پاس ضرورت کے موافق زمین موجود ہو تو وہ اس پر قناعت نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اس فنکر میں رہتا ہے کہ آج ایک گاؤں پورا خرید لوں، ایک گاؤں خریدنے کے بعد دوسرے گاؤں کی تمنا رہتی ہے۔

ملک اقلیم اربگیر دیادشاہ

ہمچناں در بند اقلیمے دگر

(ایک ملک اگر بادشاہ لے لیتا ہے لیکن وہ قناعت سے محروم ہونے

کے سبب دوسرے ملک کے حرص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔)

غرض انسان دنیوی ترقی میں ہمیشہ زیادت کا طالب رہتا ہے یہاں تک کہ موت ہی سے یہ سلسلہ منقطع ہوتا ہے اس سے پہلے منقطع نہیں ہوتا۔ شیخ

سعودی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

گفت تنگ چشم دنیا دارا

یا قناعت پُرکت یا خاک گور

دکھا کہ دنیا دار کی تنگ نظر اور لالچ سے پُر نظر کو یا تو قناعت پُر

کر سکتی ہے یا قبر کی خاک پُر کر سکتی ہے)

دنیا دار کو قناعت تو ہوتی نہیں ہاں خاک گورہی سے اس کی ترس منقطع ہو جاتی ہے۔ شاید آپ مجھ کو کوئی ایسا آدمی دکھلائیں کہ جس نے دس ہزار روپیہ یا دس گاؤں حاصل کر کے بس کر دیا ہو اور آئندہ کے لئے سعی کو ختم کر دیا ہو۔ لیکن اول تو یہ بہت ہی شاذ ہے لاکھوں میں ایک آدمی ایسا ہوگا۔ والتاد کا معدوم۔ اگر لاکھوں میں ایک آدمی آپ نے ایسا دکھلا بھی دیا تو اس سے میرے بیان پر نقص وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ تو اعد میں اکثر کا لحاظ ہوا کرتا ہے اور اکثر کی حالت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ پھر میں کہتا ہوں کہ جو شخص ایسا آپ دکھلائیں گے وہ دیندار ہوگا دنیا دار نہ ہوگا اور گفتگو اہل دنیا کی حالت میں ہے اور اگر وہ دیندار بھی نہ ہو دنیا دار ہی ہو تو اس کا ایک سرسری جواب تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک۔ غالباً یہی لمسال ہوگا جب وہ کمال حاصل ہو گیا تو مقصود تک وصال ہو گیا اس سے آگے کوئی کمال اس کی نظر میں ہے ہی نہیں پس وہ بھی طالب کمال نکلا ناقص حالت پر اس نے بھی قناعت ہرگز نہیں کی۔ اور حقیقی جواب یہ ہے کہ گو اس نے صورت ترقی کو ختم کر دیا مگر معنًا وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے کیونکہ یہ شخص عاقل دنیا دار ہے نادان نہیں وہ دنیا کی روح کو سمجھ گیا ہے کہ اسباب معاش سے مقصود سکون قلب و راحت قلب ہے اور ہر وقت اسباب معاش میں لگے رہنے سے راحت و سکون قلب میسر نہیں ہوتا دل پر لیشان اور مشغول رہتا ہے اس لئے اس نے ایک معقول سرمایہ حاصل کر کے آئندہ کے لئے صورت ترقی کو بند کر دیا لیکن حقیقت میں وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے پہلے اسباب میں ترقی کر رہا تھا اب سبب اور مقصود میں ترقی کر رہا ہے یعنی راحت و آرام کے بڑھانے میں مشغول ہے غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیوی اسباب میں ہر شخص کمال کا طالب ہے کسی قدر حاصل پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی آگے کا طالب رہتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی خاص حد پر بس بھی کرتا ہے تو ناقص حالت

پہرہ بگڑ بس نہیں کرتا۔ بلکہ کوشش اور سعی کو ہمیشہ درجہ کمال پر پہنچا کر ختم کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو تجارت میں نقصان ہو رہا ہے تو اس حالت پر کوئی بھی سعی کو ختم نہ کرے گا۔ بلکہ جب اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جائے کہ وہ ساری عمر کو کافی ہو جاوے بلکہ بچ بھی جاوے اس وقت بعض لوگ سعی کو ختم کر سکتے ہیں پس یہ بات یقیناً معلوم ہو گئی کہ ناقص حالت پر کوئی بھی قناعت نہیں کرتا قناعت ہمیشہ حصول کمال ہی کے بعد ہوتی ہے گو وہ بھی قناعت صوری ہے ورنہ حقیقت میں اب بھی ترقی ختم نہیں ہوتی (جامع)

پھر حیرت ہے کہ دین میں لوگوں کو ناقص حالت پر قناعت کیوں ہے چنانچہ بڑی دینداری آج کل یہ ہے کہ نماز پانچوں وقت کی پڑھ لی جب نماز پڑھنا شروع کر دی تو اب وہ اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں اور اسی پر قناعت کر لیتے ہیں پھر افسوس یہ کہ جس نماز پر قناعت کی جاتی ہے وہ بھی کامل نہیں ہوتی یعنی اول تو محض نماز کے کامل کر لینے سے بھی دین کامل نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ نماز بھی کامل نہ ہونا ناقص در ناقص ہی ہو اس پر قناعت کر لینا تو بہت ہی کوتاہی ہے بعض نماز کے بعد زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں زکوٰۃ دیدی تو گویا انہوں نے جنت کو خرید لیا اور اگر حج بھی کر لیا تو پھر کیا تھا جنید وقت ہو گئے اب انہیں آگے ترقی کی کچھ ضرورت نہیں رہتی وہ اسی پر دین کو کامل سمجھ کر سعی اور ترقی بند کر دیتے ہیں عوام کی کیا شکایت کی جائے افسوس یہ ہے کہ بعض اہل علم بھی اس بلا میں گرفتار ہیں۔ ایک عالم نے مجھے لکھا کہ آپ نے جو وظیفہ وغیرہ مجھ کو بتلایا تھا وہ تو کر لیا اب آگے کچھ اور سبق بھی ہے یا بس ختم ہو گیا۔ افسوس دنیا مردار تو ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی حد پر بھی قناعت نہیں کی جاتی۔ اور دین کو ایسا حقیر سمجھ لیا ہے کہ چار دن کام کر کے اپنے کو کامل اور منتہی ہونے کا احتمال سوچنے لگا۔ مجھے ان عالم کا یہ خط سخت ناگوار ہوا اور میں سمجھا کہ ان کو دین کا ادب بھی بالکل نہیں کیونکہ ان کے الفاظ سے تمسخر ٹپکتا تھا میں نے ان کو لکھ دیا کہ



میرا تم سے نباہ نہ ہوگا میں تم کو قابل خطاب بھی نہیں سمجھتا تم کو نہ دین کی طلب ہے نہ اس کا ادب دل میں ہے **رَأَيْنَا لِلَّهِ وَرَأَيْنَا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** غرض لوگوں نے دین کو نماز و روزہ زکوٰۃ و حج میں منحصر سمجھ لیا ہے اس سے زیادہ کی وہ ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ جو شخص تقویٰ کامل اختیار کرے اور حقوق العباد و غیرہ کا پورا لحاظ کرے اور دین میں ترقی کا ارادہ کرے اس کو پاگل سمجھتے ہیں مگر وہ ایسا پاگل ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ۷

ادگل سرخ ست تو خوش محواں      مست عقل ست او تو مجنونس مداں

روہ گل سرخ (گلاب کا پھول) ہے تو اس کو خون مت سمجھ وہ مست عقل

نورانی ہے تو اس کو پاگل مت سمجھ

ما اگر قلاش دگر دیوانہ ایم      مست آن ساقی و آن پیانہ ایم

رہم اگر قلاش اور اگر دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے کیونکہ ہم اس

ساقی ازل کے مست ہیں اور اس پیانہ ازل کے مست ہیں

وہ خدا کے دیوانے ہیں جن کے لئے یہ دیوانگی فخر ہے ۷

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مرعس را دید و درخانہ نشد

رپاگل وہی ہے جو ان کا دیوانہ نہ ہو ان کو تو ال کو دیکھا اور گھر میں نہ چھپا

میرے ایک دوست پہلے ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن انہوں نے اپنی دین کی حفاظت

کے لئے صیغہ حکومت سے اپنا تبادلہ کر لیا ہے اب وہ تعلیم کی لین میں ہیں جس

میں تنخواہ ڈپٹی کلکٹری سے کم ہے۔ اس پر بہت لوگوں نے ان کو بیوقوف

بنایا کہ یہ بھی عجب دیوانے ہیں کہ اتنی بڑی تنخواہ چھوڑ کر مقصودی تنخواہ پر

قناعت کر لی اور حکومت کا عہدہ چھوڑ کر ذلیل عہدہ اختیار کیا۔ مگر جب

یہ لوگ خدا کے سامنے پہنچیں گے اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ بیوقوف

کون تھا۔

انہیں دوست کا یہ قصہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کرنے کو تھے ان کے ساتھ اُن کا ایک لڑکا بھی تھا وہ اس کی عمر دریافت کر رہے تھے کہ بارہ سال سے کم ہے یا پورے بارہ سال کی ہے اگر پورے بارہ سال کی ہے تو قاعدہ ریلوے کے موافق اس کا بھی ٹکٹ لیستا چاہیے۔ ان کے ساتھی کہہ رہے تھے کہ اس بچے کی عمر بارہ سال کی تھوڑا ہی ہے اور اگر ہو بھی تو اس کا تو بہت کم ہے دس سال کا معلوم ہوتا ہے اگر آپ ٹکٹ نہ لیں گے تب بھی کوئی کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ ریل والے کچھ نہ کہیں تو خدا تعالیٰ تو کہیں گے کہ تم نے ایک شخص کی چیز کو اس کی بلا اجازت بدون کرایہ دئے کیوں استعمال کیا۔ وہ لے چارے اس کی عمر کی تحقیق کر رہے تھے اور اُن کے نوکر ہنس رہے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ بچے کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہے تو انہوں نے اس کا بھی پورا ٹکٹ لیا۔ لوگ ان کو یہ رائے دیتے تھے کہ صاحب اگر آپ کے پاس یہ روپیہ ایسا ہی فضول ہے تو کسی غریب کو دیدیجئے ریل والوں کو آپ کیوں دیتے ہیں خصوصاً جبکہ وہ اس بچے کے ٹکٹ کا آپ سے سوال بھی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ جس غرض سے میں اس کی عمر دریافت کر رہا ہوں غریبوں کو روپیہ دینے سے وہ غرض حاصل نہ ہوگی۔ یعنی تصرف فی ملک الغیر بلا اذن غریبوں کو دینے سے جائز نہ ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں سب لوگ ان کو بیوقوف اور مجنوں سمجھ رہے تھے کہ فضول روپیہ ضائع کر رہے ہیں مگر وہ خدا کے مجنون تھے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب دین کا غلبہ ہوتا ہے تو مسلمان کو دنیوی مضرت کی پرواہ نہیں ہوا کرتی مگر یہ بات حکما راہی سے دریافت کرنے کی ہے کہ دین کے لئے کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کس جگہ غیر مناسب ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر مضرت دنیویہ کا تحمل کر لیستا چاہیے اور اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیے بلکہ اس میں تفصیل ہے (جس کا حاصل یہ ہے کہ جب شریعت کسی کام کو واجب کر دے یا کسی کام کو حرام کر دے تو واجب کے

ادا کرنے اور حرام سے بچنے میں اگر ہم کو کچھ دنیوی مضرت ایسی پہنچے جو مال یا آبرو کو ضرر پہنچانے والی ہو تو ہم کو اس مضرت کی پرواہ نہ کرنی چاہیے اور اگر ایسی مضرت ہو جس سے جان کا غالب خطرہ ہو تو اس وقت واجب کے وجوب اور حرام کی حرمت کا مکلف ہی شخص نہ رہے گا اور مستحبات و سنن کے لئے تو مال یا آبرو کی مضرت کا تحمل کرنا بھی واجب نہیں ہوتا بلکہ افضل اور عزیزت ہے اور جان کی مضرت کا تحمل کرنا تو بعض دفعہ مستحبات و سنن کے لئے ناجائز اور حرام ہے غرض اس مسئلہ میں بہت تفصیل ہے (۱۲) جس کے لئے کتب فقہ کا مطالعہ ضروری ہے ہر شخص اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کہاں نہیں اور کہاں واجب ہے اور کہاں حرام ہے اگر ہر شخص کی رائے پر اس کو چھوڑ دیا جاوے تو وہی قصہ ہوگا کہ ایک شخص نے ایک مولوی صاحب کے وعظ میں تول کی فضیلت اور اس کی ضرورت کا مضمون سنا تھا وہ بہت خوش ہوا کہ جب خدا تعالیٰ یوں بھی روزی پہنچا سکتے ہیں تو محنت و مشقت کی کیا ضرورت ہے پس آپ نے سارا کاروبار چھوڑ دیا اور جنگل میں لب سڑک جا بیٹھا۔ اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ سڑک سے دور جا بیٹھے یہ خیال کیا کہ سڑک کے کنارے کوئی تو آتا جاتا دیکھے گا۔ دوسرے وہاں ایک کنواں بھی پاس تھا جس پر بیٹھ کر مسافر کھانا کھایا کرتے تھے تو اس نے یہ جگہ اس لئے تجویز کی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ کوئی مسافر بھی مجھے کھانا نہ دے گا۔ اب آپ کو مسافروں کا انتظار شروع ہوا کہ شاید کوئی آوے اور مجھے کھانا کھلاوے۔ ایک آیا اور اس نے کھاپی سیدھا اپنا رستہ لیا۔ سمجھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس مرتبہ جو کوئی آوے گا وہ ضرور مجھے دیکھ کر کھلاوے گا۔ دوسرا آیا اس نے اس شخص کی طرف سے پشت کھلی اور سڑک کی طرف منہ کر کے کھانا کھایا اور وہ بھی چلتا ہوا اسی طرح دو تین دن گذر گئے اور کسی نے بھی اس کو ایک ٹکڑا نہ دیا۔ آخر میں ایک مسافر آیا اور اس نے بھی کھاپی کہ چلنے کا ارادہ کیا تھا کہ آپ نے کھنکارا آپیل ہیں

اس نے مڑ کر جو دیکھا تو ایک آدمی نظر پڑا جس کا فاقوں کے مارے بُرا حال ہے اس کو ترس آیا اور جو کچھ بچی ہوئی روٹیاں تھیں اس کے حوالے کیں جنہیں کھا کر میاں کے حوالے اس درست ہوئے اور بھاگا ہوا مولوی صاحب کے خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے تو کل کے بیان میں ایک قید ضروری چھوڑ دی ہے جس سے لوگوں کو دھوکہ ہوا ہو گا اور نہ معلوم کتنے آدمی اس دھوکہ سے پریشان ہوئے ہوں گے وہ تو خدا نے خیر کی کہ میں نے اپنے اجتہاد سے اس قید کو سمجھا ورنہ میں بھی ہلاک ہو گیا ہوتا۔ براہ مہربانی آئندہ آپ جہاں کہیں توکل کا بیان فرمایا کریں اتنی قید اور بڑھا دیا کریں کہ کھڑکار نے کی بھی ضرورت ہے پھر اس نے اپنا قصہ بیان کیا۔ تو دیکھئے اس شخص نے ترک اسباب کا بیان سن کر یہ سمجھ لیا کہ میں بھی ترک اسباب کا اہل ہوں اس لئے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گیا اور پریشان ہوا حالانکہ اس کی تشخیص اس کو کسی طبیب روحانی سے کرائی چاہیے تھی کہ میں ترک اسباب کا اہل ہوں یا نہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے وعظ میں سن لیا تھا کہ اللہ کے راستہ میں جو ایک روپیہ دے گا اس کو دس دنیا میں ملیں گے اور ستر آخرت میں۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ اس سے اچھی تجارت کیا ہوگی۔ بس سب کام چھوڑ کر یہی کرنا چاہئے چنانچہ اس کے پاس ایک روپیہ تھا اس نے اسے خیرات کر دیا اور متنظر رہا کہ اب دس روپے آویں گے کئی دن گزر گئے ایک پلیسہ بھی نہ آیا بڑا پریشان ہوا یہاں تک کہ میاں کو دست لگ گئے کیونکہ اب اس کو رہ رہ کر اپنے روپیہ کے جانیر کا بھی غم ہوتا تھا اور دل میں مولوی صاحب کو برا بھلا کہتا تھا کہ انہوں نے یہ کیسا غلط مسئلہ بیان کیا بے چارے کو اسی فکر میں دست اور پچیش لگ لگ گئی بار بار اجابت کے لئے جنگل جاتا تھا۔ ایک دن وہ قضائے حاجت کر رہا تھا اور زمین کو کرید رہا تھا کہ دفعۃً مٹی میں سے ایک بٹوہ ملا جس میں پورے دس روپے تھے بڑا خوش ہوا اور دست تو فوراً موقوف ہو گئے کیونکہ جس علت

سے دست آنے شروع ہوئے تھے وہ غلت ہی نہ رہی۔ دوڑا ہوا مولوی صاحب کے پاس آیا کہ مولوی صاحب آپ نے جو کچھ وعظ میں فرمایا تھا بالکل درست ہے مگر اس میں ایک قید آپ نے چھوڑ دی۔ آئندہ جہاں یہ مسئلہ آپ بیان کریں ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کریں کہ مڑوڑے بھی لگتے ہیں اس کے بعد جس کو تحمل ہوگا ایک کے دس لے گا۔ اور جس کو تحمل نہ ہوگا وہ اس طریقہ کو اختیار نہ کرے گا۔ یہ سچ ہے کہ ایک کے دس ملتے ہیں مگر مڑوڑے غضب کے ہیں غرض یہ بات ضروری ہے کہ ہر شخص کو تحمل مضرت کی اجازت نہیں اس کے لئے کچھ شرائط اور محل ہیں مگر یہ بات ضرور ہے کہ جب دین کا غلبہ ہو جاتا ہے تو دین دار کو دنیوی مضرت کی پروا نہیں رہا کرتی۔

میرے ایک دوست کی حکایت ہے جو بی۔ اے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کر رہے تھے ان کے پاس اسباب زیادہ تھا اور جس اسٹیشن سے وہ سوار ہوئے تھے وہاں وزن کرانے اور بلیٹی لینے کی فرصت نہ ملی تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس اسٹیشن پر اتروں گا وہاں وزن کرا کے محصول ریلوے ادا کر دوں گا چنانچہ جب وہ منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بابو سے انھوں نے کہا کہ میرے پاس اسباب زیادہ ہے جس کا محصول ادا کرنا میرے ذمہ ہے مجھ کو بوجہ تنگی وقت کے سوار ہوتے ہوئے اس کی بلیٹی کرانے کا موقع نہ ملا آپ اس وقت وزن کر کے مجھ سے محصول لے لیجئے اور چونکہ میں نے اپنا واقعہ خود بیان کر دیا ہے اس سے آپ کو معدوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے خیانت اور خلاف ورزی و تانوں کا قصد نہیں کیا تھا اس لئے آپ کو اصل محصول لے لینا چاہیے ڈبل چارج نہ کرتا چاہیے۔ بابو نے کہنا ہم کچھ نہیں لیتے انھوں نے پھر اصرار کیا وہ متعجب ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا اس نے بھی وزن کرنے اور محصول لینے سے انکار کیا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا تو وہ دونوں ان کو انگریزی زبان سے ناواقف سمجھ کر انگریزی میں باتیں کرنے لگے وہ باتیں یہ تھیں کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے شراب پی ہے جو باوجود

انکار کے از خود روپیہ دینا چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا میں نے شراب نہیں پی میرا مذہب مجھ کو مجبور کرتا ہے۔ افسوس آج کل فریب اور پالیسی کا بازار ایسا گرم ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی کہ کوئی شخص از خود بھی خدا کے خوف سے دوسروں کا حق ادا کر سکتا ہے۔ بس وہ یوں سمجھتے ہیں کہ عاقل وہی ہے جو از خود کسی کا حق ادا نہ کرے اور جس کو خود بخود اس کی فکری لگی ہوئی ہو اسے پاگل سمجھتے ہیں چنانچہ ریل والوں نے ان کو پاگل ہی سمجھا اور یہ کہا کہ آپ اپنا اسباب لے جائیں ہماری اجازت ہے آپ کو کوئی کچھ نہ کہیگا انھوں نے کہا کہ آپ کو اس اجازت کے دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں کیونکہ آپ ریلوے کمپنی کے مالک نہیں ہیں بلکہ اس کے ملازم ہیں آپ کو ریلوے کے حق چھوڑنے کا کیا حق ہے مگر کسی طرح ریلوے والوں نے ان سے محصول نہ لیا انھوں نے اپنا اسباب اٹھایا اور باہر آ کر سوچنے لگے کہ اے اللہ میں کیا کروں۔ اب حق تعالیٰ نے ان کی اعانت فرمائی جبکہ دیکھا کہ میرے بندہ کو معصیت سے بچنے کا راستہ نظر نہیں آتا اور دوسرے لوگ اس کو معصیت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس سے بچنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ معادل میں یہ بات آئی کہ مقدار محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کمپنی کا لے کر چاک کر دینا چاہیے اس طرح محصول ہو جائیگا چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ صاحبو! آپ دین پر عمل کئے تو دیکھیں ان شاء اللہ قدم قدم پر آپ کو اعانت الہیہ کھلی آنکھوں نظر آئیگی یہ تو سب جانتے ہیں کہ کمال دین بدون اعانت خداوندی کے حاصل نہیں ہوتا مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ابتدائی منازل میں بھی حق تعالیٰ پوری اعانت کرتے ہیں پس دین کے کام میں ابتداء سے انتہا تک اعانت الہیہ ساتھ رہتی ہے پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ کہ صاحب دین پر عمل کیسے کریں یہ تو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ارے بھائی تم کو اگر مشکل معلوم ہوتا ہے تو خدا کو تو کوئی مشکل نہیں جب وہ تمھاری اعانت کا وعدہ فرماتے ہیں پھر یہ عذر کرنا محض نفس کی شرارت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں والذین جاہدوا فینا لنھدینھم سبیلنا ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً۔ پھر بھی افسوس ہے کہ لوگ دین میں ترقی حاصل

نہیں کرتے اور جس کو جتنا دین حاصل ہے وہ اسی پر قانع ہے۔ میں عوام ہی کی شکایت نہیں کرتا افسوس یہ ہے کہ خواص کو بھی ترقی دین کی فکر نہیں۔ بس جو تعلیم میں مشغول ہے وہ اسی پر قانع ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بڑا دیندار ہوں کہ ہر وقت قال اللہ وقال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی میں رہتا ہوں جو لوگ ذکر شغل میں مشغول ہیں وہ اسی پر قناعت کئے ہوئے ہیں کوئی ان سے پوچھے آخر شریعت میں معاملات اور معاشرت کی تعلیم کس لئے دیکھی ہے اصلاح اخلاق کا اہتمام کیوں نہیں کیا گیا ہے کیا یہ دین نہیں کیا اس پر عمل کرنے کے لئے مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم پیدا ہوگی آخر تقویٰ کی فروع فقہیہ پر تم کیوں عمل نہیں کرتے یہ مسائل فقہاء نے کس کے لئے بیان کئے ہیں۔ دنیا دار اگر قلیل حصہ دین پر قناعت کرے تو وہ اتنا خسارہ میں نہیں جتنا خسارہ اہل علم کو ادنیٰ حصہ دین پر قناعت کرنے سے پہنچے گا۔ کیونکہ دنیا دار نے اگر دین کم حاصل کیا تو اس نے دنیا میں تو لذت و راحت حاصل کر لی اور یہ مولوی صاحب دنیا میں تو پھسے ہی تھے ہی اگر دین میں بھی پھسڈی رہے تو کسی طرف کے بھی نہ ہوئے نہ دنیا میں چین بونی نہ آخرت میں وہاں بھی یہ کلفت ہی میں رہیں گے اور دنیا میں تو یہ کلفت کے اندر ہیں ہی کہ نہ عالیشان محل رہنے کو ہے نہ نوکر چاکر ہیں نہ زیادہ روپیہ ہے نہ عمدہ اور لذیذ غذائیں ہیں نہ ریشمی لباس زیب تن ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ طبقہ ادنیٰ دین پر کیوں کر قناعت کرتا ہے اور دنیا کو چھوڑنے کے بعد یہ کمال دین کی فکر کیوں نہیں کرتے۔

امام غزالی نقل فرماتے ہیں ۷

ادری الملوك باد فی الذین قد قنعوا وما اراهم رضوا فی العیش بالذن

فاستغن بال دین عن دنیا الملوك کما استغنی الملوك بدنیاهم عن الدین

مطلب یہ ہے کہ میں سلاطین و اہل دول کو دیکھتا ہوں کہ انھوں نے تھوڑے سے دین پر قناعت کر کے اپنے کو دنیا میں مشغول کر دیا ہے اب تم ان کو اس طرح

نیچا دکھاؤ کہ تھوڑی سی دنیا پر قناعت کر کے دین میں کمال پیرا کرو اور سلاطین کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ کیونکہ اب ان کو نیچا دکھانے کا یہی طریقہ ہے۔ دنیا میں تو ان سے بڑھ جاتا تمھاری قدرت میں نہیں ہے مگر دین میں بڑھنا تو قدرت میں ہے پس تم دین میں سلاطین کو نیچا دکھا دو کہ وہ آج تم سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں تو دین کی برکت سے کل تم ان سے بڑھے ہوئے رہو گے اور اگر تم دین میں بھی کم رہے تو سلاطین تم سے ہر جگہ بڑھے ہوئے رہیں گے اور یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ سبحان اللہ کیا عجیب تعلیم ہے اور یہ لطیفہ ایسا ہے جیسا ایک شاعر نے کہا ہے ۷

یاد داری کہ وقت زادن تو ۶ ہمہ خداں بُند و تو گریاں  
 رکیا تو یاد رکھتا ہے اس بات کو کہ جب پیدا ہوا تھا تو سب تو خوش ہوئے  
 تھے اور ہنس رہے تھے اور تو رو رہا تھا

انچناں زمی کہ وقت مردن تو ۶ ہمہ گریاں شوندد و توخت داں  
 دس جب تو دنیا سے جاوے تو دنیا میں ایسے اعمال کر لے کہ تو ہنستا  
 ہوا جاوے اور لوگ رو رہے ہوں

یعنی تم کو یہ بات بھی یاد ہے کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو سب لوگ ہنس رہے تھے اور تم روتے ہوئے آئے تھے۔ تو یہ لوگ نہایت ظالم ہیں کہ ان کو تمھارے رونے پر بھی رحم نہ آیا اس وقت ان کو خوشی کی سو جھڑھی تھی اب تم ان کو اس طرح بدلہ دو کہ تمھارے مرنے کے وقت وہ سب روئیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ یعنی ایسی زندگی بسر کرو جس کی بدولت سب کو تمھارے مرنے کا غم ہو اور تم کو لقا ر الہی کی خوشی ہو وہ روتے رہیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کے وقت بھی سب ہنسیں اور خوش ہوں کہ اچھا ہوا کہ کبخت کا پاپ کٹا اور تم اعمال سیئہ کی وجہ سے روتے ہوئے جاؤ تو اس مضمون میں بھی ویسا ہی مقابلہ ہے جیسا اوپر کے اشعار میں مقابلہ تھا کہ جس طرح تمھارے رونے پر لوگ ہنستے تھے



اب تم ان کے رونے پر ہنسنا اور دنیا سے اس طرح جاؤ کہ آخرت کی راحتیں دیکھ کر تم بے ساختہ یوں کہو یا لیت قویٰ يعلمون بما غفر لی ربی وجعلتی من المکرین۔ اے کاش میری قوم کو اطلاع ہو جائے کہ میرے خدا نے مجھے بخش دیا اور مجھ کو معززین میں داخل کر دیا ہے تو اس اطلاع سے وہ رونے سے باز آجائیں یہی مقابلہ کامفون پہلے اشعار میں تھا کہ تم امراء و سلاطین کو دین میں نیچا دکھا دو۔ جبکہ انہوں نے تم کو دنیا میں نیچا دکھایا ہے کیونکہ آجکل کے امراء حضرات صحابہؓ کی طرح تھوڑے ہی ہیں جن کو نیچا دکھانا مشکل ہو۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تو یہ حالت تھی کہ غریبا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کرتے ہوئے آئے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مال دار لوگ ہم سے بڑھ گئے کیونکہ جس طرح نماز روزہ ذکر و شغل ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور ان میں یہ بات زیادہ ہے کہ وہ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، خیرات و صدقات کرتے رہتے ہیں، جہاد میں خوب مال خرچ کرتے ہیں اور یہ کام ہم نہیں کر سکتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم پانچوں نمازوں کے بعد سبحان اللہ والحمد للہ دلائلہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھا کرو اس کا تم کو اتنا ثواب ملے گا کہ مالداروں کے صدقات و خیرات سے بڑھ جائے گا۔ مالدار صحابہؓ کو جو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے بھی یہ کام شروع کر دیا۔ غریبا، پھر شکایت لائے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) امراء نے بھی وہ تسبیحیں پڑھنا شروع کر دیں جو آپ نے ہم کو تعلیم فرمائی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ اب میں کیا کروں میں خدا کے فضل کو کسی سے کیونکر روک دوں ذلك فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ حضرات صحابہؓ میں جو لوگ مالدار تھے ان کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر وقت اپنے دین کی ترقی میں لگے رہتے تھے اور جو نیک کام ان کو معلوم ہوتا اس کی طرف سبقت کرتے تھے ان کو دین میں نیچا دکھانا غریبا، کو مشکل تھا۔ ان حضرات کے پاس مال بہت کچھ تھا مگر حالت یہ تھی کہ دل کو اس سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو وہ رو رہے تھے۔ لوگوں نے ان کو تسلی دی کہ

باشاء اللہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فلاں فلاں غزوات میں شرکت کی اور خدا کے راستہ میں اسلام کی بہت سی خدمتیں کی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ تم کو حق تعالیٰ بخشہ میں گے تم کیوں روتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں اس وجہ سے نہیں روتا بلکہ میں اس واسطے روتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہماری تنگدستی کی یہ حالت تھی کہ عثمان بن مطعونؓ کا جب انتقال ہوا تو ان کے کفن کے لئے صرف ایک چھوٹا سا کبیل تھا جس کو سر کی طرف کھینچتے تو پیر کھل جاتے اور پیر کی طرف کھینچتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کبیل کو سر کی طرف کھینچ دیا جائے اور پیروں پر گھاس ڈال دی جاوے۔ اور آج ہمارے پاس اتنا مال ہے کہ سوائے مٹی کے اور کہیں اس کی جگہ نہیں۔ اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ سوائے زمین میں دفن کر نیکے اور کہیں اس کی جگہ نہیں دوسرے یہ کہ بجز عمارتوں میں خرچ کرنے کے اور کسی کام میں یہ روپیہ نہیں آتا تو وہ حضرات ایسے تھے کہ زیادہ مال جمع ہونے سے روتے تھے اس کی ان کو زیادہ خوشی نہ تھی۔ صابو! یہ وہ امرار تھے جن کی وجہ سے حضرات صوفیہ میں اختلاف ہوا ہے کہ صبر افضل ہے یا شکر افضل ہے۔ یعنی فقر و فاقہ پر صابر رہنا افضل ہے یا مال و دولت کے ساتھ شاکر رہنا افضل ہے تو صوفیہ کرام کے اس قول میں ایسے شاکر مراد ہیں جیسے حضرات صحابہؓ تھے نہ کہ ہم جیسے حرامخو جو خدا کی نعمتیں کھا کھا کر معاصی پر اور زیادہ دلیر ہو رہے ہیں اگر حضرات صوفیہ ہمارے زمانہ کے امرار کو دیکھ لیتے تو وہ یہی فرماتے کہ صابر افضل ہے شاکر سے (الآما شاء اللہ ۱۲) پس آجکل کے امرار کو دین میں نیچا دکھا دینا کچھ بھنی مشکل نہیں ہے پھر تعجب ہے کہ ہم کو اس بات پر غیرت نہ آئی کہ ہم دنیا میں تو امرار سے کم رہے دین میں بھی ان سے بڑھے ہوئے نہ رہیں بالخصوص اہل علم کو تو یہ غیرت ضرور ہونی چاہیے۔ پس ان کو لازم ہے کہ جس طرح اہل دنیا کسی وقت ترقی دنیا سے نہیں تھکتے وہ بھی ترقی دین سے نہ تھکیں اور دین میں کمال حاصل کرتے رہیں جس کا اور ایک آسان طریقہ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں جس کو میں نے تلاوت کیا ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ**  
 اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو۔ اس میں اول تقویٰ کا امر  
 ہے یہ بات تو اوپر ثابت ہو چکی کہ ہر مقصود میں درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے  
 اب یہ بات ثابت کرتا رہی کہ تقویٰ کمال دین ہے یا نہیں۔ نصوص شرعیہ میں غور  
 کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا تقویٰ کا امر اور فضل قرآن میں جس قدر ہے  
 غالباً کسی چیز کا اتنا نہیں اس سے اس کا ہتم بالشان ہونا معلوم ہوا۔ اور حقیقت  
 اس کی یہ ہے کہ تقویٰ کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے، ایک ڈرنا  
 دوسرے بچنا۔ اور تامل کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو بچنا  
 ہی ہے یعنی معاصی سے مگر سبب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل  
 میں ہوتا ہے جبھی اس سے بچا جاتا۔ تقویٰ کا معنی اول میں استعمال ہے ان تقوا  
 منہم تقاة۔ میں ہے اور بچنے کے معنی میں استعمال نصوص کثیرہ میں اور اس حدیث  
 میں معلوم ہوتا ہے **اتقوا الذنوب ولو بيشق تمرة**۔ بچو جہنم سے اگرچہ ایک ٹکڑا  
 چھوڑے گا دے کر یہاں بچے ہی کے معنی بن سکتے ہیں ڈرنے کے معنی نہیں بن سکتے  
 غرض استعمال دونوں معنی میں وارد ہے لیکن اصل مقصود احتراز عن المعاصی ہے  
 اور خوف علی الاطلاق مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ ذریعہ اور سبب ہے احتراز  
 عن المعاصی کا جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا  
**کرتے تھے و اسئلك من خشيئتك ما تحول به بيننا وبين معاصيك** لے  
 اللہ میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جس سے مجھ میں اور معاصی کے درمیان  
 میں آڑ ہو جاوے اس سے معلوم ہوا کہ خوف علی الاطلاق مقصود نہیں کیونکہ  
 مقاصد کا ہر درجہ مطلوب ہوتا ہے کوئی درجہ غیر مقصود نہیں ہوتا اور حدیث کی  
 اس قید سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف ایک خاص حد تک مطلوب ہے اس سے آگے  
 مطلوب نہیں وہ خاص حد یہ ہے کہ جس سے معاصی میں رکاوٹ ہو جاوے۔ حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ما تحول بد بیننا و بین معاصیک کی قید

بڑھا کر ایک ایسی بات بتلائی ہے جو سالکین کو سا لہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتی ہے مگر آپ نے دو لفظوں میں اس کو صل فرما دیا وہ بات یہ ہے کہ بظاہر یہ بات سمجھ میں آیا کرتی ہے کہ خدا کا خوف تو اچھی چیز ہے پس وہ جتنا بھی زیادہ ہو اچھا ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس کا حد سے بڑھ جانا مضر ہو جاتا ہے اول تو زیادت خوف سے صحت خراب ہو جاتی ہے ہر وقت انسان رنج و غم ہی میں رہتا ہے اور صحت کے اختلال سے اعمال میں کوتاہی ہونے لگتی ہے دوسرے صاحب خوف کو دیکھ کر دوسرے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں کہ بس صاحب خدا کو راضی کرنا بڑا مشکل ہے ہر وقت رنج و غم میں گھلتا پڑتا ہے۔ تیسرے جب خوف کا غلبہ حد سے زیادہ ہوتا ہے تو یہ شخص رحمت الہی سے مایوس ہو جاتا ہے یا س تک نوبت پہنچ جاتی ہے جو کہ کفر ہے اور مایوس ہونے سے وہ بالکل معطل و بیکار ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ جب میرے کئے کچھ نہیں ہو سکتا اور میں رحمت حق کے قابل ہی نہیں ہوں تو پھر اس ساری محنت سے کیا فائدہ بس سب کام چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو غلبہ خوف سے یہ باتیں پیش آیا کرتی ہیں اس وقت سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا ہر درجہ مطلوب نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دو لفظوں میں اس حقیقت پر متنبہ کر دیا جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اصل مقصود تقویٰ بمعنی احتراز عن المعاصی ہے اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا کمال دین ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس میں ادائے فرائض و واجبات و اجتناب عن المحرمات سب داخل ہیں کوئی مقصود شرعی اس سے خارج نہیں مطلب یہ ہوا کہ نماز بھی پڑھو کیونکہ ترک صلوٰۃ معصیت ہے، زکوٰۃ بھی دو کیونکہ ترک زکوٰۃ معصیت ہے اسی طرح تمام مامورات کا چھوڑنا معصیت ہے تو اس میں مامورات کے ادا کا حکم بھی ہے اور محرمات کے ترک کا بھی اور کمال دین کے یہی دو اجزاء ہیں تو تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل ایک اور ہے جس سے تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہے وہ

یہ کہ حدیث میں ہے الا ان التقوی وجرہنا و اشارالی صدرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سن لو تقویٰ یہاں ہے یعنی تقویٰ کا محل قلب ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اس کے ساتھ دوسری حدیث کو ملائیے گا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب یعنی جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ قلب ہے۔ اس حدیث سے اصلاح قلب کا صلاحیت کاملہ ہوتا ثابت ہے اور پہلی حدیث سے یہ معلوم ہو چکا کہ تقویٰ کا اصل محل اور موصوف قلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تقویٰ سے اول اصلاح قلب کی ہوتی ہے تو ان دونوں مقدموں سے تقویٰ کا مستلزم صلاحیت کاملہ ہوتا ثابت ہو گیا اور صلاحیت کاملہ یہی کمال دین ہے پس یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ تقویٰ کمال دین ہے اور ر قلب کو محل تقویٰ اس حدیث میں اس لئے فرمایا کہ تقویٰ بمعنی الاجتناب عن المعصیۃ کا سبب خوف خداوندی ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کا اصلی محل قلب ہے (جامع ۱۲) یہاں تک تو جملہ اولیٰ کے متعلق کلام تھا دوسرے جملہ کی بابت میں نے یہ کہا تھا کہ کو نوامع الصادقین۔ بیان ہے مقصود مذکور کے طریق کا کہ حاصل اس کا معیت مع المتقین ہے پس صادقین سے اس حدیث سے بعض جاہل صوفیوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس اصل مقصود اصلاح قلب ہے اعمال ظاہرہ کی کچھ ضرورت نہیں یہ بالکل غلط اور صریح زندقہ ہے اور اس کا غلط ہونا خود اس حدیث سے معلوم ہوتا، کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ جب دل صالح ہوتا تو تمام بدن صالح ہو جاتا ہے اور جب دل بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ظاہر صلاحیت قلب فساد قلب کی دلیل ہیں پس جس شخص سے اعمال صالحہ صادر ہوں یہ اس کے قلب کے صلاحیت کی دلیل ہے اور جس سے اعمال سیئہ صادر ہوں یہ اس کے قلب کے فساد کی دلیل ہے پس صلاحیت قلب کے بعد اعمال صالحہ کا ترک ممکن نہیں اور جو شخص اعمال صالحہ کو ترک کر کے صلاحیت قلب دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے پس یہ مسلم کہ اصل مقصود اصلاح قلب ہے مگر وہ اعمال صالحہ کی مداومت اور اعمال سیئہ سے اجتناب سے متفک نہیں ہو سکتی ہے لہذا اعمال ظاہرہ ہرگز بے کار نہیں

ہیں فافہم ۱۲ جامع۔

اسی کا ایک عنوان ہے اور متقی کے معنی کاملین فی الدین ثابت ہو چکے ہیں پس صادقین کے بھی وہی معنی ہوں گے یعنی کمال فی الدین کا مترادف کاملین فی الدین کی معیت ہے پس کونوا مع الشّٰدقین کی توجیہ کو نوا مع الکاملین ہوئی ہے کیونکہ صادقین سے معنی مشہور صادقین فی القول مراد نہیں بلکہ راسخ فی الدین مراد ہیں جیسے ہمارے محاورہ میں بھی پکے آدمی کو سچا کہتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو صدیق فرمایا ہے واذکر فی الکتاب ابراہیم اندکان صدیقاً نبیا اور اسی صدیقیت کا درجہ بعد نبوة کے ہے پھر شہداء و صالحین کا درجہ چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اسی ترتیب سے ان درجات کو بیان فرمایا ہے فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدّٰقین والشّٰہداء والصّٰلین وحسن اولئک رفیقاً اور راسخ فی الدین بھی کمال فی الدین ہے پس مع الصدّٰقین کی توجیہ مع الکاملین ثابت ہوگئی۔ نیز اس کی دلیل ایک اور آیت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لیس البران تولوا وجوهکم بلکہ یہ آیت اتفاق سے میرے دونوں دعویٰ کو ثابت کر رہی ہے یعنی اس سے تقویٰ اور صدق دونوں کے معنی کمال دین ہونا ثابت ہو رہا ہے پوری آیت اس طرح ہے لیس البران تولوا وجوهکم قبل المشرق والمغرب ولكن البر من امن بالله والیوم الآخر والملئکة والکتاب والنبیین واتی المال علی حبه ذوی القرنی والیتامی والمساکین وابن السبیل والسّٰئلین و فی الرقاب و اقام الصلوة و اتی الزکوة والموفون بعہدہم اذا عاہدوا والصابرین فی الباساء والضراء و حین الباس

اولئک الذین صدقوا و اولئک هم المتقون ط

ترجمہ :- کچھ ساری خوبی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کی طرف لیکن (اصلی) خوبی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور مال دیتا ہو

اللہ کی محبت میں (اپنے حاجتمند) رشتہ داروں کو اور نادار (یتیموں کو اور دوسرے غریب محتاجوں کو اور بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچار میس) سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہے) اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب کسی امر جائز کا عہد کر لیں اور وہ رگ مستقل مزاج رہنے والے ہوں تنگدستی اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں یہ لوگ ہیں جو سکے ہیں اور یہی لڑگ ہیں جو متقی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ سادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آگیا ہے دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا پس یہ اوصاف کمال دین کو متفہم ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان اوصاف سے متصف ہیں وہی صادق اور وہی متقین ہیں اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت کمال دین ہونا ثابت ہو گیا۔ رہا یہ کہ آیا اس آیت میں تمام اجزاء دین کا ذکر آگیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں عقائد، اعمال، اخلاق اور تمام جزئیات الہی کلیات کے تحت میں داخل ہیں اور اس آیت میں اقسام ثلاثہ کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں اس اعتبار سے یہ آیت تمام جوامع کلم کے لیے صحیح فرماتے ہیں لیس البران تولو وجوہکو بوجہ کے لئے مہدنی کے میں اور لام مہد ہے معنی یہ ہوئے لیس البران کافی ان تولو وجوہکو قبل المشرق والمغرب۔ یعنی مشرق و مغرب کی طرف نماز میں مہد کر لیتا بہر کافی نہیں ہے کہ اسی پر قناعت کر لی جائے اس توجیہ سے یہ اثر کمال رفع ہو گیا کہ استقبال قبلہ بھی تو مہد بہ شرعاً ہے اور مامور بہ شرعی کا بہر ہوتا لازم ہے پھر اس کی نسبت لیس البران کیوں فرمایا اس اشکال کے جواب لوگوں نے مختلف وجوہ سے دیئے ہیں لیکن جو توجیہ میں نے بیان کی ہے یہ بہت آسان ہے اور یہ توجیہ اسی وقت سمجھ میں آئی ہے۔ حاصل

اس کا یہ ہے کہ اس میں استقبالیہ سے مطلق خیریت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ اس کے برکافی ہونے کی نفی ہونے کی مراد ہے رہا۔ کہ اس مضمون کی اس جگہ ضرورت کیا تھی استقبالیہ مشرق و مغرب سے برکافی کی نفی کیوں کی گئی سو بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تخیل قبیلہ کا مسئلہ مذکور ہوا ہے جس میں کفار و مشرکین نے بہت شور و غل کیا تھا اور اس وقت ان کی تمام تر بحث اسی میں رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کا بھی عجیب دین ہے کبھی کسی طرف منہ کرتے ہیں کبھی کسی طرف توجہ لگاتے ان کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ تم تو اس بحث میں ایسے پڑ گئے کہ گویا مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا کوئی بڑا مقصود ہے حالانکہ یہ مقصود نہیں بلکہ شرائط و وسائل مقصود ہیں سے ہے پس یہ حماقت ہے کہ مقاصد کو چھوڑ کر غیر مقاصد کی بحث پر اکتفا کر لیا جاوے مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا یہ برکافی نہیں بلکہ برکافی وہ ہے جس کا آگے بیان آتا ہے اس کا اہتمام کرو۔ اور مشرق و مغرب کی تخصیص ذکر میں ایک نکتہ کی وجہ سے ہو اس سے قبلہ کا مشرق و مغرب میں منحصر کرنا مقصود نہیں کیونکہ جن لوگوں سے مکہ معظمہ کا رخ جانب شمال میں ہے ان کا قبلہ شمال ہے اور جس جگہ سے مکہ کا رخ جنوب میں ہے اس جگہ کا قبلہ سمت جنوب ہے۔ چنانچہ مدینہ والوں کا قبلہ جنوب ہے اسی لئے حدیث میں اہل مدینہ کو فرمایا گیا ہے ولکن شر قول او غریبوا۔ کہ استیجا کے وقت تم لوگ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کیا کرو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قبلہ مشرق و مغرب میں منحصر نہیں۔ پس اس جگہ مشرق و مغرب کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے کہ تمام جہات میں سے یہی دونوں جہتیں عرفاً زیادہ مشہور ہیں۔ جب ان کا غیر مقصود ہونا بیان کر دیا تو دوسری جہات کا مقصود نہ ہونا بھی اس سے واضح ہو گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی جہت میں امتیاز بوجہ تقابل حتیٰ کے زیادہ محسوس ہے پس اولاً وبالذات انہی دو جہات کا علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری جہات کا علم ان کے واسطے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی جہت کا سمجھنا شمال و جنوب کے جاننے پر موقوف نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مشرق وہ جہت ہے



جدھر سے آفتاب نکلتا ہے اور مغرب وہ ہے جدھر آفتاب ڈوبتا ہے اور شمال جنوب کی معرفت بدون مشرق و مغرب کے نہیں ہو سکتی چنانچہ شمال و جنوب کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو۔ نہ سے داہنے ہاتھ کی سمت جنوب ہے اور بائیں ہاتھ کی سمت شمال ہے۔ پس یہ دونوں جہتیں اصل ہوئیں اور جنوب و شمال ان کی فرج ہیں اور ظاہر ہے کہ اصل کے غیر مقصود ہونے سے فرع کا غیر مقصود ہونا خود ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔ علاوہ انہیں یہ کہ شریعت میں قلیل انحراف مفسد صلوٰۃ نہیں تو مشرق و مغرب جن کا قبلہ ہے وہ اگر قدرے شمال و جنوب کی طرف مائل ہو جائیں نماز فاسد نہ ہوگی اس طرح گویا مشرق و مغرب میں شمال و جنوب بھی آگئے۔ پس مطلب صرف یہ ہے کہ کسی جہت کی طرف بھی منہ کرنا برّ کافی نہیں بلکہ برّ کافی وہ ہے جس کا آگے ذکر ہے و لکن البتّٰ من امن باللّٰہ الخ یہاں دونوں جہتیں جائز ہیں ایک یہ کہ مسند الیہ کی جانب میں مضاف کو مقدر کیا جائے و لکن ذالبتّٰ من امن باللّٰہ الخ ایک یہ کہ مسند کی طرف مضاف مقدر مانا جاوے یعنی و لکن البتّٰ من امن باللّٰہ الخ۔ اور حاصل دونوں کا ایک ہے خواہ یہ کہا جائے کہ بھلائی کافی اس شخص کی بھلائی ہے یا کافی بھلائی والا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ذات و صفات کے متعلق جس قدر احکام ہیں سب آگئے اور قیامت کے دن پر ایمان لانے میں جزا و سزا و حساب و کتاب و جنت و دوزخ وغیرہ کے سب احکام آگئے و الملائکۃ اور فرشتوں پر ایمان لانے یعنی ان کے وجود کا قائل ہونا اس میں تمام فیعیات داخل ہیں اور فرشتوں کی تخصیص اسی لئے کی گئی ہے کہ شریعت کے معلوم ہونے کا مدار و واسطہ ملائکہ ہی ہیں و الکتب اور کتاب پر ایمان لانے یہاں کتاب بصیغہ مفرد لایا گیا ہے۔ حالانکہ کتب سماویہ متعدد ہیں اور ایمان لانا سب پر واجب ہے گو عمل منسوخ پر جائز نہیں اور اسی وجہ سے دوسری آیتوں میں صیغہ جمع اختیار کیا گیا ہے کل امن باللّٰہ

و ملائکتہ و کتبہ و رسالہ الخ لیکن یہاں صیغہ مفرد اختیار کرنے میں اشارہ ہے ایک امر کی طرف وہ یہ کہ قرآن ایسا جامع ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ پر حاوی ہے اسی لئے اس پر ایمان لانا گویا سب پر ایمان لانا ہے۔ یا یہ کہا جاوے کہ کتب سماویہ میں سے ہر کتاب دوسری کتاب پر ایمان لانے کا امر کرتی ہے پس وہ سب مل کر بمنزلہ کتاب واحد کے ہیں ان سب پر ایمان لانا بمنزلہ کتاب واحد پر ایمان لانے کے ہے اور جو شخص ایک کتاب کو مان کر دوسری کا انکار کرے وہ حقیقت میں پہلی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتا، لیکن یہ حکم ایمان کا ہے اور عمل کرنا سب کتابوں پر جائز نہیں بلکہ عمل صرف موخر پر ہوگا کیونکہ وہ مقدم کے لئے ناسخ ہے والنَّبیین اور پیغمبروں پر ایمان لانے یہاں تک تو امہات عقائد مذکور ہیں آگے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔ اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں طاعات۔ دیانات دوسرے معاملات (معاملات کی پھر دو قسمیں ہیں ایک متعلق اموال کے دوسرے متعلق غیر اموال کے جو معاملات متعلق غیر اموال کے ہیں ان میں نکاح و طلاق و عتاق و حدود وغیرہ داخل ہیں) اور دیانات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک طاعات بدنیہ دوسرے طاعات مالیہ اسی طرح اخلاق کی دو قسمیں ہیں حسنہ و سیئہ۔ اخلاق حسنہ کے ساتھ موصوف ہونا مقصود شرعی ہے اور اخلاق سیئہ سے غالی و متمتر ہونا مطلوب ہے۔ عقائد سے آگے ان سب کے اصول مذکور ہیں جن میں طاعات مالیہ کا ذکر مقدم کیا گیا کیونکہ بہت لوگ طاعات بدنیہ میں ہمت والے ہوتے ہیں اور طاعات مالیہ میں ان کا یہ حال ہوتا ہے

گر جاں طلبی مضائقہ نیست

گر زر طلبی سخن دریں رست

(اگر جان طلب کر لے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر مال طلب کریگا

تو اس میں مجھے اعتراض ہوگا۔)

چنانچہ ارشاد ہے واتی المال علی حید۔ اور دیتا ہو مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو علیٰ حیدہ کی ضمیر اگر اللہ کی طرف راجع ہو جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو اس میں علم

اخلاق کا بھی ایک اصل عظیم مذکور ہوگا یعنی مال خدا کلمے راستہ میں محبت الہی کی وجہ سے دینا چاہیے اس میں ایک تو محبت الہی کے حاصل کرنے کی تعلیم ہونی کہ خدا سے محبت پیدا کرنی چاہیے محض ضابطہ کا تعلق نہ ہونا چاہیے۔ دوسرے اخلاص کی تعلیم اور ریادنا موری کی ممانعت ظاہر ہونی کہ مال خرچ کر۔ نہ میں کسی کی مدح و ثنا یا شکر یہ وغیرہ کا منظر نہ ہو بلکہ محس خدا کی محبت اس کا سبب ہونا چاہیے اور اخلاص بھی اخلاق باطنیہ کا ایک بڑا رکن ہے اور اگر مرجع ضمیر مارا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ اس مال جس سے محبت ہو اور دل بہ تعلق ہو خدا کے لئے خرچ کر دے اس میں ایک تو خرچ کرنے کا ادب مذکور ہوا کہ سہ کے واسطے عمدہ مال خرچ کرنا چاہیے رفق مال نہ دینا چاہیے دوسرے علم سلوک کا یہ مسئلہ بھی اشارۃً مذکور ہوا کہ محبت مال جو کہ خلق ذمیم ہے اس کا علاج یہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دے دوچار بار ایسا کرنے سے حب مال کا مرض جاتا رہے گا ذوی القربیٰ میں تمام قرابت دار داخل ہیں بیوی بچے بھی ان میں آگے جن کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے اور دوسرے غریب رشتہ دار بھی آگے جن کو کچھ دیتے رہتا اور ان کا خیال رکھنا مستحب ہے والیتھی و المساکین و ابن السبیل اور یتیموں کو بھی دے اور مسکینوں کو بھی دے اور مساروں کو بھی یہ سب صدقات نافلہ کیونکہ زکوٰۃ کا بیان آگے آ رہا ہے۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ طاعات مالیہ کا ذکر طاعات بدنیہ سے کیوں مقدم ہوا اس کا جواب تو میں نے دید یا کہ بعض طبائع میں بخل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ طاعات بدنیہ کی ہمت خوب کر لیتے ہیں اور مال دینے سے جان چراتے ہیں اس لئے طاعات مالیہ کو اہتماماً مقدم کر دیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ طاعات مالیہ میں سے صدقہ نافلہ کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ پر کیوں مقدم کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے ایسا ضابطہ کا تعلق رکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مفروضہ کے علاوہ اور کچھ خیرات نہیں کرتے اس میں گناہ نہیں مگر ضعف تعلق مع الحق کی دلیل ضرور ہے اس لئے حق تعالیٰ نے صدقات نافلہ کو زکوٰۃ سے مقدم فرمایا جس کی طرف

اشارہ کر دیا کہ زکوٰۃ واجب ہے وہ تو تم ادا کرو ہی گے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ صدقہ خیرات موقع بموقع کرتے رہنا چاہیے۔ دیکھئے اگر کوئی محبوب یا کوئی بادشاہ ہم سے یہ کہے کہ اس موقع میں تم دو روپیہ خرچ کر دو تو غور کیجئے اس وقت ہمارے دل کی کیا حالت ہوگی کیا ہم صرف دو روپیہ ہی پر اکتفا کریں گے ہرگز نہیں بلکہ محبوب کو خوش کرنے یا بادشاہ کی نگاہ میں جاں نثار بننے کے لئے ہم دو کی جگہ دس خرچ کریں گے ورنہ چار تو دے ہی ڈالیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے ضابطہ کا تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ اس نکتہ کی وجہ سے صدقات نافدہ کو صدقہ مفروضہ مالیہ سے مقدم کیا بلکہ طاقت بدنیہ یعنی صلوة سے بھی مقدم کر دیا۔ لیکن بعد میں جب زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو نماز کو اس سے مقدم کیا تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ رتبہ کے اعتبار سے نماز ہو مقدم ہے چنانچہ دیکھ لو ہم نے زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا ہے اور جن صدقات مالیہ کو نماز اور زکوٰۃ سے پہلے بیان کیا ہے وہاں تقدیم کی وجہ محض اہتمام بالشان ہے نہ کہ رتبہ کا زیادہ ہونا۔ رتبہ نماز کا طاعات مالیہ سے بڑھا ہوا ہے اور زکوٰۃ کا رتبہ صدقات نافدہ سے بڑھا ہوا ہے سبحان اللہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ہر چیز کے درجہ کا کتنا لحاظ ہے۔ یہی تو باتیں ہیں جن کی وجہ سے بشر کی عقل اس کلام کو دیکھ کر چکراتی ہے کہ اتنی رعایتیں انسان ہرگز نہیں کر سکتا واللہ تملین فی الرقاب اور مانگنے والوں کو بھی دے اور گردن چھڑانے میں بھی۔ یہ بھی صدقات نافدہ کی ایک فرد ہے اس میں اس قدر تفصیل ضروری ہے کہ دیگر نصوص شرعیہ سے سائلین کا لفظ ان سوال کرنے والوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرتے ہوں جن کا پیشہ سوال نہ ہو گیا ہو اور جو لوگ مضبوط ہٹے کٹے سوال کو پیشہ بتائے ہوئے ہیں ان کو دینا جائز نہیں نہ ان کو سوال کرنا جائز ہے۔ اس مسئلہ پر اس زمانہ میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تبنیہ قرمانی - ایک دن فرمایا کہ ایک مسئلہ بتلاتا ہوں گا لیاں تو بہت پڑیں گی چنانچہ واقعی جب اس مسئلہ کی شہرت ہوئی تو لوگوں نے بہت اعتراضات کئے اور بڑا بھلا کہا کوئی یہ کہتا تھا کہ

پس اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فیفر کو کچھ مدت دو مجھے دے جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ  
بس یہی تو ایک نئے مولوی پیدا ہوئے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی ان سوال کرنے  
والوں کو دینا حرام نہیں بتلایا۔ مگر مولانا تو شریعت الہیہ کے عاقل تھے اور  
عاشق کو گالیوں کی پرواہ نہیں ہوا کرتی کسی نے خوب کہا ہے

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان

ماننی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقل والوں کے نزدیک اس میں بدنامی و اعتراض ہے لیکن

میں اتباع اور اطاعت کی بدنامی سے خوش ہوں ہم ایسی ننگ نامی سے

یا زائے جو نافرمانی سے تعلق رکھے۔)

اور اسی معنی میں ایک شعر اردو کا ہے مگر ذرا شاعریت سے گرا ہوا ہے اور نہ معلوم یہ  
کیا بات ہے کہ اردو کے اشعار فارسی اشعار کے سامنے پھیکے ہوتے ہیں مگر خیر  
مضمون کے موافق کی وجہ سے پڑھے دیتا ہوں

عاشق بد نام کو پروائے ننگ و نام کیا

اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

ناکامی کا مطلب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھو۔ آپ نے ایک مرتبہ  
فرمایا تھا کہ بھائی جو با مراد ہوتا چاہے وہ کسی اور بزرگ کے یہاں جائے اور جو نامرادی  
چاہے وہ ہمارے پاس چلا آوے۔ پھر چپکے سے فرمایا کہ جلنے سے ہوتا مرادی کے کیا  
معنی ہیں اس کے معنی ہیں عشق۔ کیونکہ عاشق بوجہ طلب اور اشتیاق کے غلیہ کے  
ہر جگہ اپنے آپ کو ناکام اور بے مراد ہی سمجھتا ہے وہ کسی حالت یا کسی مقام پر  
قناعت نہیں کرتا ہر وقت آگے کی طلب رہتی ہے اسی لئے وہ ہمیشہ ناکام رہتا ہے  
۔ یہی وجہ ہے کہ چشتیہ میں بعد تمکین کے بھی سوز و گداز رہتا ہے مگر یہ دنیا ہی میں ہے  
کیونکہ یہاں وصال کامل نہیں ہو سکتا جس سے تسلی ہو جائے لیکن آخرت میں تسلی  
ہو جاوے گی۔

ایک صاحبِ حال صوفی کا قول مشہور ہے ان فی الجحان جنة لیس فیہا حورٌ  
 ولا قصور و لکن فیہا ارنی ارنی یعنی ایک جنت ایسی بھی ہے جس میں نہ حوریں ہیں نہ  
 محلات ہیں بس وہاں جو لوگ رہیں گے ان کی یہ حالت ہوگی کہ وہ ہر وقت حق  
 تعالیٰ سے عرض کرتے رہیں گے کہ اپنے کو دکھلا دیجئے اپنے کو دکھلا دیجئے بعض لوگ  
 اس کو حدیث سمجھتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ ایک صوفی کا قول ہے اور قول بھی غلط میرے  
 نزدیک اس صوفی نے جنت کو دنیا پر قیاس کیا ہے حالانکہ جنت میں حسب استعداد  
 وصال کامل نصیب ہو جائے گا جس سے پوری تسلی ہو جائے گی اور کسی قسم کی خلش  
 باقی نہ رہے گی جس کی دلیل یہ ہے کہ نصوص قرآنیہ سے جنت میں ہر قسم کی کلفت اور  
 خلش کی نفی صراحۃً معلوم ہو چکی ہے اور یقیناً اگر یہ خلش وہاں بھی رہی تو اس سے  
 بربطہ کر کوئی خلش نہ ہوگی عشاق تو آخرت ہی کی امید پر زندگی کے دن پورے کر رہے  
 ہیں اگر وہاں بھی تسلی کامل نہ ہوئی تو بڑی حسرت کی بات ہے اور نصوص سے صاف  
 معلوم ہو رہا ہے کہ جنت میں کوئی حسرت باقی نہ رہے گی۔ ولکم فیہا ما تشتہی انفسکم  
 ولکم فیہا ما تدعون اور دنیا میں سکون کامل اور پوری تسلی اسیلے نہیں ہو سکتی  
 کہ یہاں وصال کامل عادتاً ممتنع ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہمارے قومی وصال  
 کامل کے متحمل نہیں اور جنت میں تحمل عطا ہو جائے گا اور اہل نسبت کو جو دنیا میں  
 وصال نصیب ہوتا ہے اس کو حالت تلوین کی اضافت سے وصال کہہ دیا جاتا ہے  
 ورنہ حقیقی وصال کے سامنے وہ بھی کچھ نہیں بس ایک قسم کا حضور حاصل ہو جاتا ہے  
 وہ بھی کسی وقت ہوتا ہے کسی وقت نہیں بھی ہوتا اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں

در بزم و در یک دو قدر درکش و برو

یعنی طبع مدار وصال دوام را

(بزمِ قرب میں دو یا ایک جام پی اور راستہ لے یعنی دائمی وصال کی طبع مت کھ)

اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا و لکن یا حنظلہ  
 ساعة ساعد یعنی ساعة کذا و ساعة کذا غرض یہ کہہ رہا تھا کہ عاشق کو بدنامی اور

ذلت اور گالیوں کی پرواہ نہیں ہوا کرتی چنانچہ مولانا گنگوہی نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ فقہار نے بھی صراحتاً فرمایا ہے کہ یہ لوگ جو گلی کوچوں میں سوال کر کے پھرتے ہیں جنھوں نے سوال کو پیشہ بنا لیا ہے ان کو سوال کرنا حرام ہے اور چونکہ ان کا سوال پورا کر دینے سے ان کو آئندہ کے لئے سوال پر جرأت ہوتی ہے اس لئے ان کو کچھ دینا سوال حرام پر اعانت کرنا ہے اور اعانت علی الحرام حرام ہے۔ اس لئے ہٹے کٹے لوگوں کو سوال کرنا بھی حرام اور ان کو دینا بھی حرام خوب سمجھ لو۔ و فی السَّوَابِ اور گردن چھڑانے میں۔ یہ قیدیوں اور غلاموں کے متعلق ہے اور اسی کے حکم میں یہ صورت بھی ہے کہ جو شخص فتنہ من کے اندر بندھا ہوا ہو اس کی اعانت کر دی جائے کہ یہ بھی گردن چھڑانے میں داخل ہے و اف م السَّلْوَةِ و اَتَى الزَّكَاةَ اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ یہاں زکوٰۃ کو نماز سے اسل کے مطابق مؤخر کر دیا جس کا نکتہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہاں تک طاعات بدنیہ و طاعات مالیہ کے اصول عظام مذکور ہوئے آگے حقوق العباد کا بیان ہے۔ و الموقوفون بعهدہم اذا عاہدوا۔ اور وہ لوگ خمد کو پورا کرنے والے ہیں جب خمد کی سنتے ہیں۔ ہر چند کہ حقوق العباد میں بعض حقوق ایسے ہیں جو ایفار خمد سے مقدم ہیں مثلاً قرض کا ادا کر دینا امانت میں خیانت نہ کرنا لیکن اس جگہ حق تعالیٰ نے صرف ایفائے خمد کو بیان فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ لوگ ایسے حقوق العباد کو ادا کرتے ہیں جن کا مطالبہ کرنے والا ان سے کوئی بھی نہیں دیکھتا کیونکہ ایفار خمد قضاءً لازم نہیں گو دینت بعض کے نزدیک واجب ہے (۱۲) تو اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہو گئی کہ جن حقوق کا مطالبہ کرتے والا موجود ہو ان کو تو ضرور ادا کریں گے اور اسی نکتہ کی وجہ سے موارد میں وصیت کو دین پر مقدم فرمایا ہے اس سے حقوق العباد کا درجہ معلوم ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو

ان حقوق کا بھی اہتمام ہے جس کا مطالب کوئی نہ ہو تو جن حقوق کا مطالب بھی موجود ہو وہ تو کس قدر قابل اہتمام ہوں گے اور یہاں بطور مثال کے بعض حقوق کا ذکر فرمایا گیا ورنہ حقوق العباد اور بھی ہیں اگرچہ لوگ فقط مال کو حق العباد سمجھتے ہیں مگر ایک حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق العباد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ حقوق العباد کے اقسام اور بھی ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو خطبہ پڑھا ہے اس میں آپ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا این یوم ہذا بہ کون سادن ہے قالوا اللہ ورسولہ اعلم۔ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا الیس یوم النحر کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے قالوا بلی صحابہؓ نے عرض کیا بیشک اس سے صحابہ کا نایت ادب معلوم ہوا کہ جس بات کو وہ جانتے بھی تھے اس کو بھی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیتے تھے اپنی شان علم ظاہر نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ مقام کونسا ہے پھر اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ بدتہ الحرام نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بیشک پھر آپ نے مہینہ کی بابت سوال کیا اور اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ ذمی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے صحابہؓ نے عرض کیا بیشک۔ پھر آپ نے فرمایا فان اموالکم ودماءکم واعراضکم حرام علیکم کحرمتہ یوم مکہ ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا۔ کہ تمہارے اموال اور جانیں اور آبرو میرے آپس میں تپہر ہمیشہ کے لئے ایسی ہی حرام ہیں جیسے اس مہینہ میں اس مقام میں اس دن میں حرام ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ایک قسم حقوق العباد کی جان کو تکلیف پہنچانا ہے مثلاً ناحق مارنا جس میں اہل حکومت اور معلمین بکثرت مبتلا ہیں اور ایک قسم حقوق العباد کی کسی کی آبرو کو صدمہ پہنچانا بھی ہے۔ یعنی کسی کی تحقیر کرنا کسی پر لعن طعن کرنا کسی پر بے وجہ بدگمانی کرنا یہ سب حرام ہے۔ اسی طرح کسی کی غیبت کرنا بھی ناجائز ہے بلکہ بعض نصوص سے حقوق آبرو کا درجہ زنا وغیرہ سے بھی



بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ بالخصوص آبرو کے حقوق کی ذرا پرواہ نہیں ایسے لوگ بکثرت ہیں جو کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے۔ حقوق مالیہ میں فرو گذاشت نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا امتیاق سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کا حق نہیں رکھتے مگر آبرو کے حقوق میں وہ بھی مبتلا ہیں۔ ہماری کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی عوام کی تو کیا شکایت علماء کی مجالس بھی غیبت سے خالی نہیں اور سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ مشائخ کی مجالس بھی اس سے خالی نہیں عوام تو عوام ہی کی غیبت کرتے ہیں جن میں اکثر فساق بھی ہوتے ہیں جن کی آبرو کا زیادہ حق بھی نہیں لیکن علماء جب غیبت کریں گے تو وہ عوام کی نہ کریں گے بلکہ علماء کی غیبت کریں گے اور مشائخ ہمیشہ مشائخ کی غیبت کریں گے کیوں تاکہ یہ ہم سے بڑھ نہ جائیں۔ لوگ ہم سے زیادہ ان کے معتقد نہ ہو جائیں اسی لئے اکثر علماء و مشائخ کی مجالس علماء و مشائخ کی غیبت سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ مقبولان الہی و اولیاء اللہ کی غیبت کرتے ہیں تو اس بارہ میں یہ عوام سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو یہ باتیں معمولی نہیں ہیں لوگ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں حالانکہ یہ باتیں سارے نماز روزے کو لے ڈوبیں گی جس کی تم نے آبروریزی کی ہوگی قیامت میں اس کو تمہاری نیکیاں دلوائی جائیں گی اس لئے نماز روزہ سے زیادہ حقوق آبرو کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایک بات اور یاد آئی وہ یہ کہ مال اور جان کا حق تو مرنے پر ختم ہو جاتا ہے اور آبرو کا حق بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے اگر بعد مرنے کے کسی کو مارو تو اس کو اس کا احساس نہیں ہوتا اس لئے ضرب کا قصاص بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح مرنے کے بعد کسی کا مال چراؤ تو وہ مال اس کا نہیں رہا ورنہ کا ہو گیا ہے لیکن مرنے کے بعد کسی کو ہتھم کرو اور اس کو بُرا بھلا کہو تو غیبت کا گستاہ اس وقت بھی ہوگا اور اب اس کا کفارہ یہ ہے کہ میت کے لئے بکثرت دعا و استغفار کرو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس کو تم سے راضی کر دیں گے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مرنے کے بعد ضرب کا احساس نہیں ہوتا شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو۔

کسر عظم الموء من میدنا کسره حیاً رسلان کی ہڈی کو مرنے کے بعد توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تشبیہ من کل الوجوه ہے جس سے میت کو بعد موت کے زندہ کی برابر احساس ہونے کا شبہ کیا جاوے اگر ایسا ہوتا تو شرعاً اس شخص سے قصاص لیا جاتا بلکہ یہ تشبیہ بعض وجوہ میں ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض موت کے بھی روح کو کسی قدر تعلق جسم سے رہتا ہے اور وہ ایسا تعلق ہوتا ہے جیسا کہ اس وقت ہمارے جسم کو لباس سے تعلق ہے پس اگر کوئی ہمارا اترتا ہوا کرتہ پھاڑ دے تو ہم کو کلفت ہوتی ہے اسی طرح روح کو موت کے بعد ہڈی توڑنے سے ایسی ہی کلفت ہوتی ہے۔ نیز اس تعلق کا یہ اثر بھی ہے کہ قبر کے پاس جا کر سلام و دعا جو کچھ کی جاتی ہے مردہ اس کو سنتا ہے اور شہداء میں یہ تعلق عام مومنین سے زیادہ ہوتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ان کا جسم بعد موت کے سالم رہتا ہے زمین اس کو کھا نہیں سکتی نیز اس تعلق سے بعض اولیا کو مرنے کے بعد قوت تصرف بھی عطا ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان کے مزاروں پر جا کر ان سے مرادیں مانگا کریں کہ شرعاً یہ بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ ان کے وسیلہ سے حق تعالیٰ سے دعا مانگی جائے۔ باقی ان سے یہ بھی نہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کرو کیونکہ شریعت میں اس کا کہیں ثبوت نہیں کہ وہ ایسی دعاؤں کے ماذون ہیں۔ احادیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں جا کر مردوں کے لئے دعا کی جائے یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو احیاء کی دعا سے نفع ہوتا ہے اور اس کے منتظر رہتے ہیں مگر اُسکا

۱۔ قال السخاوی فی المقاصد الحسنہ حدیث کسر عظم المیت کسیر اعظم الحی احمد والیو داؤد ابن ماجہ والبیہقی من حدیث عائشہ مرفوعاً حسنہ ابن القطان وقال ابن دقین العبدان علی شرط مسلم ورواہ الدارقطنی من وجہ آخر عنہا و زاد فی الاثم و فی روایۃ یعنی فی الاثم و ذکرہ مالک فی الموطا بلغا عن عائشہ من موقوفہ ورواہ ابن ماجہ من حدیث ام سلمہ بن ص ۱۳۸ والشرائع ۱۲ جامع عفا الشریعہ۔

ضروری اطلاع۔ خط و کتابت کرنے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

کہیں ثبوت نہیں کہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کرو تو وہ دعا  
 کر دیتے ہیں اور اولیاء سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو اپنے اجسام سے  
 تعلق رہتا ہے جس کے بعض آثار یہ ہیں کہ ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔ ایک اثر یہ  
 ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا ان کے بعد بھی حرام ہے (گویا یہ حکم آیات  
 واحادیث میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیان کیا گیا ہے مگر بعض علماء  
 نے تمام انبیاء کے لئے یہ حکم عام مانا ہے واللہ اعلم) تو کسر عظم سے جسمانی ایذا  
 تو نہیں ہوتی ہاں روحانی ایذا ہو سکتی ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے  
 ہیں کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا۔ حضرت استاد  
 علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب صاحب) فرماتے تھے کہ مردہ کے جسم کو جلانے سے  
 اس کو ایسی ایذا ہوتی ہے جیسے تمہارے چادرہ کو اتار کر کوئی تمہارے سامنے  
 جلا دے تو اس سے تم کو رنج اور غم ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کو بھی رنج ہوتا ہے  
 ظاہر ہے کہ چادرہ کے جلانے سے ہمارے جسم کو ایذا نہیں ہوتی صرف روحانی ایذا  
 ہوتی ہے۔ یہی حال بعد موت کے بدن جلانے کا ہے۔ ایک وجہ تشبیہ تو یہ ہوتی  
 دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ گستاہ میں ہو کہ جب گناہ زندہ کی ہڈی توڑنے  
 میں ہوتا ہے ایسا ہی میت کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے۔ رقت و هذا الوجه  
 اولی لانہ مبأیڈا بالروایۃ وقد ذکر تھا فی المحاشیۃ ۲ جامع) اور وجہ  
 تشبیہ ترک احترام ہے کیونکہ ہڈی توڑنے اور بدن جلانے سے میت کی بھرمتی  
 ہوتی ہے احترام میت کا اب بھی باقی ہے اور تقدیر پر اس حدیث کا مال  
 بھی حقوق آبرو کی طرف ہو جائے گا۔ حاصل یہ ہوا کہ چونکہ مردہ کا احترام بعد  
 موت کے بھی باقی ہے اور کسر عظم میں اس کی بے حرمتی اور بے عزتی ہے اس لئے  
 یہ فعل حرام ہے اور ظاہر ہے کہ اقوال کی تاثیر بے حرمتی میں کسر عظم سے زیادہ ہے  
 پس مردوں کو بُرا بھلا کہنا بھی حرام ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ اپنے مردوں  
 کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ اعمال کی جزا کو پہنچ چکے ہیں اگر واقع میں وہ بُرے ہیں



جو کوئی میرے کسی ولی کو ایذا پہنچا دے اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ دیا جاتا ہے۔ اللہ اکبر یہ وعید کتنی سخت ہے خدائی الٹیمیم کا کون مقابلہ کر سکتا ہے پھر اس وعید کا ظہور کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود اولیاء کو تصرف کی اجازت دیتے ہیں اور وہ اپنے تصرف سے اس شخص کو ضرر پہنچا دیتے ہیں اور بعض دفعہ اولیاء کوئی تصرف نہیں کرتے لیکن حق تعالیٰ کو اپنے محبوب کی بے حرمتی پر غیرت آتی ہے کہ ہمارے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا گیا۔ اس لئے حق تعالیٰ خود اس شخص کو کسی بلا میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ غرض اولیاء کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرنا بڑا سنگین جرم ہے اگر وہ حضرات اپنی شفقت سے کچھ بھی نہ کہیں تو غیرت حق نہیں چھوڑتی اس لئے اس سے بہت بچنا چاہیے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں

بس بخر یہ کر دیم دریں دیر مکافات

با درد کشاں ہر کہ در افتاد برفقاد

(ہم نے اس کائنات میں یا رہا بخر یہ کیا کہ اللہ والوں کے ساتھ جو بد تمیزی

کرتا ہے وہ خود ذلیل ہو جاتا ہے)

مولانا رومی فرماتے ہیں

بہج قوے را خدا رسوانہ کرد

تا دل صاحب دے تا مدبدر

کسی قوم کو خدائے تعالیٰ ذلیل اس وقت تک نہیں فرماتے جب تک کہ وہ کسی

اللہ کے مقبول بندے کو نہیں ستاتے)

یاد رکھو جب کوئی قوم کسی ولی کا دل دکھاتی ہے تو ان کا صبر ضائع نہیں جاتا حق تعالیٰ

بعض دفعہ ان کی طرف سے اس طرح انتقام لیتے ہیں کہ خود ان کو بھی اس کی خیر نہیں

ہوتی یہ مت سمجھو کہ حقوق العباد صرف جان و مال ہی کے متعلق ہیں بلکہ آبرو بھی حقوق

العباد میں داخل ہے اور اس کے حقوق جان و مال سے بھی زیادہ ہیں کہ بعد موت کے

بھی اس کے حقوق باقی رہتے ہیں جن میں سے ایک حق یہ بھی ہے جس کو ابھی ذکر کیا کہ

بعد مرنے کے مسلمانوں کی قبروں کا احترام کیا جائے ان کی بے حرمتی نہ کی جائے جس کو میں نے ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یہ مضمون میرے دوست نے کئی مرتبہ مجھ کو یاد دلایا مگر ہر بیان کے وقت میں اس کو بھول جاتا تھا کیونکہ فراموشی مضمون بہت کم یاد رہتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ یاد رہا۔ اور بجز اس کا بیان کافی ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض مخلصین قبرستانوں کی حفاظت کے لئے خاص اہتمام کر رہے ہیں سب مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیے اور ان کی اعانت کرنی چاہیے اس تقریر پر شاید کوئی یہ اشکال کرنے کہ تم نے بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ کی بجزمتی سے وبال آتا ہے لیکن ہم تو اب تک قبرستانوں میں لگے موتے رہے ہیں یا اولیاء اللہ کو برا بھلا کہتے رہے ہم کو تو کچھ ضرر نہیں ہوا ہم تو ویسے ہی ہٹے کٹے صحیح و سالم موجود ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض ویسا ہی ہے جیسا کہ کفار نے انبیاءؑ سے کہا تھا کہ تم روز روز ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو کہ اگر کفر کرو گے تو یوں وبال آئے گا یوں بلائیں تازل ہوں گی مگر ہم تو مدت سے کفر کر رہے ہیں اور اب بھی کفر میں مبتلا ہیں ہم پر تو کچھ بھی عذاب نہ آیا پس جو انجام کفار کے اس اعتراض کا ہوا تھا وہی انجام یہ حضرات سوچ لیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر اب تک کوئی وبال تم پر نہیں آیا تو کیا آنت دہ کے لئے بھی تمہارے پاس وحی آگئی ہے کہ تم کبھی وبال میں مبتلا نہ ہو گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا اعتراض کر رہے ہیں وہ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں لیکن وبال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری ایک باطنی ظاہری وبال تو یہ ہے کہ جان و مال کا نقصان ہو جاوے، صحت یزید ہو جاوے مثلاً اور یہ وبال آہدن ہے اور باطنی وبال یہ ہے کہ دل سیاہ ہو جاوے اس میں اعمال صالحہ کی صلاحیت باقی نہ رہے نیک کاموں سے دل گھبراتے لگے یہ وبال بہت سخت ہے کیونکہ جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے جس کا انجام ابد الابد کے لئے عذاب جہنم ہے۔ پس میں کہتا ہوں

کہ یہ لوگ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں لیکن باطنی وبال میں گرفتاری  
کہ ان کے دلوں سے قہر خداوندی کا خوف نکل گیا ہے جمبھی تو اتنی جرأت ہے  
کہ قہر خداوندی کا نام سن کر اپنی حرکتوں سے باز آنے کا قصد نہیں کرتے بلکہ اللہ  
اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اگر ان کے دلوں میں قہر الہی کا خوف ہوتا تو جس  
کام میں اس کا وہم بھی ہوتا اس سے فوراً الگ ہو جاتے۔ اسی مضمون کو مولانا  
ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں ۵۔

آتشگر نامدست این دو دچلیست

جان سیہ گشت درواں مردود چلیست

راگر آگ اندر نہیں لگی تو دھواں کس سبب سے ہے اگر دل نہیں سیاہ ہو چکا تو

یہ گستاخی کے کلمات کیوں نکل رہے ہیں ؟

یعنی تم جو کہتے ہو کہ ہم پر گناہوں کا وبال نہیں آیا مولانا فرماتے ہیں کہ تمہارے اندر  
قہر کی آگ تو جل رہی ہے اگر تمہارے اندر آگ نہیں ہے تو یہ دھواں کہاں سے  
آیا یعنی یہ کلمات جرات اور بے یاسی کے تمہاری زبان سے کیوں نکل رہے ہیں  
جن سے دل کے سیاہ ہو جانے کا پتہ چل رہا ہے اور یہ بہت بڑا قہر ہے جو ظاہری  
قہر سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ یہاں تک حقوق العباد کا ذکر ہو گیا آگے اخلاق کا ذکر  
ہے والصبریت فی الباساء والضراء وحین الباس۔ اور وہ لوگ  
صبر کرنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال کے وقت ہر چند  
کہ اخلاق باطنیہ بہت ہیں لیکن حق تعالیٰ نے ان میں سے اس مقام پر صرف  
صبر کو بیان فرمایا ہے اور اس کے تین مواقع بیان فرمائے ہیں وجہ اس تخصیص  
کی یہ ہے کہ صبر ایسی صفت ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد یقیناً اخلاق کا  
حصول خود بخود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صبر کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ عزیز و قریب  
کے مرنے پر مستقل مزاج رہے یہ بھی صبر کی ایک فرد ہے لیکن صبر کی حقیقت اس  
سے عام ہے صبر کے معنی لغت میں جس کے ہیں یعنی روکنا اور یہی معنی شریعت

میں بھی ہیں صرف ایک قید زیادہ ہے یعنی حبس النفس علی مانکرہ انسان کا اپنے نفس کو اس کی ناگواریات پر روکنا اور ناگواری کے اقسام پر شرعاً صبر کی تین قسمیں ہیں ایک صبر علی العمل (۲) صبر عن العمل (۳) صبر فی العمل۔ صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس پر زحم جانا اور قائم رہنا مثلاً نماز زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا ناغہ ان کو ادا کرتے رہنا اور صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کی وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجالانا مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ بچہ جی اتنی دیر تک تم سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے جب یہ ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو سب اعمال ٹھیک ٹھیک ادا ہوتے ہیں بعض لوگوں کو قرآن شریف کی پابندی تو نصیب ہے اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو صبر علی العمل کا درجہ حاصل ہے لیکن اعمال کو بجالاتے وقت وہ ان کے آداب و حقوق کی رعایت نہیں کرتے گڑبڑ کر دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صبر فی العمل حاصل نہیں ہوا۔ تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو ماہی التذعنہ سے روکنا شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے روکنا جن میں سے اہم صبر عن الشهوت ہے کہ نفس کے تقاضائے شہوت کو روکا جاوے اور یہ سب سے اہم اس لئے ہے کہ نفس کے دوسرے تقاضے تو ایسے ہیں کہ ان سے اگر نہ روکا جاوے تو بعد میں اس کو خود ہی بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت کا خیال کر کے نفس ان تقاضوں سے خود ہی رک جاتا ہے۔ مثلاً صبر عن الغضب بہت آسان ہے کیونکہ غصہ کے وقت گو نفس کو لذت آتی ہے مگر بعد میں کوفت ہوتی ہے مشاہدہ ہے کہ غصہ کر کے بعد میں ایک تدامت سی طاری ہوتی ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ غصہ کیا بات کو ٹال کیوں نہ دیا غصہ کر کے کبھی جی بھلا نہیں ہوتا نیز بعض دفعہ کسی پر غصہ کرنے سے اس کو دشمنی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایذا



رسائی کے درپے ہو جاتا ہے ان مرضیوں پر نظر کو کے عقد کو انسان خود ہی دبانے لگتا ہے لیکن عن الشهوت بہت مشکل ہے کیونکہ شہوت رانی میں وقت قضاء شہوت کے بھی لذت آتی ہے اور بعد میں بھی اس کی لذت رہتی ہے قضاء شہوت کے بعد کچھ کوفت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو روحانی کوفت ہوتی ہو تو ممکن ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں عام حالت یہی ہے کہ شہوت رانی کے بعد اس کا مزہ پڑ جاتا ہے پہلے سے زیادہ آگ بھڑک جاتی۔ بچے کو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو جاتا ہے اور شہوت بالنساء سے بھی اشد شہوت بالامادر ہے آج کل مردوں کے ساتھ ابتلاء عام ہو رہا ہے جس کی چند وجوہ ہیں اول تو عورتوں میں قدرتی حیا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان سے اظہار شہوت کی جرأت ذرا دقت سے ہوتی ہے اور لڑکوں میں حیا کا مادہ کم ہوتا ہے۔ دوسرے عورتوں کی حفاظت بہت کی جاتی ہے ان کے پاس پہنچنا آسان نہیں۔ اور جو کوئی پہنچ بھی جاتا ہے اس کی رسوائی جلد ہو جاتی ہے اور بچوں کی کچھ بھی حفاظت نہیں کی جاتی ان کا کسی سے پردہ نہیں ہوتا۔ تیسرے اس میں اتہام کم ہوتا ہے بچوں کے سر پر شفقت سے بھی ہاتھ پھیرا جاتا ہے اول شہوت سے بھی اب اگر کسی کے بچے کو پیار کریں اس کے سر پر ہاتھ پھیریں تو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ان کو بچوں پر شفقت زیادہ ہے شہوت کی کسی کو کیا خبر ان وجوہ سے آج کل امارد کی ساتھ ابتلاء بہت زیادہ ہے اور شہوت بالنساء سے یہ شہوت بالرجال اشد ہے کیونکہ عورتوں میں محارم کے ساتھ ابتلاء کم ہوتا ہے اکثر غیر محارم سے ہوتا ہے سو وہ کسی نہ کسی وقت تمھارے لئے حلال بھی ہو سکتی ہیں اگر وہ کنواری ہے تو اسی وقت نکاح کا پیغام دیا جاسکتا ہے اور اگر شوہر والی ہے تو ممکن ہے شوہر مر جاوے یا طلاق دیدے تو پھر تم اس سے نکاح کر سکتے ہو بہر حال اس میں جلت کی توقع تو ہے گو کسی وقت ہو گو تو وقوع ضعیف ہی ہو مگر مردوں کا حلال ہونا تو کسی وقت بھی متوقع نہیں بلکہ بعضے گناہ تو ایسے ہیں جو جنت میں جا کر گناہ نہ رہیں گے مثلاً شراب پینا دنیا میں گناہ ہے لیکن جنت میں شراب پینے کی

اور یہ شہوت بالرجال ایسا خبیث فعل ہے کہ جنت میں بھی اس کا وقوع نہ ہوگا پس یہ زنا اور شراب خواری سے بھی بدتر ہے، بلکہ شراب میں تو جو کچھ حرمت ہے سکر کی وجہ سے ہے اگر کسی تدبیر سے شراب کا سکر زائل ہو جائے مثلاً سرکہ بن جائے تو بعینہ اسی کا پینا حلال ہو جاتا ہے لیکن شہوت بالامرد کی خباثت لذاتہ ہے یہ کسی طرح بھی زائل نہیں ہو سکتی پس یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کہ اس میں کسی طرح بھی حلت کی گنجائش نہیں یہ ناپاک فعل سب سے پہلے قوم لوط میں رائج ہوا ان سے پہلے آدمیوں میں اس کا وقوع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ لوط علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔

ان اتون القاحشة ما سبقكم بها احدٌ من العالمين گو حیوانات میں بعض کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان میں پہلے سے اس کا وقوع تھا حق تعالیٰ نے قوم لوط پر جب سنگین عذاب نازل کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ فعل کیسا سنگین ہے کیونکہ کفر تو تمام کفار میں مشترک تھا لیکن انواع عذاب کا مختلف ہونا بظاہر خصوصیت افعال ہی کی وجہ سے ہے اور سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل بد قوم لوط نے بھی خود نہیں ایجاد کیا بلکہ شیطان نے ان کو سکھایا۔ یہ فعل ایسا خبیث ہے کہ انسان کا نفس باوجود اتارۃ بالسوء ہونیکے اسکی طرف از خود منتقل نہیں ہوا بلکہ شیطان خبیث نے اس کی طرف قوم لوط کو متوجہ کیا جس کا قصہ اس طرح کتابوں میں لکھا ہے کہ شیطان خوبصورت لڑکے کی صورت میں متشکل ہو کر ایک شخص کے باغ میں سے انگور توڑ کر کھا جاتا تھا، باغ والا اس کو دھمکاتا مارتا تھا مگر یہ باز نہ آتا تھا ایک دن اس نے تنگ آ کر اس سے کہا کہ کس جنت تو نے میرے باغ کا یہ بیچھا کیوں لے لیا سارے درخت برباد کر دیئے تو مجھ سے کچھ روپے لیلے اور میرے باغ کا بیچھا چھوڑ دے شیطان بصورت امر نے کہا کہ میں اس طرح باز نہ آؤں گا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے درختوں کا ناس نہ کروں تو جو بات میں کہوں اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا وہ کیا بات ہے۔ ابلیس نے اس کو یہ فعل تعلیم کیا کہ میرے ساتھ تو یہ فعل کیا کر پھر میں تیرے باغ کو چھوڑ دوں گا چنانچہ پہلی بار

تو اُس نے جبراً قہراً اپنے باغ کے بچاؤ کے لئے یہ فعل کیا پھر خود اس کو مزہ پٹر گیا وہ اس کی خوشامدیں کرنے لگا کہ تو روز آیا کر اور جتنے انگور چاہے کھالیا کر پھر اس نے دوسرے آدمیوں کو اس کی اطلاع دی اور لوگ بھی یہ فعل کرنے لگے۔ پھر کیا تھا عام رواج ہو گیا۔ اس کے بعد شیطان تو غائب ہو گیا لوگوں نے ریلوں کے ساتھ قیل کرنا شروع کر دیا۔ خدا تعالیٰ کو یہ فعل بہت ہی ناگوار ہے۔ چنانچہ لوط علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو اس فعل سے روکو ورنہ سخت عذاب آئے گا۔ انھوں نے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے آخر عذاب نازل ہوا اور سب کے سب تباہ ہو گئے۔ صا جیو! یہ فعل ایسا نجیث ہے کہ جو اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ تو بدنام ہوتا ہی ہے مگر اس سے بڑھ کر یہ ستم ہے کہ جس نبی کی امت نے اس فعل کا ارتکاب کیا ہے آج اس نبی کی طرف سے بھی بلنظاً نسبت کرنا لوگوں میں باعثِ سنگ ہو گیا۔ یعنی کوئی شخص اپنے لئے یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کو لوطی کہا جاوے۔ حالانکہ لفظ لوطی میں یا نسبت ہے اور لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور موسوی اور عیسوی اور یوسفی۔ اگر لوط علیہ السلام کی قوم نے یہ فعل بد نہ کیا ہوتا تو آج لوطی کا لفظ باعثِ فخر ہونا جیسا کہ دیگر انبیاء کی طرف نسبت کرتا باعثِ فخر ہے۔ مگر اس کبخت قوم نے اپنے ہی کے نام کو بھی نہ چھوڑا۔ صا جیو! مجھے تو اس فعل کے لئے لفظ لواطت کا استعمال بہت ہی ناگوار ہوتا ہے کیونکہ لواطت کا لفظ لوط علیہ السلام کے نام سے بتایا گیا ہے تو ایسے گندے کام کا نام نبی کے نام سے مشتق کرنا بہت ہی نا زیبا ہے جس نے یہ لفظ ایجاد کیا ہے بہت ہی ستم کیا ہے میرے نزدیک یہ لفظ عربیت میں ذلیل اور مولد ہے فصحاء نے عرب کے کلام میں اس کا استعمال نظر سے نہیں گذرا۔ عربی میں اس کے لئے اتیان فی الذبیر کا لفظ معلوم ہوتا ہے یا اور کوئی لفظ بھی ہو بہر حال لواطت کا لفظ قابلِ ترک ہے اور میرے نزدیک انعام کا لفظ بھی مولد ہے۔ عربی فصیح میں اس کا بھی استعمال نہیں ہے یہ سب بعد کے گھڑے ہوئے ہیں۔ غرض اس فعل کی خباثت عقلاً و نقلاً ہر طرح ثابت ہے اور

طبیعت سلیمہ اس سے خود ہی انکار کرتی ہے۔ اس فعل پر سوائے بد طبیعت آدمی کے اور کوئی سبقت نہیں کر سکتا۔ ایک کھلا ہوا فرق شہوت بالنساء اور شہوت بالرجال میں یہ ہے کہ عورت سے قضا شہوت کرنے کے بعد آپس میں محبت بڑھتی ہے اور مرد کی عزت عورت کی نظر میں بڑھ جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ یہ مرد ہے نامرد نہیں ہے۔ اور لڑکوں سے قضا شہوت کر کے ایک دوسرے کی نظر میں اسی وقت ذلیل و خوار ہو جاتا ہے پھر بہت جلد منقول کے دل میں عداوت ایسی قائم ہو جاتی ہے کہ وہ دوسرے کی صورت سے بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو شہوت بالرجال سے پاک و صاف ہیں مگر ان میں بھی نظر کے مرض میں اکثر مبتلا ہیں حالانکہ حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ زنا آنکھ سے بھی ہوتا ہے۔ پس مردوں کو بتظر شہوت دیکھنا بھی حرام ہے اس میں بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں حالانکہ نظر مقدمہ ہے فعل کا اور مقدمۃ الحرام حرام۔ قاعدہ فقہیہ ہے یعنی حرام کے مقدمات بھی حرام ہوتے ہیں اس لئے نگاہ کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔ بعض اکابر کا قول ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ اپنے دربار سے نکالنا چاہتے ہیں اس کو آمارد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ محبت گو فعل اختیاری نہیں مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی ان کو دیکھنا ان سے اختلاط کرنا وغیرہ۔ پس مطلب یہ ہوا کہ جس کو حق تعالیٰ اپنے دربار سے مطرود کرنا چاہتے ہیں اسی کو نظر الی الامارد۔ اور اختلاط بالامارد میں مبتلا کر دیتے ہیں اور یہ افعال اختیاریہ ہیں جو مقتضی ہو جاتے ہیں محبت وغیرہ کی طرف جس کا انجام طرد عن الحق ہے (اعاذنا اللہ منہ ۱۲)

دوسرے میری سمجھ میں یہ ہرگز نہیں آتا کہ لڑکوں سے کسی کو عشق ہوتا ہو۔ آج کل لوگوں نے فسق کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ  
 عشق ہائے کرپے رنگ بود عشق نبود عاقبت ننگے بود  
 (جو عشق رنگ و روپ ظاہری پر ہوتا ہے اسکا انجام ذلت اور بدنامی اور سوائی ہے۔)

کسی اور کا قول ہے سے

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود

ایں فسادِ خور دن گندم بود

را آدمیوں کے اندر ایک دوسرے سے نفسانی عشق ہرگز عشق نہیں بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے اگر نہ بلے تو سب عاشقی بھول جائے اور اگر ہزار میں کسی ایک کو عشق ہو بھی جائے تو اس کو عشق پر ملامت نہ کی جائے گی مگر اس کے بعد جو افعال اس سے صادر ہوتے ہیں ان پر ملامت کی جائے گی کیونکہ وہ اختیاری افعال ہیں حتیٰ کہ اس کا تصور کرتا اور تصور سے لذت لینا یہ بھی فعل اختیاری ہے جس کا چھوڑنا واجب ہے اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس حالت میں محبوب سے بعد کو نفع میں بہت زیادہ دخل ہے بتا عد سے اکثر یہ مرض خفیف ہو جاتا ہے اور تکشف میں جو علاج میں نے اس کا لکھا ہے اس سے بہت لوگوں کو نفع ہوا ہے اس پر بھی ضرور عمل کیا جاوے اس باب میں سالیکن کو خصوصاً اور تمام مسلمانوں کو عموماً سخت احتیاط کرنا چاہیے۔

ہمارے یہاں ایک ذکر ہیں ایک مرتبہ ان کو ذکر کے وقت ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت ان کے قلب پر وارد ہوئی انا منزلون علی اهل هذه القرية رجزاً من السماء بما كانوا یفسقون اور یہ منجانب اللہ الہام تھا جو کسی ہاتھ وغیرہ کے ذریعہ سے ان پر القا ہوا اور اس کا مطلب بے ساختہ ان کے دل میں یہ آیا کہ اس بستی پر جس میں میں مقیم ہوں عذاب خداوندی نازل ہونے والا ہے اور وہ عذاب بصورت طاعون ہوگا کیونکہ بعض احادیث میں طاعون کو رجز سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ آیت قوم لوط کی شان میں ہے اس لئے ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ اس عذاب کا سبب عمل قوم لوط ہے جو اس بستی میں بکثرت راجح تھا۔ اس کے بعد ایک جمعہ میں انھوں نے یہ واقعہ بیان کر دیا کہ مجھ کو یہ بتلایا گیا ہے کہ اس بستی پر عمل قوم لوط کی کثرت کی وجہ سے عذاب نازل ہوگا جو بصورت طاعون ہوگا۔



وہ خود تم کو پہنچا دیں گے کیونکہ کریموں پر بڑے سے بڑا کام بھی دشوار نہیں پس اس میں کچھ بھی دشواری نہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنے تک پہنچا دیں گے ہم اس قابل نہ تھے اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمہاری سعی سے تو پہنچنا مشکل تھا مگر سعی کے بعد وہ امداد فرماتے ہیں تم طلب اور ارادہ کرو وہ خود تم کو پہنچا دیں گے اور تمام دشواریوں کو آسان کر دیں گے اس پر شاید کسی کو یہ شکال ہو کہ صاحب ہماری تو طلب اور سعی بھی نا تمام ہے۔ پس یہ ماننا کہ سعی کے بعد حق تعالیٰ خود پہنچا دیتے ہیں مگر پہلے سعی تو ہو اور یہاں تو سعی بھی نا تمام ہے اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں ۷

ہم بایں دلہا نمنا ید خویش را

ہم بدوزو خرقہ درویش را

(اپنی نا تمام کوشش جاری رکھو لیکن حق تعالیٰ خرقہ درویش

کو (نا تمام کوشش کر) قبول فرما کر کامل فرما دیتے ہیں۔ یعنی تمہارے

پھٹے ہوئے خرقہ کو خود ہی دیتے ہیں)

خرقہ درویش سے مراد سالک کی نا تمام سعی ہے۔ یعنی وہ ایسے کریم ہیں کہ تمہاری نا تمام سعی کو بھی خود ہی کامل کر دیتے ہیں اور تمہارے پھٹے ہوئے خرقہ کو بھی خود ہی سعی دیتے ہیں اور سالکین کے قلوب میں جلوہ گری فرماتے ہیں ورنہ ہمارے قلوب اس قابل کہاں تھے کہ حضرت حق ان کو تجلی فرمائیں لیکر۔ تم جس سال میں بھی اپنی طلب اور ارادہ ظاہر کرو گونا تمام ہی طلب ہی پھر وہ اپنی رحمت سے طلب کو بھی کامل کر دیتے ہیں اور تمہارے دلوں کو بھی اپنی تجلی کے قابل کر دیتے ہیں پھر اس میں تجلی بھی فرماتے ہیں تم کو آئینہ تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں وہ تم کو بلا کر آئینہ بھی خود ہی عطا کر دیتے ہیں کہ لو اس کے اندر سے ہمارے جمال کا مشاہدہ کرو۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے بس اب تو کوئی اشکال نہیں رہا اب آپ کو سعی اور طلب سے کون مانع ہے آپ اس کا بھی

خیال نہ کیجئے کہ آپ کی طلب کامل ہے یا ناقص تم طلب میں لگوسب کامل ہو جائے گی۔ حدیث قدسی میں وارد ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذرا عا ومن تقرب الی ذرا عا تقربت الیہ باعا ومن اثنانی عیشی اتیت الیہ ہر دلۃ او کما قال جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ چلتا ہے میں اس کی طرف کھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ اس حدیث میں بالشت اور گز وغیرہ اور دوڑ کر آنا سمجھانے کے لئے ایک مثال ہے مفصود یہ ہے کہ جو میری طرف ذرا بھی توجہ کرتا ہے میں اس کی طرف دو چند اور سہ چند توجہ کرتا ہوں کہ واقعی سچ ہے اگر حق تعالیٰ اتنی توجہ اور رحمت نہ فرمائیں تو انسان کی کیا مجال تھی جو ان تک پہنچ سکے آخر انسان کو خدا سے نسبت ہی کیا ہے وہ وراء الوراۃ ثم وراء الوراۃ ہیں اس کا وہم و گمان بھی ہاں تک نہیں پہنچ سکتا تو جو ذات اس قدر بالا و برتر ہو اس کی معرفت اور محبت اور مشاہدہ انسان خود کیونکر کر سکتا ہے۔ پس یہ انہی کی عنایت ہے جو کچھ حصہ معرفت وغیرہ کا انسان کو عطا ہو جاتا ہے ورنہ واقعی وہ مسافت تو ایسی ہے

نہ گردد قطع ہر گز جادہ عشق از دوید تہا

کہ می بالذخود این راہ چون تا کاز بربد نہا

عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ راستہ مثل انگور کے

درخت کے قطع کرنے سے اور بڑھ جاتا ہے)

غیر متناہی مسافت ہے جس کا قطع کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لیکن وہ کیونکر قطع ہوتی ہے سنئے

خود بخود آل شہ ابرار برمی آید نہ بزور و نہ بزور می نہ بزور می آید



(ترجمہ) وہ محبوب حقیقی خود بخود اپنے کرم سے مل جاتا ہے زور اور زاری اور زور سے نہیں بلتا یعنی اسباب وصل کے اور تدا بیر رضا کے اختیار تو کرے مگر کام بنے گا صرف فضل ہی سے)

یعنی صورت وصول کی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء میں تو سالک میں اور محبوب حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جس کو سالک طے نہیں کر سکتا مگر جب یہ چلنا شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی مسافت اس سے قطع نہ ہوگی اب وہ خود بھی چلنا شروع کرتے ہیں اور ان کو اس مسافت کا طے کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تو وہ خود اس کے نزدیک آجاتے ہیں اس طرح وصول ہو جاتا ہے۔ پس حقیقت میں بندہ واصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں (مگر کیا ٹھکانا ہے رحمت کا کہ پھر بھی بندہ کو واصل کا خطاب دیدیا گیا ۱۲ جامع) اور اس کی مثال میں نے ایک تجویز کی ہے جس سے وصول عبد کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ مثلاً آپ کا ایک شیر خوار بچہ ہو جو آپ سے دور کھڑا ہو، آپ اس سے کہتے ہیں کہ دوڑ کر چلے آؤ۔ حالانکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اتنی مسافت یہ طے نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی اس کو بلاتے ہیں اب بچہ ہمت کر کے ایک دو قدم چلتا ہے اور گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے اس وقت باپ کو خود جوش آئے گا اور وہ دوڑ کر خود آوے گا اور اس کو گود میں اٹھائے گا تو دیکھئے یہ مسافت بعیدہ لقا سے مانع تھی کیونکہ طے ہوئی اس طرح طے ہوئی کہ بچہ تو دو قدم چل کر گر پڑا اور رونے لگا پھر باپ خود اس کے پاس آ گیا اور اس کو گلے سے لگا لیا یہی صورت سلوک باطن کی ہے کہ اول تم اپنی ناتمام طلب اور سعی ظاہر کرتے ہو تمہاری وہ سعی ہرگز وصول کے لئے کافی نہیں مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑتے ہو اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت کو جوش ہوتا ہے وہ خود آ کر تم کو گلے سے لگا لیتے ہیں مگر ہاں اس کی ضرورت بیشک ہے کہ تم بچہ کی طرح ایک دو قدم چل کر رونا تو شروع کرو۔

مولانا فرماتے ہیں ۷

ہر کجا پستی است آب آبخارود

ہر کجا مشکل جواب آبخارود

(جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہاں ہی جاتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے  
جواب وہاں ہی جاتا ہے)

۷ ہر کجا دردے دوا آبخارود

ہر کجا رنجے شفا آبخارود

(جہاں درد ہوتا ہے دوا وہاں ہی پہنچتی ہے جہاں مرض ہوتا ہے  
شفا وہاں ہی پہنچتی ہے)

۷ گرنہ گرید طفل کے جوشد لین

گرنہ گرید ایر کے خند و چین

(اگر بچہ رونا نہ شروع کرے تو دودھ ماں کا کب جوش کرے اگر

بادل نہ روئے یعنی بارش نہ کرے تو چین ہرا بھرا کب ہوتا ہے)

اور رونے اور گر پڑنے سے میری مراد یہ نہیں کہ چلانا چھیننا شروع کرو بلکہ سالک

کا رونا اور گرنا یہ ہے کہ اپنی عاجزی اور ناتوانی کا مشاہدہ کرے حق تعالیٰ کے

سامنے الحاج والبتحا کرے تو اضع اور خاکساری پیدا کرے۔ تکبر اور فرعونیت کو

دماغ سے نکال پھینکے اس کے بعد وصول میں دیر نہیں لگتی ذرا تم خاکساری اختیار

کر کے تو دیکھو۔ مولانا فرماتے ہیں ۷

ساہا تو سنگ بودی دلخراش

آزموں را یک زمانے خاک باش

(عرصہ تک تو پتھر دلخراش رہا ہے کچھ دن خاک بن کر بھی آزما لے یعنی تکبر

ترک کر کے اللہ والوں کی جوتیاں سیدھی کر لے)

۷ در بہاراں کے شود سر سبز سنگ خاک شو تا گل بر دید رنگ رنگ

ترجمہ :- (موسم بہار میں پتھر کب ہرا بھرا ہوتا ہے خاک ہو جاتا کہ تجھ سے  
اعمال صالحہ کے اور اخلاق حسنہ کے رنگ برنگ پھول پیدا ہوں یہ تو واضح  
کے برکات سے ہیں کہ آدمی صلحاء کے پاس تیار مندی سے جاتا رہتا ہے  
اور فیضان خاصان حق سے مالا مال ہوتا رہے۔)

میں نے وصول الی اللہ کی مثال جو بچہ کی حالت سے بیان کی ہے اس پر ایک  
بادشاہ کی حکایت یاد آئی۔ میں نے کسی بزرگ سے یہ حکایت سنی ہے کہ ایک  
بادشاہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے سے ایک درویش کا گذر ہوا۔ بادشاہ  
نے درویش کو آواز دی کہ ذرا میرے پاس آؤ مجھے تم سے کچھ پوچھتا ہے۔ اس نے  
کہا میں تمہارے پاس کیونکر آؤں تم بالاخانہ پر میں زمین پر اور محل کا دروازہ دو  
کیوں کہ شاہی محلات کا بڑا دروازہ وہاں سے دور تھا اور جس بالاخانہ پر  
بادشاہ تھا وہاں بہت سے دروازے اور درجے طے کر کے پہنچنا ہوتا تھا۔  
بادشاہ نے فوراً ایک کمند لٹکا دی کہ اس کو پکڑ لو۔ درویش نے اس کو پکڑ لیا  
بادشاہ نے کھینچ لیا دو منٹ میں اوپر آ گیا۔ جب وہ اوپر پہنچ گیا تو بادشاہ  
نے ان سے سوال کیا کہ تم خدا تک کیونکر پہنچے۔ انہوں نے برجستہ جواب دیا  
کہ جیسے تم تک پہنچا۔ خدا تک پہنچنا تو بہت مشکل تھا مگر میں نے خدائی کمند  
کو مضبوط پکڑ لیا تھا انہوں نے خود ہی کھینچ لیا۔ سبحان اللہ خوب ہی جواب  
دیا۔ اے صاحبو! تم بھی خدا کی کمند کو مضبوط پکڑ لیتے تو اسی طرح تم بھی ان کے  
جذیبے واصل ہو جاتے مگر افسوس ہے کہ لوگ تو کمند الہی کو قطع کر رہے ہیں۔  
صاحبو! خدا کی کمند یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے جنہوں نے مخلوق  
کو خدا تک پہنچا دیا۔ انبیاء کے بعد علماء حقانی و اولیاء امت پیدا ہوئے جو  
ہر وقت مسلمانوں کو احکام الہی اور اس تک پہنچنے کا راستہ بتلاتے رہتے ہیں  
ترغیب و ترہیب ہو رہی ہے۔ محبت الہی و معرفت کے فضائل و اصلاح نفس  
کا طریقہ بیان ہو رہا ہے مگر پھر بھی لوگوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی اور وہ اسی

طرح عقلمت میں پرٹے ہوئے ہیں پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ جو ان کو خدا تک پہنچانا چاہے اس پر طعن و ملامت چاروں طرف سے ہوتی ہے محض اس لئے کہ وہ ان کو ان کاموں سے منع کرتا ہے جو وصول الی اللہ سے مانع ہیں بس یہی کمت الہی کو قطع کرنا ہے جب تم ہی خود نہ پہنچنا چاہو تو خدا کو کیا غرض پرٹی ہے کہ جو خوشامد کر کے تم کو پہنچادے ان لزمکم وھاوانتم لھا کارہونہ الغرض صیر عن الشهوت گوئی نفسہ دشوار ہو مگر جب آدمی اس کا ارادہ کرتا ہے تو آسانی شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پھر بھی دشواری نہیں رہتی ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شہوت عورتوں اور لڑکوں ہی کے تعلق میں منحصر نہیں بلکہ لذیذ غذاؤں کی فکر میں رہتا بھی شہوت ہے۔ عمدہ لباس کی دھن میں رہتا بھی شہوت ہے۔ ہر وقت باتیں بگھارنے کی عادت ہونا بھی شہوت ہے اور ان سب شہوتوں سے نفس کو روکتا یہ بھی عن الشهوت میں داخل ہے آجکل لوگوں کو باتیں بنانے کا بہت مرض ہے بس جہاں کام سے فارغ ہوئے مجلس آرائی کر کے فضول باتیں کرنے لگے میں صرف عوام کی شکایت نہیں کرتا بلکہ میں علماء و مشائخ کو بھی مجلس آرائی سے منع کرتا ہوں کیونکہ یہ مرض ان میں بھی بہت ہے۔ بعض مشائخ کے یہاں عشاء کے بعد بھی مجلس آرائی ہوتی ہے جس سے خواجواہ نیند برباد ہوتی ہے اگر شیخ کے معمولات میں اس سے فرق بھی نہ آتا ہوتا، سب اہل مجلس یکساں نہیں ہوتے ان میں سے بعض صبح کی نماز بھی غائب کر دیتے ہیں پھر یہ بھی نہ ہو تو بلا ضرورت باتیں بنانا ظلمت قلب کا سبب ہے یہی بڑا کافی نقصان ہے۔ گو اور کوئی بھی نقصان نہ ہو خصوصاً اگر باتیں بھی شیخ کی مدح کی ہوں جو خوشامدی مرید بناتے ہوں بیچارے ممدوح کا تو اُس سے ستیا ناس ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

تن نفس شکل ست انا خارجاں از فریب داخلان و خارجان

(ترجمہ)

جسم مثل نفس کے ہے خوشامدی لوگ اس کی تحریف کر کے فریب دیتے ہیں)

۷ اینست گوید نے منم ہمراز تو آنت گوید نے منم اتبار تو  
 (کوئی کہتا ہے ہم تمہارے ہمراز ہیں کوئی کہتا ہے میں تمہارا ہمراز ہوں)  
 ۸ اوچو بیند خلق راشدست خویش از تکبر میرود از دست خویش  
 (جب وہ مخلوق کو اپنی تعریف میں مست دیکھتا ہے تو تکبر کے سبب جو اس  
 باختہ اور بے وقوف ہو جاتا ہے)

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ صبر کتنا جامع خلق ہے مگر لوگ صرف  
 اسی کو صبر سمجھتے ہیں کہ مصیبت کے وقت رویا نہ جاوے حالانکہ شہوت و  
 غضب کو روکنا بھی صبر ہے اور شہوت میں شہوت رجال و نساء و شہوت لباس  
 و شہوت طعام و شہوت کلام بھی داخل ہے اسی طرح تمام معاصی سے نفس کو  
 روکنا یہ بھی صبر میں داخل ہے۔ نیز طاعات پر پابندی کرنا بھی صبر میں داخل ہے  
 طاعات بجالانے کے وقت ان کے حقوق و آداب کو اطمینان و سکون سے ادا کرنا  
 بھی صبر میں داخل ہے۔ پس یہ ایسا جامع خلق ہے کہ بہت سے اخلاق اس کے  
 اندر داخل ہیں اسی لئے حدیث میں آیا ہے الصبر نصف الایمان اور یہی  
 راز ہے کہ حق تعالیٰ نے اخلاق میں سے اس جگہ صرف صبر کو بیان فرمایا۔  
 اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ اس آیت میں تمام اجزاء دین بالا بحال مذکور  
 میں آگے صبر کے چند مواقع جو مہتمم بالشان ہیں بیان فرماتے ہیں فی الباساء  
 والضراء وحين الباس۔ یعنی وہ صبر کرتے ہیں باسار میں اور ضراء میں اور باس  
 کے وقت ان الفاظ کی تفسیر مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ باسار سے فقر و تنگدستی  
 مراد ہے اور ضراء سے بیماری اور باس سے حرب۔ لیکن عموم الفاظ پر نظر کر کے  
 یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ باسار سے تو فقر و تنگدستی ہی مراد ہو جس کا حاصل یہ ہو گا  
 کہ فقر و تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے مخلوق کے مال و دوات پر نظر نہ  
 کرے نہ ان سے کچھ توقع رکھے اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہوگی۔ اور ضراء  
 سے مطلق بیماری مراد ہو خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ ظاہری مرض میں تو صبر یہ ہے کہ

لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے خدا سے دل میں مکدر نہ ہو اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہو گئی۔ اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراضِ قلبیہ کے مقتضاً پر عمل نہ کرے ہمت سے ان کا مقابلہ کرے مثلاً کسی میں شہوتِ بالاسار یا بالرجال کا مرض ہے تو اس کے مقتضاً پر عمل نہ کرے اور ہمت کر کے عورتوں اور مردوں کی طرف نگاہ نہ اٹھائے ان سے اختلاط نہ کرے بلکہ بعد اختیار کرے اسی طرح بخل کا مرض ہو تو اس کے مقتضاً پر عمل نہ کرے بتکلف خدا کے راستہ میں مال خرچ کر دیا کرے و علیٰ ہذا تمام امراض کو اسی پر قیاس کر لیا جائے۔ اور باس سے مراد مطلق شدت و پریشانی ہو تو یہ تعسیم بعد تخصیص کے ہو جائے گی یعنی فقر و قافتہ اور امراضِ ظاہریہ و باطنیہ میں بھی ہمت سے کام لے اور اسی طرح جو پریشانی بھی لاحق ہو اس میں مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے۔ پس اب صبر کا حاصل یہ ہوا کہ موجد کامل بن جانا چاہیے جس کی یہ شان ہوتی ہے۔

موجد چہ برپائے ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی بر سرش  
امید و ہراسش بنا شد ز کس ہمیں ست بنیاد توحید و بس  
(موجد یعنی اہل توحید کے قدموں پر اگر سونا بکھیر دو یا ان کی گردن  
پر تلوار رکھ دو تو بھی نہ کسی سے امید رکھتے ہیں نہ کسی سے خوف رکھتے  
ہیں اور یہی توحید کی اصل بنیاد ہے)

جب مقامِ صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے: ان تمام اجزاء  
شریعت کو بیان فرما کر آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں اولئك الذين  
صداقوا و اولئك هم المتقون ۶ یہی لوگ ہیں جو صادق ہیں اور یہی لوگ  
متقی ہیں۔ یہ جملہ گویا بمنزلہ مہر کے ہے کہ سارا مضمون بیان فرما کر انیر میں مہر لگا دی  
کہ یہی لوگ صادق و متقی ہیں۔

چونکہ تفصیل سابق سے یہ بات معنوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں جو اوصاف

مذکور ہیں وہ تمام اجزاء دین کو جامع ہیں تو اب جملہ اولئک الذین صدقوا اولئک هو المتقون سے یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ صادق و متقی کامل فی الدین کو کہتے ہیں اور یہ کہ تقویٰ و صدق کمال فی الدین کا نام ہے لہذا آیت مذکورہ میں جو میں نے دعویٰ کیا تھا کہ اتقوا اللہ وكونوا مع الصّٰلِحِیْنَ کے معنی یہ ہیں اکملوا فی الدین وكونوا مع الکاملین۔ یہ دعویٰ بالکل بے غبار ہو گیا اور قرآن ہی سے اس دعویٰ کی تائید مل گئی (اور ظاہر ہے کہ جس تفسیر کی تائید قرآن کی دوسری آیتوں سے ہو جائے وہ زیادہ اولیٰ ہے ۱۲)

معنی آیت کے یہ ہونے کہ اے مسلمانوں! دین میں کامل ہو جاؤ جس کا طریقہ بھی آگے بتلاتے ہیں کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاملین کے ساتھ ہو جاؤ۔ صاحبو! جو طریقہ کمال حاصل کرنے کا حق تعالیٰ نے بتلایا ہے واللہ کوئی سالک کوئی محقق ہرگز نہیں بتلا سکتا یہ بات کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ کاملین کی معیت سے بھی کمال حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاملین کی خالی معیت ہی معیت حصول کمال کے لئے کافی ہے ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص ساہا سال کاملین کے ساتھ رہے اور خود کچھ نہ کرے تو اس کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا حقیقت یہ ہے کہ اصل طریق تو کمال فی الدین حاصل کرنے کا یہ ہے کہ اعمال میں کمال حاصل کرو۔ اعمال میں کمال حاصل کرنا یہ ہے کہ طاعات کو بجالاؤ اور معاصی سے اجتناب کرو۔ چنانچہ آیت لبس البران تولوا و جو حکم الخ میں انہی اعمال کو برّ کافی فرمایا ہے اور ان کو بیان فرما کر ان لوگوں کا متقی اور صادق ہونا بتلایا ہے جو ان اعمال کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس سے اعمال پر مدار کمال ہونا بخوبی ظاہر ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ اعمال میں کیسے کامل ہوں کیونکہ کمال فی الاعمال کی تحصیل میں ایک مانع پیش آتا ہے جو کہ نفس ہے ہر عمل میں اس کا ایک تقاضا مزاحم ہوتا ہے۔ شریعت حکم دیتی ہے کہ جاڑوں میں پانچوں وقت

وضو کرو و نفس کی آرام طلبی اس کی مزاحمت کرتی ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ زکوٰۃ سالانہ ادا کرو۔ نفس کا تقاضا ہے کہ بخل سکی مزاحمت کرتا ہے، شریعت کا حکم ہے کہ رشوت اور سود مت لو نفس کا تقاضا ہے کہ حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے، شریعت کا حکم ہے کہ لہہ کول اور نامحرم عورتوں کو بُری نگاہ سے نہ دیکھو تقاضائے شہوت اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ اسی طرح حکم ہے کہ فقر و تنگدستی میں مخلوق کے مال پر نظر نہ کرو تقاضائے حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے علیٰ ہذا القیاس جتنے احکام شریعت کے ہیں ہر عمل کے مقابلہ میں اُس کے خلاف نفس کا ایک تقاضا ہے جو اس حکم کی مزاحمت کرتا ہے تو خدا تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا تو حکم کر دیا اور اس کا طریقہ بھی بتلا دیا کہ اعمال کا جمع کرنا ہے مگر اس نفس کے ان بے شمار تقاضوں کا کیا علاج ہو جو ہر حکم پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں سو حق تعالیٰ نے کو نوا مع الضدین ہ میں اسی مانع کو مرتفع فرمایا ہے اور نفس کی اس مزاحمت ہی کا علاج بتلایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ طریق حصول کمال فی الدین یعنی تکمیل اعمال ظاہری و باطنی میں جو مزاحمت نفس کی پیش آتی ہے اس معیت صادقین یعنی کاملین میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مزاحمت مرتفع ہو جاتی ہے یعنی نفس میں اس درجہ کا تقاضا نہیں رہتا اور جو کچھ رہتا ہے اُس کی مقاومت سہل ہو جاتی ہے۔ پس اعمال کی تکمیل سہولت سے یستر ہو جاتی ہے اور اسی طرح کمال فی الدین حاصل ہو جاتا ہے دیکھئے کتنا آسان اور سہل علاج ہے گویا دمڑی کا نسخہ اور ہزاروں کا فائدہ ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جرّی بوٹی کا علاج ہے جس میں دھیلہ کا بھی خرچ نہیں اور اس آیت میں جو طریقہ دینی کمال حاصل کرنے کا بتلایا گیا ہے حقیقت میں وہ اصل طریق کمال کے مانع کا مرتفع کرنے والا ہے لیکن چونکہ وہ طریق بدو ن اس مانع کے مرتفع ہوئے دشوار تھا اس لئے اگر اسی کو طریق کمال کہدیا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ علت نامہ وجوہ شرائط



ار تفع موانع سے مرکب ہوتی ہے اور ان دونوں میں اس میں دخل ہوتا گو وجود معلول کا ان سب سے نہیں ہوتا وجود صرف جزوِ اخیر سے ہوتا ہے اور جو طریقہ تقاضائے نفس کی مزاحمت کو مضمحل کرنے کا اس آیت میں بتلایا گیا ہے واللہ اس سے سہل علاج کوئی نہیں بتلا سکتا۔ فن شناس لوگوں نے نفس کی اصلاح کے لئے نہ معلوم کیا کیا طریقے تجویز کر رکھے ہیں جن پر عمل کرنا ہمت والے کا کام ہے مگر یہ طریقہ تو ایسا آسان ہے کہ کسی کو بھی اس پر عمل دشوار نہیں اور یہ محض قرآن کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ کالمین کی صحبت میں یہ اثر ہے کہ ان کے پاس جا کر نفس کا تقاضا مضمحل ہو جاتا ہے کالمین تو بھلا کامل ہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عام مومنین کے مجمع میں جا کر دیکھو کہ جس وقت سب لوگ نماز کا اہتمام کرتے ہوتے ہیں تو بے نمازی کے دل میں بھی نماز کا تقاضا ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو آخر یہ بھی تو اولیاء اللہ ہیں کیونکہ ولایت کی دو قسمیں ہیں ایک ولایت عامہ دوسری ولایت خاصہ ولایت عامہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اس لئے عام مومنین کی صحبت میں بھی ضرور اثر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کیفما اتقوا جمع ہو گئے ہوں چھانٹ چھانٹ کر بدعاش جمع نہ کئے گئے ہوں۔ لیکن یہ بات سن کر کوئی صاحب ناز نہ کریں کہ جب عام مسلمان بھی ولی ہیں تو پھر ہم کو کسی اور ولی کی کیا ضرورت ہے ہم کیوں کسی کے پاس جاویں کیونکہ ولایت عامہ سے جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے باغیوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں عام رعایا کو بادشاہ کا دوست اور وفادار کہہ دیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ باغی اور دشمن نہیں مگر کیا اتنی بات پر کوئی اکتفا کیا کرتا ہے اور کیا اس سے عام رعایا بادشاہ کے مقربین میں داخل ہو گئی ہرگز نہیں کیونکہ رعایا میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو چوری اور بد معاشی کرنے کی سزا میں قید خانہ بھیج دیا جاتا ہے جہاں روزانہ نوابیدیں

ان کی کمر پر لگائی جاتی ہیں مگر اس حالت میں بھی یہ شخص بہ نسبت باغی کے بادشاہ کا وفادار اور اس کی رعیت ضرور کہلاتا ہے جس کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ کبھی مراحم خسروانہ سے اس کو رہا بھی کر دیا جاتا ہے اور باغی مراحم خسروانہ کا اہل نہیں رہتا۔ تو ولایت عامہ بدون ولایت خاصہ کے ایسی ہی جیسے جیل خانہ کے مجرموں کو باغیوں کے مقابلہ میں بادشاہ سے تعلق ہوا کرتا ہے مگر عاقل محض اتنے تعلق پر کبھی کفایت نہیں کیا کرتا وہ خاص تعلق کے لئے کوشش کیا کرتا ہے چنانچہ میں اسی کو پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد میں درجہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے لیکن عام مومنین کی صحبت کا اثر بیان کرنے سے میرا مقصود یہ تھا کہ جب ناقصین کی صحبت میں یہ اثر ہے تو خود سمجھ جاؤ کہ کاہلین کی صحبت میں کیا کچھ اثر ہوگا۔

جرعہ خاک آمیز چوں مچنوں کند

صاف گر باشد ندانم چوں کند

(وہ جرعہ جو خاک ملا ہوا ہے اس طرح تم کو مرست کرتا ہے تو صاف اگر

پیو گے تو تمہاری کیا حالت ہوگی یعنی گناہوں کے نیک اعمال کے

اثرات جب یہ ہیں تو تقویٰ کے ساتھ کیا اثر محسوس ہوگا۔)

جب خاک آمیز گھونٹ میں اتنی تاثیر ہے تو صاف اور مقطر میں تو نہ معلوم کیسی مستی ہوگی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جس شخص کی رات کو آنکھ نہ کھلتی ہو وہ چند دنوں ایسے لوگوں میں جا کر رہے جو رات کو اٹھتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی تہجد کی عادت ہو جائے گی۔ اسی طرح جس شخص کو ذکر اللہ سے مناسبت نہوتی ہو وہ کچھ دنوں ذکرین کی جماعت میں رہے بہت جلد ذکر سے مناسبت ہو جائے گی کیونکہ ذکرین کے حلقہ میں رہ کر خود بخود اندر سے دل تقاضا کرے گا کہ میں بھی ذکر کروں گویا آج ہی سے اس کا وہ تقاضا جو ذکر کے خلاف تھا مضمحل ہو گیا۔ پھر جو لوگ کامل ہیں ان کی صحبت میں تو کیا کچھ نفع ہوگا اس کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے۔ بس ان کی صحبت کا نفع یہ ہے۔

آہن کہ بیپارس آشنا شد

فی الحال بصورت طلا شد

روہ لوہا جو پارس پتھر کے ساتھ لگ جاتا ہے فوراً سونا بن جاتا ہے  
یعنی اہل اللہ کے ساتھ رہیں تو برے لوگ بھی اچھے بن جاتے ہیں،  
جیسے ایک پتھر مشہور ہے جس کا نام پارس ہے اس کی یہ تاثیر سنی گئی ہے کہ لوہے کو  
اس سے مس کر دیا جائے تو وہ خالص، سونا ہو جاوے یہ خاصیت کالمین کی صحبت  
میں ہوتی ہے مگر کالمین کی صحبت کے موثر ہونے کی ایک شرط ہے اور اس کے  
لئے ایک پرہیز بھی ہے۔ پرہیز تو یہ ہے کہ اعمال و افعال میں اس کی مخالفت  
نہ کرو۔ اور شرط یہ ہے کہ اپنے حالات سے اس کو اطلاع دیتے رہو تمہارے  
نفس میں جو مرض بھی ہو اس سے صاف صاف کہو و حیا نہ کرو کیونکہ طبیب اور  
ڈاکٹر کے سامنے بضرورت علاج بدن مسطور کا کھولنا جائز ہے۔ اسی طرح طبیب  
روحانی سے نفس کے امراض بیان کر دینا جائز ہیں تو ایک مرتبہ اپنا سارا  
کچا چھٹا اس کے سامنے کھول کر رکھ دو اور اس سے مت ڈرو کہ ان کی نظریں  
ذلیل ہو جاؤ گے۔ بخدا اہل اللہ کی نظریں ان سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں  
وہ اپنے کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ فساق و فجار بھی اپنے کو اتنا ذلیل نہیں  
سمجھتے اس سے بالکل مطمئن رہو پھر جب تم اپنا حال بیان کر چکو تو اس پر  
وہ کچھ بتلا دیں اس کا اتباع کرو یہی طریقتہ علاج ظاہری میں بھی آپ  
کرتے ہیں کہ پہلے آپ اپنا حال طبیب سے ظاہر کرتے ہیں پھر وہ نسخہ تجویز  
کرتا ہے آپ اس کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ پرہیز بتلاتا ہے اس سے  
آپ بچتے ہیں۔ یہی طریقتہ حضرات کالمین کی صحبت میں اختیار کرتا چاہئے۔  
بھلا اگر کوئی شخص طبیب کے پاس روزانہ محض ملاقات کے طور پر چلا جایا  
کرے نہ اس سے اپنا حال کہے نہ نسخہ پوچھے تو کیا اس طرح وہ مرض سے شفا پا سکتا  
ہے ہرگز نہیں اسی طرح اولیاء کی صحبت میں محض زیارت و ملاقات کی نیت سے جانا

امراض باطنیہ سے شفا حاصل ہونے میں کافی نہیں گو ان کی زیارت بھی موجب ثواب ہے یہ الگ بات ہے۔ مگر اس وقت محض ثواب حاصل کرنے سے گفتگو نہیں ثواب کے لئے تو اور بھی بہت سے کام ہیں یہاں تو کمال دین حاصل کرنے سے بچت ہو رہی ہے تو اولیاء کا ملین سے کمال دین اسی طرح حاصل ہوگا جیسا کہ میں نے بیان کیا اس کا ہمیشہ لحاظ رکھو اور جب ان کے پاس جاؤ یا خط لکھو تو اس کا قصد کرو کہ ان کے سامنے نفس کے امراض بیان کریں گے اور جو وہ بتلا دیں گے اس پر عمل کریں گے۔ پس اولیاء کا ملین کے پاس رہنے کی صورت میں بھی عمل کرنا آپ ہی کو پڑے گا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ نہ کرو اور کابل بن جاؤ مگر اتنا فرق ہوگا کہ پہلے تم عمل کا قصد کرتے تھے اور اس کے خلاف تقاضا پیدا ہوتا تھا اور ان کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا تقاضا پیدا ہوگا اور دوسرا تقاضا مضحک ہو جائے گا تو کیا یہ تھوڑا نفع ہے کہ جس کام کا کرنا پہلے مشکل تھا آج آسان ہو گیا اور صرف آسان ہی نہیں بلکہ اس کی طرف دل کو از خود تقاضا ہونے لگا کہ اس کے بغیر تم کو چین نہیں ملتا۔ صاحبو! یہ بہت بڑا نفع ہے اس کو کم مت سمجھو کا ملین کی صحبت میں جا کر بس یہ بات پیدا ہوتی ہے جو ان سے دور رہ کر نہیں پیدا ہوتی جن لوگوں کو کا ملین سے تعلق نہیں وہ متقی ہو سکتے ہیں مگر بڑی مصیبت کے ساتھ ان کو تقویٰ حاصل ہوگا اور جن کو ان سے تعلق ہے ان کو بہت آسانی اور راحت سے تقویٰ حاصل ہو جاتا ہے یہ تو ان کی صحبت کا اوئی اثر ہے کہ اعمال میں سہولت ہو جاتی ہے اس کے بعد نور فہم اور معرفت اور احوال و کیفیات کی سلامتی مقامات باطنیہ کی ترقی حاصل ہوتی ہے اس کی تو کچھ انتہا نہیں پس مضمون اس آیت کے متعلق مجھ کو بیان کرنا تھا جس کو میں بیان کر چکا اور اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ گو میں نے آج کوئی نیا مضمون نہیں بیان کیا مگر تحدت بالنعمة کے طور پر کہتا ہوں دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے آج خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ آپ کو بتلا دیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ میں نے سب کو واصل کر دیا ہے کیونکہ وصول کا آسان طریق بتلا دینا یہ بھی واصل کر دینا ہے اور آج میں نے

ایسا آسان راستہ آپ کو بتلا دیا ہے جو شاید کبھی کان میں نہ پڑا ہو گا اب بھی اگر قدم نہ اٹھاؤ اور واصل بننے کی کوشش نہ کرو تو حجّت الہیہ ختم ہو چکی ہے۔ اب میں اس آیت کے متعلق ایک دو بات مختصر طور پر بیان کر کے تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں ایک بات یہ جاننے کی ہے اور اجمالاً پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس آیت میں صدق سے مراد محض زبان سے سچ بولنا نہیں ہے کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جس صدق کو کمال دین بتلایا ہے وہ تو ہم کو حاصل ہے کہ نہ ہم سچ بولتے ہیں پس سمجھ لیجئے کہ صدق کے معنی نچنگلی کے ہیں اور اسی سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال و افعال و اقوال میں مرتبہ رسوخ حاصل کر چکتا ہے۔ صدق کے معنی جو اصطلاح لغات و بلغا میں بیان کئے گئے ہیں مطابقت الخیر للصحیح عنہ یہ معنی اصطلاح شرعی سے خاص ہیں شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی اقوال کو بھی احوال کو بھی۔ اقوال کا صدق تو یہی ہے کہ بات پکی ہو یعنی واقعہ کے مطابق ہو کچی بات نہ ہو جو کہ واقع کے خلاف ہو جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو حکم شرعی کے خلاف نہ ہو۔ پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اور اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔ اور احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہوں پس جو احوال خلاف سنت ہوں وہ احوال کا ذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے موافق ہوتے ہوں اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔ نیز صدق احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا جیسا کہ بعض لوگوں کو کسی وقت خوف کا یا توکل کا غلبہ اپنے اوپر معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا اس کو صادق الاحوال نہ کہیں گے۔ یہ مطلب ہتیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہیے کہ جو حالت طاری ہو بعد میں وہ مقام ہو جائے اس میں سا لکین کو بہت دھوکہ ہوتا ہے بعض دفعہ وہ محض ہم

سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو تسلیم و رضا یا توکل ورجا کا حال حاصل ہے مگر محقوڑے عرصہ کے بعد اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا جس سے اس حالت کا ان کا وہم ہونا ظاہر ہو جاتا ہے غرض صدق شریعت میں صرف اقوال کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس سمجھنے سے اغلاط میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی کو امام غزالی نے لکھا ہے کہ منجملہ احداثات کے ایک یہ بھی اعدا ہے کہ لوگوں نے اصطلاحات شرعیہ کو بدل دیا ہے جیسے فقہ نام رکھا ہے کنز و ہدایہ کے پڑھ لینے کا حالانکہ فقہ شریعت میں محض کتاب پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک خاص فہم ہے جس سے ملکہ راسخ پیدا ہو جاتا ہے احکام کے سمجھنے کا۔ نیز سلف صالحین فقیہ ایسے کو کہتے تھے جس کو احکام کی فہم کے ساتھ عمل کامل بھی حاصل ہو مگر آجکل فقہ کے لئے عمل کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اسی طرح بہت سے الفاظ شرعیہ کو شرعی اصطلاح سے بدل دیا گیا ہے مثلاً شریعت میں علم مخصوص ہے علوم نقلیہ شرعیہ کے ساتھ مگر آج کل بعض لوگوں نے اس کو عام کر دیا ہے۔ نیچری فرتہ اس مرض میں زیادہ مبتلا ہے انہوں نے علم میں سائنس اور جغرافیہ کو بھی ٹھونس دیا ہے انگریزی زبان سیکھنے کو بھی وہ علم میں داخل کرتے ہیں چنانچہ میں نے بعض تحریریں ایسی دیکھی ہیں جن میں علم کی فضیلت احادیث سے ثابت کر کے اس پر انگریزی تعلیم اور سائنس وغیرہ کی کھنڈی کو مضرع کیا ہے وہ اپنی تحریروں میں سائنس وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں اطلبوا العلم ولو بالصین سے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ تعوذ باللہ احادیث نبویہ میں جس علم کی ترغیب دی گئی ہے ان میں یہ علم بھی داخل ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے یا امر کیا گیا ہے وہاں صرف علوم نقلیہ شرعیہ مراد ہیں جن میں اصل الاصول علم فقہ علم حدیث و علم قرآن ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے مقدمات کو حکم مقدمۃ الواجب واجبوں کے ساتھ ملحق کر دیا جائے مگر سائنس و جغرافیہ تو ان علوم کے لئے مقدمات بھی نہیں ان کو کس دلیل سے علم شرعی میں داخل کیا جاتا ہے اور انہر احادیث سے

استدلال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے یہ سخت مغالطہ ہے جس کی طرف بہت کم لوگوں کو التفات ہے یہی حال اصطلاح صدق میں ہو رہا ہے کہ لوگوں نے اس کو محض اقوال کے ساتھ خاص کر لیا ہے حالانکہ شرعاً وہ افعال و احوال سب کو عام ہے خوب سمجھ لو۔

اب ایک بات یہ رہ گئی کہ جب تقویٰ اور صدق دونوں کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا تو سوال پوچھا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ کا ذکر مقدم اور صدق کو مؤخر کیوں کیا گیا کیونکہ آیت کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ یوں فرمادیتے یا ایہا الذین امنوا صدقوا وكونوا مع المنتقین اس کے بھی وہی معنی ہوئے کہ اے مسلمانو دین کامل حاصل کرو اور کاپلین کے ساتھ رہو۔ جب یہ مضمون صدق کو مقدم اور تقویٰ کو مؤخر کر نیسے بھی حاصل ہو سکتا تھا تو پھر تقویٰ کو مقدم کیوں کیا گیا۔ یہ سوال میرے ذہن میں اسی وقت آیا ہے اس سے پہلے یہ سوال ذہن میں نہ تھا اس کا جواب بھی الحمد للہ اسی وقت ذہن میں آیا ہے اس کو بیان کرتا ہوں اگر کسی کے ذہن میں اس سے اچھا جواب ہو وہ اس کو بیان کر دے میرے نزدیک اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کے تتبع سے تقویٰ کے تو درجات چند در چند معلوم ہوتے ہیں اور صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے لیس علی الذین امنوا و عملوا الصالحات جناحاً فیہا طعموا اذا ما اتقوا و امنوا و عملوا الصالحات ثم اتقوا و امنوا ثم اتقوا و احسنوا واللہ یحب المحسنین ۵ شان نزول آیت کا یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ شراب کو مسلمانوں پر حرام کر دیا تو بعض صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ہم میں جو لوگ تحریم سے پہلے شراب پیتے تھے مر گئے ہیں کہیں ان کو گناہ نہ ہوا ہو۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس وقت تک شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی تو انھوں نے حرام کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا پھر صحابہ کو ان پر گناہ کا وہم کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے

کہ اتنی بات تو صحابہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت حرمت خمر کا نزول نہ ہوا تھا لیکن ممکن ہے کہ ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ نہ معلوم اس وقت تک جو شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ ہے کہ شراب اب تک واقع میں حلال تھی یا یہ سبب یہ ہے کہ واقع میں تو وہ پہلے بھی حرام تھی لیکن چونکہ ہم لوگ اس کے عادی بہت زیادہ تھے تو دفعۃً اس کی تحریم اس وجہ سے نازل نہیں کی گئی کہ ہم اس پر عمل نہ کر سکیں گے پھر تدریجاً جب ہمارے اندر قابلیت عمل زیادہ ہو گئی اس وقت حکم تحریم نازل ہو گیا۔ پس صورت اول میں تو جن لوگوں نے تحریم سے پہلے شراب پی تھی انھوں نے حلال کا ارتکاب کیا لیکن دوسری صورت میں حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے گو بوجہ نص نازل نہ ہونے کے ان کو گناہ نہ ہوا ہو لیکن شاید ان کے درجات میں کچھ کمی اس لئے ہو گئی کہ وہ حرام فی نفسہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دتیا سے گئے ہیں ۱۲ جامع، اس شبہ کا ازالہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اس چیز میں جو انھوں نے (اب تک) کھایا یا پیا ہے (یعنی حکم تحریم سے پہلے شراب پینے میں تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہوا) جبکہ وہ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور نیک اعمال کرتے رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور اہل اخلاص سے کام لیتے رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ اہل اخلاص سے محبت رکھتے ہیں اس جگہ اصل مقصود تو یہ بتلانا تھا کہ نزول تحریم سے پہلے جن لوگوں نے شراب پی ہے ان پر اس فعل کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔ لیکن لیس علی الذین آمنوا و عملوا الصالحات جناحٌ فیما طعموا سے چونکہ بظاہر گناہ کی نفی مطلقاً ہو رہی ہے اس لئے آگے قاعدہ کلیہ کے طور پر وہ شرائط بھی بیان فرمادیں جن کے اجتماع کے بعد گناہ کی نفی مطلقاً صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ اگر کسی شخص نے



تحریم خمر سے پہلے شراب بھی پی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو یہ گناہ تو صحیح ہے کہ شراب کی وجہ سے اس کو گناہ نہیں ہوا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو کچھ بھی گناہ نہیں ہوا۔

پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جب وہ لوگ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں جن کی حرمت اس وقت نازل ہو چکی تھی۔ نیز ان اعمال صالحہ کو بھی بجالاتے رہے ہوں جن کا امر اس وقت نازل ہو چکا تھا تو پھر ان کو شراب پینے کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔ اب اس جگہ ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب ان کو ایک بار مومن کہہ دیا گیا اور اس کے بعد تقویٰ سے ان کو موصوف کر دیا گیا تو پھر دوبارہ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا کے ذکر سے کیا مقصود ہے یہ ایمان کے بعد ایمان لانا اور تقویٰ کے بعد پھر تقویٰ کرنا کیسا ہے تکرار ایمان کا جواب تو یہ ہے کہ ایمان کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک مرتبہ ایمان کا یہ ہے کہ شرک و کفر سے توبہ کر لے یہ درجہ تو ایمان کا وہ ہے جو صحت کے لئے شرط ہے کہ اس کے بغیر کوئی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا اور ایک مرتبہ ایمان کا وہ ہے جو اعمال صالحہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس کے دل میں پیوستہ اور جاگزیں ہو جانا اور اس پر ثبات و استقامت حاصل ہونا دوبارہ لفظ اٰمَنُوْا میں اس درجہ کی طرف اشارہ ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایمان لا کر وہ اعمال صالحہ کرتے رہے اور محرمات سے بچتے رہے تو اس سے ان کو ایمان پر مدامت و استقامت حاصل ہوئی پھر اس کے بعد جیسے اعمال ہوتے ہیں ویسا ہی ایمان ان سے پیدا ہوتا ہے مطلق مدامت و ثبات علی الایمان کہ اعمال صالحہ کے ہمیشہ بجالانے سے ہر شخص کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس شخص کے اعمال ناقص ہیں ان سے جو ایمان پیدا ہوگا وہ بھی ناقص ہوگا اور جس کے اعمال کامل ہیں ان سے کامل ایمان پیدا ہوگا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

تیسری مرتبہ ذکر ایمان سے اس درجہ کی طرف اشارہ ہے کہ بعد ثبات علی الایمان کے حسب اعمال ان کو ایمان میں ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے اس کے بعد پھر ایمان کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ احسان کا ذکر فرمایا جس کے معنی شریعت میں اخلاص کے ہیں اور یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اسی کو صدق سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور صدیق بھی صا احسان ہی کو بولتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ اس کے بعد ترقی اعمال سے درجہ احسان کا عطا ہوتا ہے اور یہی درجہ ایمان کا مطلوب ہے اور جو شخص اس درجہ میں فائز ہوتا ہے وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے پھر اس کو کچھ عذاب اور گناہ نہیں ہوتا کیونکہ محبوب مطیع کو کوئی بھی عذاب نہیں دیا کرتا۔ یہ جواب تو تکرار ایمان کے اثر کمال کا ہوا اور اسی تکرار تقویٰ کا جواب بھی نکل آیا وہ یہ کہ تقویٰ کے بھی مدارج مختلف ہیں۔ ایک تقویٰ تو یہ ہے کہ کفر و شرک سے بچے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرّمات کا ارتکاب نہ کرے پھر جیسے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا ہے گا حتیٰ کہ درجہ احسان جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے وہی تقویٰ کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ پس اس آیت سے تقویٰ کے مراتب کا چند درجہ ہونا معلوم ہو گیا اور صدق میں ایسے مدارج کی کوئی دلیل نہیں اور آیت براہین اولئک الذین صدقوا والہم ہے صدق کے خاص ہونے پر انتہائی درجہ کے ساتھ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ صدق کے درجات مختلف ہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے جس کو میں نے ابھی بتلایا ہے کہ احسان ہی کا دوسرا نام شریعت میں صدق و اخلاص ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ اگر حق تعالیٰ اس طرح فرماتے۔ یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ وكونوا مع الصّٰدِقِیْنَ تو سامعین کے دل پر ایک پتھر سا رکھا جاتا وہ یہ سمجھتے کہ ہم کو اول ہی دن میں کامل بن جانے کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ شروع ہی سے کامل بننا دشوار ہے اس لئے اول صدق کو بیان نہیں فرمایا بلکہ تقویٰ کا ذکر مقدم کیا کیونکہ اس کے درجات مختلف ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اول ہی دن میں کامل بننے کا حکم ہے بلکہ سامعین سمجھ لیں گے کہ تقویٰ کے درجات بہت ہیں مطلب یہ ہے کہ تدریجاً یکے بعد دیگرے تقویٰ کے تمام درجات حاصل کرتے رہو۔ یہاں تک کہ تم درجہ صدق میں پہنچ کر صادقین اور کاملین کے ساتھ مل جاؤ گے جس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ظاہر میں ان کی صحبت اختیار کرو پھر باطناً بھی ان جیسے ہو جاؤ گے اور درجات تقویٰ کا مختلف ہونا آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم کے شان نزول سے بھی واضح ہو جاتا

ضادری اطلاع، خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کر لے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اول فانقوا اللہ حق تقاۃ کا نزول ہوا تھا صحابہؓ اس سے ڈر گئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی سے حق تقوے لازم ہو گیا۔ حالانکہ شروع ہی سے حق تقوے کا حصول دشوار ہے حق تقویٰ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جیسا تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے وہ اختیار کرو۔ اتقوا اللہ حق تقاۃ میں یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور اس کی تکلیف تکلیف مالا یطاق ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجالاؤ۔ آیت میں ہی معنی مراد ہیں اور گو یہ تقویٰ طاقت سے خارج نہیں کیونکہ اس کا مکلف کیا جانا دلیل ہے اس کے تحت الاختیار ہونے کی لیکن ابتداء ہی سے انسان کا اس درجہ میں پہنچ جانا دشوار ضرور ہے گو ممکن نہیں۔ صحابہؓ کے خوف کا یہی سبب تھا۔ پس وہ اس لئے خائف ہوئے کہ یہ درجہ گو اختیار سے باہر نہیں مگر عادتاً پہلے ہی دن اس کا حاصل ہو جانا دشوار ہے اور وہ صیغہ امر فانقوا اللہ سے یہ سمجھے کہ ہم کو اس وقت اس درجہ کی تکمیل کا امر ہو رہا ہے نہ اس لئے کہ صیغہ امر فور کو مقتضی ہے بلکہ اس لئے کہ محاورات میں بسا اوقات امر فور کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے اور صحابہ کی نظر ہمیشہ اسی جانب جاتی تھی جس میں احتیاط ہو اس لئے انھوں نے امر فور پر معمول کیا۔ اگر یہ خطاب ہم لوگوں کو ہوتا تو ہم کو کچھ بھی اندیشہ نہ ہوتا کیونکہ ہم تاویل کر لیتے کہ امر فور کو مقتضی تھوڑا ہی ہے پس حق تقویٰ کا امر اسی وقت دفعہ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تدریجاً حاصل کرتے رہنا یہ مطلب صحابہ کے ذہن میں بھی ضرور آیا ہو گا۔ مگر انھوں نے غایت خشیت و احتیاط کی وجہ سے اس کو فور پر معمول کیا کیونکہ احتمال تو یہ بھی تھا۔ چنانچہ محارات میں کثرت سے امر کا استعمال فور کے لئے ہوتا ہے جس کا پتہ قرینہ مقام سے چل جاتا ہے آپ اگر اپنے کسی نوکر سے پانی مانگیں اور وہ اگلے دن لا کر پلاوے تو کیا آپ خفا نہ ہوں گے ضرور خفا ہوں گے اور اس کے جواب میں تو کہہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور نے تو اتنا فرمایا تھا کہ پانی لاؤ یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ ابھی لاؤ کیونکہ قرینہ مقام سے اس امر کا فور کے لئے ہونا متعین ہو چکا تھا اور اسی طرح اکثر صیغہ امر کا استعمال فور ہی میں ہوتا ہے گو کبھی عدم فور کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہمارے یہاں ایک حافظ صاحب تھے جن کا لقب حافظ جنازہ تھا وہ ایک گاؤں میں

مسجد کے امام تھے وہاں کوئی مرگیا تو لوگ اس کا جنازہ مسجد میں لائے اور حافظ جی سے کہا کہ اس کی نماز پڑھا دو تو آپ نے یہ عذر کیا کہ مجھے اس وقت ایک دعائیں کچھ شبہ ہے اس کو یاد کر لوں پھر پڑھاؤں گا، لوگ جنازہ لے گئے اور کسی دوسرے نماز پڑھوا کر دفن کر دیا اگلے دن حافظ جنازہ صاحب نے گاؤں والوں سے کہا کہ بھائی مجھے اب دعایا دہو گئی ہے لاؤ اب جنازہ لے آؤ لوگ ہنسنے لگے کہ سبحان اللہ آپ کی دعا کے بھروسہ اب تک ہم اس کا اچار ڈالے رکھتے ہم نے تو اس کو دفن بھی کر دیا۔ تو دیکھئے فوراً و عدم فور میں فرق نہ کرنے سے لوگوں نے ان کو بیوقوف بنایا یہاں تک کہ ان کا لقب ساری عمر کیلئے حافظ جنازہ ہی پڑ گیا تو صحابہؓ نے اس آیت کو بمعنی فور سمجھا اور پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ حق تقویٰ کا آج ہی حاصل کرنا تو بڑا دشوار ہے پھر اس حکم کی تعمیل کیوں کر ہو۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی فانقوا اللہ ما استطعتم یعنی یہ مطلب نہیں کہ حق تقویٰ آج ہی حاصل کر لو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہو سکتا ہے۔ اس وقت تو اس کو اختیار کرو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جائے۔ اس تقریر پر شاید طلبہ کو یہ اشکال ہو کہ تمہاری تقریر سے تو انقوا اللہ حق تقاتہ کا بھی مامور یہ ہونا معلوم ہوتا ہے حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد انقوا اللہ ما استطعتم نازل ہوئی اور اس نے پہلے آیت انقوا اللہ حق تقاتہ کو منسوخ کر دیا سو طلبہ کو سمجھ لینا چاہیے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ کے معنی یہاں تبدیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر وغیرہ پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں اس پر تنبیہ کی ہے واقعی بہت لطیف بات ہے خدا ان کو جزائے خیر دے۔ پس حدیث میں جو انقوا اللہ ما استطعتم کو نسخ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کر دی بیان تفسیر کو نسخ سے تعبیر کر دیا گیا۔ ورنہ فانقوا اللہ حق تقاتہ کے معنی میں نے بیان کئے ہیں وہ ہرگز قابل تبدیل و نسخ نہیں ہیں اور ایک بات طلبہ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ انقوا اللہ ما استطعتم میں استطاعت باعتیار کمیت کے مراد نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ جتنے اعمال بجالا سکو اور جتنے محرمات سنبچ سکو بس انہی کے تم مکلف ہو یہ معنی بالکل غلط ہیں کیونکہ تمام واجبات و فراغت بجالانا اور تمام محرمات سے بچنا ہر شخص پر ہر وقت واجب ہے اور سب لوگ اس وقت ان کے مکلف ہیں اور ان میں سے کوئی کام بھی استطاعت سے یا ہر نہیں

اس لئے کمیت کے اعتبار سے استحضار کی قید کا لغو ہونا لازم آئے گا بلکہ یہ قید کیفیت کے اعتبار سے ہے یعنی اعمال شرعیہ میں جس کیفیت کا تقویٰ تم اس وقت حاصل کر سکو اس کو تو ابھی بجالاؤ اور باقی کیفیات کے حصول کی کوشش کرتے رہو پس اس سے تقویٰ کے درجات کا کیفیت کے اعتبار سے متفاوت ہونا معلوم ہوتا ہے نہ کمیت کے اعتبار سے خوب سمجھ لو اب یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ اس آیت میں صدق کا موخر کرتا اور تقویٰ کا مقدم کرنا ہی مناسب تھا کہ اس سے سامعین کی طبیعت پر بوجھ نہیں ہوا بلکہ ہمت بلند ہو گئی کہ ہم کو تدبیراً تقویٰ کے مراتب حاصل کر کے کمال تقویٰ تک پہنچنا چاہیے۔

بس اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کمال دین مطلوب ہے۔ ہم کو اپنی ناقص حالت پر قناعت نہ کرنی چاہیے بلکہ کمال دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال کو کامل کیا جائے۔ قرآن و واجبات کے بجالانے میں کوتاہی نہ ہو، محرمات کا ارتکاب نہ ہو اور اعمال کے کامل کرنے میں جو نفس کی مزاحمت مانع ہوتی ہے اس کا علاج کاملین کی صحبت اختیار کرنا ہے ان کے پاس جانا چاہیے اور جانہ سکے تو ان سے خط و کتابت کا تعلق رکھا جائے جس میں فضول قصے نہ لکھیں بلکہ اپنے کو مرہق اور ان کو طیب سمجھ کر اپنے حالات سے ان کو اطلاع کرتے رہیں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ وہ بتلاویں اس پر عمل کریں اور ان کے احکام کا اتباع کریں۔ بس یہ راستہ ہے خدا تک پہنچنے کا۔ جس سے زیادہ آسان راستہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔

حجت ختم ہو چکی ہے اب دعا کیجئے حق تعالیٰ شانہ، ہم کو فہم سلیم اور عمل مستقیم عطا فرماویں۔ آمین ر و اخود عوانا ان الحمد لله رب العالمین وصلی اللہ

علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

بتیان لمشید غلشی جلد ۱ از حضرت شیخ احمد کبیری فاضل قدس سرہ یہ وہ ہے جس میں کہ اپنے روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیکھ کر میں اسے بوسہ دیکھتا ہوں اس وقت روضہ اظہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا اور اپنے اسے بوسہ دیا اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامت کو بے حد خوشی ہوئی تھی اس کا مطالعہ مستدیان سلوک کے لئے بہت مفید اور نافع ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ روزانہ بطور ورد کے پڑھا جائے یہ معرفت و حقیقت کا نایاب خزانہ ہے۔ امید ہے کہ براہِ ران اسلام عموماً اور برادران سلسلہ امدادیہ شریفہ خصوصاً اس کی قد فرمائیں۔ قیمت ۳۰ روپے

غلادہ خرقہ ڈاک  
ملنے کا پتہ: مکتبہ مخفانوی۔ بندر روٹ کراچی مل

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(رواه البخاری)

الوضع المسمى به

التَّحْصِيلُ لِلتَّسْبِيلِ  
وَالْوَاقِعُ

التَّكْمِيلُ وَالتَّعْدِيلُ

حکیم الامتہ مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الايقانہ

مسافرتانہ پبلسر روڈ کراچی  
ایم ۱۰۷ جناح روڈ



ایک مضمون کلی اختیار کیا ہے جو کلیت و عموم کی وجہ سے احکام رمضان کو بھی شامل سمجھنا چاہئے تقریباً  
 سے معلوم ہو جائیگا کہ اس مضمون کو ہر عمل سے تعلق ہے اور روایا حدیثیہ کو بھی ملا لیا جاتا تو اس آیت کا  
 تعلق احکام رمضان سے اور زیادہ معلوم ہو گا نہ اس لئے کہ اس میں اتفاق کا ثواب مذکور ہے اور  
 رمضان میں اتفاق کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ دوسری وجہ سے جس کو میں آخر بیان کروں گا گو اتفاق  
 کو بھی اس مہینہ سے خاص خصوصیت ہے اور یہ بھی رمضان کی ساتھ اس آیت کی مناسبت کی  
 وجہ ہو سکتی ہے اس لئے حدیث میں اس کو شہر المواساة کہا گیا ہے جس کا استعمال اکثر <sup>مطلبت</sup> اشاعتاً  
 مالیہ میں ہوتا ہے یعنی اس مہینہ میں باہم ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا چاہیے۔ نیز اس مہینہ  
 میں تضاعف حسنات ہوتا ہے جو اتفاق و صلوة سب کو عام ہے تو ایک تعلق عام اس آیت کا  
 رمضان سے یہ بھی ہے یعنی اس مہینہ میں فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ہے اور نفل کا ثواب  
 فرض کے برابر ہے مگر اس تضاعف حسنات کے معاملہ میں لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہیں جسکو  
 میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے مگر شاید بعض لوگ اس وقت حاضر نہ ہوں اس لئے دوبارہ  
 بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض حضرات نے یہ سنا کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے  
 اس سے یہ اثر لیا کہ رمضان کے لئے طاعات صدقہ کو ملتوی اور مؤخر کرنے لگے۔ زکوٰۃ تو عموماً  
 اسی مہینہ میں ادا کی جاتی ہے گو وجوب زکوٰۃ اس سے پہلے ہو گیا ہو اور اس کے سوا بھی دیگر  
 صدقات کو اس ماہ پر موقوف رکھا جاتا ہے۔ یہ غلطی ہے جس کا منشا مقصد نصوص سے بعداً  
 اور مقصد نصوص کا سمجھ لیتا ہی فقہ ہے جس کی فضیلت حدیث میں یوں آئی ہے من یرد اللہ  
 بہ خیراً ایفقہ فی الدین جس کی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق  
 مشیت حق کیا ہے بجز فقیہ کے کہ اس کو معلوم ہے کہ خدا نے اس کی ساتھ خیر کا ارادہ کیا  
 بوجہ اس حدیث کے تو یہ فضیلت محض اس بات سے حاصل نہیں ہوئی کہ حدیث و قرآن کا ترجمہ  
 جان لیا جائے اور کچھ علمی زکات بیان کر دیئے جائیں بلکہ یہ فضیلت اس سے حاصل ہوتی  
 ہے کہ شارع کا مقصد سمجھ لیا جائے اسی کا نام فقہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں ہمارے  
 اکابر سلف ممتاز تھے گو وسعت نظر میں متاخرین بڑھے ہوئے ہیں مگر عمق نظر میں متقدمین

جس مقام پر بالکل ختم کے قریب یہ حدیث مذکور ہے من سلم لہ رمضان الخ ۱۲ لہ کذا لیسہم من القاموس مادہ اسا ۱۲ منہ



بدرجہ افضل ہیں یہاں تک کہ صحابہ کی نظر سے زیادہ عمیق ہے ان سے بڑھ کر شارع کے مقصد کو کون سمجھ سکتا ہے ان کی برابر نور ایمان و تقویٰ کس کو نصیب ہے اور علوم قرآنیہ میں عمق نظر اسی نور کی برکت سے حاصل ہوتا ہے اس مضمون پر کسی کو اس حدیث سے شبہ نہ ہو۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ائى الخلق عجب اليكم ايماناً قالوا الملائكة الى اخر الحديث يعنى حضور صلى الله عليه وسلم نے صحابہ سے ایک دن دریافت فرمایا کہ بتلاؤ تمہارے نزدیک سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے صحابہ نے عرض کیا فرشتوں کا آپ نے فرمایا کہ فرشتوں کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو ہر وقت اپنے رب کے قرب میں ہیں صحابہ نے عرض کیا پھر انبیاء کا فرمایا ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو وحی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں صحابہ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان عجیب تر ہے فرمایا تمہارے ایمان نہ لانے کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے میں تمہارے درمیان موجود ہوں یعنی تم نے مجھے دیکھا نزول وحی کو دیکھا میرے معجزات دیکھے پھر آپ نے فرمایا ان لوگوں کا ایمان عجیب تر ہے جو میرے بعد آئیں گے اور صرف چند اوراق دیکھیں گے جن میں قرآن ہوگا اور ان پر ایمان لائیں گے تو اس کے دوسو نہ ہو کہ تم صحابہ کو متاخرین سے افضل بتلاتے ہو اور اس حدیث کی رو سے صحابہ سے متاخرین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کے ایمان کو اعجاب ہی تو فرمایا ہے اکمل و اقویٰ و افضل تو نہیں فرمایا اور اعجاب ہونے سے اکمل و افضل ہونا لازم نہیں آتا۔

پس اس حدیث کی بنا پر یہ مسلم کہ متاخرین کا ایمان رب سے عجیب تر ہے مگر صحابہ کے ایمان سے افضل و اقویٰ نہیں کیونکہ دوسرے دلائل سے یہ طے ہو چکا ہے کہ رب سے زیادہ کامل ایمان انبیاء علیہم السلام کا ہے پھر ملائکہ کا پھر صحابہ کا پھر جو صحابہ کے مشابہ ہو اسی طرح ہر زمانہ میں دیکھتے جاؤ جو شخص صحابہ کے ساتھ اخلاق و عادات و طرز معاملات میں مشابہ تر ہوگا اس کا ایمان قوی تر ہوگا۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعجاب ہونا قوی و اکمل ہونے کو مستلزم نہیں اس کی ایک نظر میرے پاس ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا حق تعالیٰ کا علیم و قدیر و سمیع عجیب ہے ہرگز نہیں بلکہ انسان کا علیم و حکیم ہونا عجیب ہے کیونکہ حادث ممکن کا صفات کما کیہ متصف

ہونا واقعی تعجب کی بات ہے اور واجب قدیم کا صفات کمال سے موصوف ہونا کیا عجیب ہے وہ بھی صفات کمال سے موصوف نہ ہو تو اور کون ہوگا مگر انسان کے علم و حکمت کے اعجاب ہونے سے اس کے علم و حکمت کا اکمل ہونا لازم نہیں بلکہ اکمل و افضل واقوسی اللہ تعالیٰ ہی کا علم و حکمت ہے یہ گفتگو درمیان میں ایک شبہ کے رفع کرنے کو شروع ہو گئی تھی کہ حضرات صحابہ کے ایمان کی قوت و فضیلت پر حدیث احمدیہ الخلق اعجب ایماناً سے شبہ نہ کیا جائے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مقاصد نصوص کا سمجھنا فقہ ہے جس میں حق تعالیٰ نے متقدمین کو فضیلت دی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ وغیرہ اسی عمق فہم کی وجہ سے امام ہیں اس خاص صفت میں ائمہ مجتہدین سب ممتاز ہیں اور کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا رہا یہ کہ پھر باہم مجتہدین میں کون افضل ہیں سو اس کے بیان کرنے کو ہمارا منہ نہیں ہم اس قابل نہیں کہ فقہاء میں تفاضل کریں کیونکہ اول تو ہمارا یہ درجہ نہیں دوسرے ہمارے اندر احتیاط نہیں ہم تفاضل کے وقت دوسرے کی تنقیص کر دیتے ہیں اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جرہ ہی کاٹ دی۔ فرماتے ہیں لا تفضلوا بین الانبیاء کہ انبیاء علیہم السلام میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ اور فرماتے ہیں لا ینبغی لعبد ان یقول انی خیر من یونس ابن متی اس میں انا سے مراد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہر تکلم مراد نہیں (کما قبل ۱۲) یعنی کسی کو میری نسبت یہ کہتا لائق نہیں کہ میں یونس علیہ السلام سے افضل ہوں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام انبیاء پر قطعی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں تفصیلی گفتگو سے منع فرما دیا (نیز اس سے بھی منع فرما دیا کہ کسی نبی کا نام لیکر یہ کہا جائے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں نبی سے افضل ہیں پس اجمالاً ہی کہنا چاہیے کہ آپ سب سے افضل ہیں ۱۲) کیونکہ تفصیل سے دوسرے نبی کی تنقیص ہو جاتی ہے اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تفصیلی کلام مقابلہ میں تنقیص سے بچ سکیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ غایت رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو اس بات میں تفصیلی گفتگو سے بالکل منع فرما دیا اور اگر کسی کا اس باب میں تفصیلی گفتگو کر کے یہ خیال ہو کہ میرے کلام سے کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آتی تو میں اس کے سامنے ایک

معیار بیان کرتا ہوں اس پر اپنی تقریر کو پرکھ لیا جاوے وہ یہ کہ تفاضل انبیاء پر تقریر کرنے کے قبل یہ سوچ لے کہ اس مجلس میں سارے انبیاء علیہم السلام مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہیں اور میں سب کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ظاہر کر رہا ہوں اس وقت معلوم ہو جاوے گا کہ کس مضمون کے بیان کی جرأت ہوتی ہے اور کس کی نہیں ہوتی اس معیار سے اپنی اکثر تقریروں کا حدود سے تجاوز ہونا معلوم ہو جاوے گا اور اس کی فکر ہوگی کہ کسی لفظ سے ایسا بھی کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم نہ آجائے ورنہ وہ حضرات تو شانہ خفانہ ہوں مگر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں گے حدیث میں ہے الانبیاء اخوة من علات واھما تھم شتی و دینھم واحد یعنی انبیاء میں باہم علاقہ بھائیوں جیسا تعلق ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات کیسے بھائی ہیں دنیا داروں کی طرح نہیں بلکہ ان میں باہم پورا اتحاد و اتفاق و محبت ہے تو ایسے بھائیوں میں سو ایک کو اپنے دوسرے بھائی کی تنقیص کب گوارا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں حضرت اس معیار کو پیش نظر رکھ کر تم اپنی تمام تقریروں اور تحریروں کو جو اب تفاضل میں لکھی ہوں یا کی ہوں جانچو کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی ہے جس کو بے تکلف تمام انبیاء کے سامنے پڑھ کر سنا سکو یقیناً ایسی تقریریں بہت کم ملیں گی زیادہ حصہ وہی ہوگا جس کو سب کے سامنے پڑھنے کی تم بھی جرات نہیں کر سکتے یہ بہت سچی ترازو ہے جو ایک رتی پر بھی جھک جائے گی اس کی قدر کرو، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں فتوے دیتے ہوئے یہ مراقبہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دے رہا ہوں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو میں فتویٰ نہیں دیتا حضرت یہ وہ باتیں ہیں جن میں صوفیہ دوسروں سے ممتاز ہیں گو اس مضمون کا عقیدہ تو سب کو ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے خدا کے سامنے کرتا ہے مگر اس کا مراقبہ اور استحضار دوسرا اثر رکھتا ہے بس اسی مراقبہ سے تم تفاضل انبیاء کے وقت کام لو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کلام میں اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ سلاسل صوفیہ میں بھی ایک سلسلہ والوں کو دوسرے سلسلہ پر اپنی فضیلت ثابت نہ کرنا چاہیے کیونکہ ہر سلسلہ والے کے لئے دوسرے سلسلہ کے بزرگ چچا ہیں اور چچا بمنزلہ باپ کے ہے حدیث میں

بھی ہے عمر الرجل صنواً بیه یعنی عظمت و ادب میں دونوں برابر ہیں گو بعض حقوق میں باپ مقدم ہیں لیکن تمہارا باپ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ تم اپنے چچا کی یعنی باپ کے بھائی کی تنقیص و توہین کرو جب سلاسل ولایت میں بھی تقاضا سے اکابر نے منع کیا ہے تو فضائل انبیاء تو یقیناً اشد ہے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے فضائل احادیث میں بیان فرمائے ہیں اس سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ ان کے معلوم ہو جانے سے متبعین کو تسلی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسا متبوع دیا اور اتباع پر زیادہ رغبت ہوگی گو یہ معلوم خود بھی مقصود ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ترغیب اتباع ہی معلوم ہوتا ہے (و یحتمل ان یکون امتثالاً لکلامہ تعالیٰ و اما بنعمۃ سر بک فحدث ۱۲) کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق یہ تھا کہ آپ کو اتباع احکام کا سب سے بڑھ کر اہتمام تھا اور جس چیز کو اس میں دخل ہوتا آپ اس کو اختیار کرنے کی کوشش فرماتے اس کے متعلق کہ آپ کو اتباع کا زیادہ اہتمام ہے بہ نسبت بیان فضائل کے ایک مرد صالح کا خواہ بھی ہے جو بعض رسائل میں طبع بھی کر دیا ہے ان کو مولود وغیرہ کا بہت شوق تھا محض غلبہ محبت نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں ہم زیادہ تعریف سے خوش نہیں بلکہ ہم اس سے خوش ہوتے ہیں کہ جو ہمارے احکام کا اتباع کرے مگر آج کل حالت یہ ہے کہ شعرا ایک نعتیہ دیوان لکھ کر اپنے گوسرے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ عمل کی یہ حالت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف یقیناً ایسی تعریف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش نہیں ہو سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل کو زیادہ تر ترغیب اتباع کی نیت سے بیان فرمایا ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ فضائل تو عقائد کی قبیل سے ہیں جو خود مقصود ہوتے ہیں اور تم ان کو مقصود وغیرہ بتاتے ہو میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ ایک شئی مقصود بالذات بھی ہو اور دوسری مقصود میں معین بھی ہو آپ کو خبر نہیں مقاصد شرعیہ کی سب کی ایسی حالت ہے جیسے مقناطیس کی حالت ہے کہ ہر مقصود دوسرے کا جاذب اور اس میں معین ہے پس عقائد کا مقصود بالذات ہونا ان کے مقصود للاحوال ہونے کے متافی نہیں اور میں نے اس

مسئلہ کو قرآن سے سمجھا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصاب من مصيبة في المرض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبل ان تدبروا هان ذلك على الله يسير لكيلا تاسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما اتاكم۔ بتلایئے اس آیت میں لام غایت کا متعلق کون ہے مذکور تو ہے نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی جزو اس کا صالح نہیں لامحالہ مقدر ماننا پڑے گا اب یہ بھی سمجھ لو کہ مقدر کیا ہے تو اس لام سے اوپر اللہ تعالیٰ کے مسئلہ تقدیر بیان فرمایا ہے یعنی تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے خواہ آفاقی ہو یا نفسی وہ ایک کتاب میں اپنے ظہور سے پہلے لکھی ہوئی تھی چونکہ یہ عجیب بات تھی اس لئے فرماتے ہیں کہ تعجب نہ کرو اللہ کو یہ سب آسان ہے اب اس مسئلہ کے بتلانے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو یہ مسئلہ اس لئے کیوں بتلایا تاکہ تم فائت پر غم نہ کرو اور عطا کی ہوئی چیز پر اترناؤ نہیں پس وہ مقدر اخیر نا کہ بد ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کو اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن و بطرف ہو جاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر و بطر اصل سے تعطل باطن کی یعنی غمگین و پریشان آدمی ظاہر میں تمام دین و دنیا میں کاموں سے معطل ہو جاتا ہے اور تکبر آدمی کا دل خدا کے تعلق سے معطل ہو جاتا ہے جب تک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کو لگاؤ نہیں ہو سکتا یہ تو تقدیر کو دخل تھا اعمال میں۔ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ توحید جو اعظم العقائد و اساس العقائد ہے اس کو بھی اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے۔ چنانچہ سعدی فرماتے ہیں۔

موجود چہ برپائے ریزی زرش      چہ فولاد ہندی نہی بر سرش  
امید و ہر اسش نباشد ز کس      ہمیں سرت بنیاد توحید و بس

(توحید کا مقام والا ایمان کامل سے مشرق ہوتا ہے اگر اس کے پاؤں پر سونے کا ڈھیر ہو یا اس کی گردن پر تلوار ہندی ہو تو ان دونوں حالتوں میں نہ تو اس کو کسی سے امید و طمع ہوگی اور نہ کسی سے خوف ہوگا اور یہی حالت توحید کی بنیاد ہے یعنی توحید سے مخلوق کا خوف و طمع زائل ہو جاتا ہے جب اتنا بڑا عقیدہ بھی اصلاح اعمال میں دخیل ہے تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخیل مانا جاوے تو کیا اشکال ہے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصود ہے (گو وہ فضائل ایک درجہ میں مقصود بالذات بھی ہیں)

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں زیادہ کاوش سے منع فرمادیا کیونکہ جو مقصود ہے اس اعتقاد فضیلت سے وہ بدن تفصیل کے بھی صرف اجمالی اعتقاد سے حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر نے اولیاء مجتہدین میں بھی تفاضل سے منع فرمایا ہے غرض متقدمین کو فقہ اور تعمق نظر کی وجہ سے متاخرین پر فضیلت ضرور ہے لیکن باہم متقدمین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے اس سے بحث نہ کرنا چاہیے یہ گفتگو اس پر علی تھی کہ لوگوں نے حدیث تضا عفا ثواب فی رمضان کے باب میں شارع کا مقصد نہیں سمجھا اور فقہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر یہ عمل کیا کہ تفاضل حسنات کے لئے طاعات کو مؤخر کرنے لگے کہ اگر کسی کی زکوٰۃ کا سال ۲۸ شعبان کو پورا ہوتا ہے تو وہ ۲۸ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا بلکہ رمضان کے لئے اس کو ملتوی کرتا ہے چاہے غریب مسکینوں کا رجن کا یہ مال زکوٰۃ شرعی حق ہے) خاتمہ ہی ہو جائے ارے تم کو کیا خبر ہے کہ مساکین پر کیا گذر رہی ہے تم کو یکم رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کی روح کو ایک ایک گھڑی کا انتظار ہے بس وہ حال ہوگا تا تو بمن می رسی من بخدای رسم (جب تک تو مجھ تک پہنچنے کا میں خدا تک پہنچ جاؤں گا یعنی موت ہی آجاوے گی) صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں جو آپ نے سمجھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ نہیں کہ رمضان تک طاعات کو مؤخر کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رمضان میں طاعات کے اندر جلدی کی جائے یعنی جس طاعت کی ہمت ہو سکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہو سکے اس کو جلدی رمضان ہی میں کر دو رمضان کے بعد کیلئے مؤخر نہ کرو کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے پس تضا عفا حسنات کا مقصود تو تعجیل اعمال فی رمضان تھا لوگوں نے اس سے تاخیر اعمال الی رمضان سمجھ لیا۔ صر یہ ہمیں تفاوت رہ از کجا ست تا کجا۔

(غور کرو کہ راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک جا پہنچا)

طہ میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ فقہ کے موجد ہیں کما قال الامام الشافعی الناس کلہم عیال علی ابی حنیفہ فی الفقہ نیز وہ تابعی ہیں کما اثبت الذہبی والحافظ ابن حجر والدارقطنی وغیرہم رویتہ الانس بن مالک و فی الحدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلوئہم ثم الذین یلوئہم و لیس احد من المجتہدین المقلدین تابعیا سو الامام پس امام ابوحنیفہ کا تمام ائمہ مجتہدین سے افضل ہونا تو نص سے بھی ثابت ہے اور موجود فقہ ہونے سے بھی ۱۲ مگر اس سے علی الاطلاق

فضیلت سب پر ثابت نہیں ہوتی ۱۲ اشرف

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جس شخص کا سال زکوٰۃ ۸ شعبان کو پورا ہو تو کیا وہ شعبان ہی میں صدقہ کر دے اس کے جواب میں میں تو یہی کہوں گا کہ ہاں دیر نہ کرے رمضان کا انتظار نہ کرے رہا یہ سوال کہ کیا شعبان میں وہی ثواب ہوگا جو رمضان میں ہوتا ہے اس کا ٹھیکہ لیتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ٹھیکہ داتا تو نہیں ہوں ہاں ٹیکہ دار ہوں کہ اللہ و رسول کے بیان کردہ قواعد پر ٹیکہ لگا کر کہتا ہوں کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تاخیر طاعات مطلوب نہیں بلکہ تسارع و تسابق الی الخیر مقصود ہے چنانچہ جابجا فاستبقوا الخیرات۔ یسارعون فی الخیرات نص میں وارد ہے۔ اس لئے میں جرم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاخیر فی الخیر شائع کو ہرگز مطلوب نہیں اور میں قواعد سے کہتا ہوں کہ جس کو شعبان میں صرف کا موقع ملے وہ ہرگز تاخیر نہ کرے اس کو شعبان ہی میں اتنا ثواب ملے گا جو شاید رمضان کے ثواب سے بھی بڑھ جائے کیونکہ انفاق فی رمضان سے کمیۃ ثواب بڑھنا ہے اور تعجیل و سبقت فی الخیر سے کیفیت ثواب زیادہ ہوتا ہے اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبہ ہے۔ صاحبوا! میں اس کی نظیر علما کے کلام سے اپنے پاس رکھتا ہوں حدیث میں ہے کہ مسجد محلہ میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں ۵۰ نمازوں کا مگر محلہ والوں یہ جائز نہیں کہ محلہ کی مسجد چھوڑ چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھتے جایا کریں اگر ایسا کر و گے تو گناہ ہوگا۔ اس مقام پر علماء نے لکھا ہے کہ جامع مسجد کی نماز اس شخص کے حق میں کمیۃ زیادہ ہے اور مسجد محلہ کی نماز کیفیت زیادہ ہے کیونکہ اس کے ذمہ اس مسجد کی آبادی واجب ہے تو یہ شخص مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا کیونکہ اس کے ذمہ اس کی عمارت و آبادی واجب نہیں بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلہ والوں کے ذمہ ہے (۱۲) ہاں اگر کوئی جامع مسجد کے محلہ میں جا لے تو اور بات ہے پھر اس کو کیفیت و کمیت دونوں میں ترقی ہو جائے گی گو قرب سے بعد اقدام کا بھی خسارہ ہو جائے گا بس تم اپنے حساب اور قواعد کو رہنے دو اس میں پانچ کو جانے دو جو حکم ہو جائے اس کو مان لو اپنی طرف سے حساب نہ لگاؤ کہ اس وقت خرچ کرنے میں ثواب کم ہوگا رمضان میں زیادہ ہوگا صاحبوا! یہ تسلیم کہ رمضان میں زیادہ ہوگا مگر یہ آپ کو کیونکہ معلوم ہوا کہ اس وقت کم ہوگا، ممکن ہے اس وقت ہی زیادہ مل جائے کیونکہ اس وقت خرچ کر و گے تو ادا ہوگا اور رمضان

تاخیر کرو گے تو قضا ہو جائے گا اور ادا میں جو لطف ہے وہ بات قضا میں کہاں تم کو آخرت کے حقائق و خواص کی کیا خبر تم ان کے متعلق قیاس سے کام نہ لو۔ اہل سائنس کو اقرار ہے کہ اب تک خواص اشیاء کا ان کو اتنا بھی علم نہیں ہوا جتنا سمندر میں سے ایک قطرہ حالانکہ حیرت درحیرت انگریز ایجادات ہو رہی ہیں اختیار میں دیکھا ہے کہ امریکہ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے کہ اس کو پرانے کھنڈروں اور ویرانوں میں لگا یا جلائے تو پہلے زمانہ کی تمام باتیں جو اس گھر کے آدمیوں نے اس گھر میں کی تھیں اس آلہ کے ذریعہ سے سنائی دیں گی اب بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ آوازیں کرہ ہو میں اب تک موجود ہیں مگر ان کے ادراک کے لئے لطیف آلہ کی ضرورت تھی وہ اب ایجاد ہو گیا پہلے ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے کوئی ان باتوں کو نہ سن سکا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ روحوں کی آوازیں ہیں ارواح بولتی ہیں۔ اب میں اس خیر کو بیان کر کے کہتا ہوں کہ قرآن نے کہا تھا کہ قیامت کو زمین بولے گی جو مسئلہ متحد اخبار رہا تو اس کا سب نے انکار کیا اور کہا بھلا یہ کس طرح ہو گا زمین کیونکر بولے گی کیا اس کے بھی زبان ہے۔ قرآن نے اس کا بڑا زبردست جواب دیا ہے بان ربك اوخليا یعنی زمین اس لئے بولے گی کہ خدا کا اس کو یہی حکم ہو گا۔ اس جواب نے سب سائنس والوں کی گردنیں توڑ دیں کیونکہ اسباب ظاہرہ میں تو وہ شبہات نکال سکتے تھے اس میں کیا شبہ نکال سکتے ہیں کیونکہ یہ تو حقیقی سبب ہے اگر اس میں کلام کریں گے کہ کیا زمین کے زبان ہے تو ہم سوال کریں گے تو اچھا بتلاؤ یہ زبان کیونکر بولتی ہے کیا اس کے بھی زبان ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب عالم اسباب کی حقائق کا اب تک احاطہ نہیں ہو سکا تو عالم آخرت کی حقائق کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے پھر آپ وہاں کے ثواب وغیرہ کے بارے میں اپنا حساب اور قاعدہ رہنے دیجئے چنانچہ بعض لوگوں نے حقوق العباد کے بارہ میں ایک حساب لگا یا ہے کہ زید کا ہمارے ذمہ حق ہے اور عمرو کے ذمہ ہمارا حق ہے تو اب ہم کو زید کے حق کی فکر کرنا کیا ضرور۔ قیامت میں اگر زید ہم سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا تو ہم عمرو پر حوالہ کر دیں گے کہ اس کے ذمہ ہمارا حق ہے اس سے وصول کر لو اس طرح مقاصد ہو جائے گا مگر اول تو کیسا ضرور ہے کہ دوسروں کے ذمہ آپ کے حقوق اتنے ہی ہوں جتنے دوسروں کے آپ کے ذمہ ہیں دوسرے فرض کر لیا جائے کہ برابر ہی ہو گئے مگر ممکن ہے کہ پھر بھی مقاشہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ



دوسرا تو تمہارے حقوق کی ادائیگی کی فکر میں عمر بھر لگا رہا ہو مگر اخلاص یا اور کسی عذر کی وجہ سے مجبور رہا ہو اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم خود حقوق کو ادا کر دیں گے اور اس شخص پر اصلاً مواخذہ نہ ہوگا (۱۲) اور تم اس مقاصد کے حساب سے بے فکر ہو گئے ہو تم نے ابھی سے دوسرے کا حق مارنے کی ٹھان لی ہے تو تم اور وہ برابر کہاں ہو گئے تم پر ظلم و غضب و خیانت وغیرہ متعدد دفعات قائم ہیں اور اس پر صرف ایک دفعہ تھی کہ قرض لیکر ادا نہیں کیا۔ تیسرے ممکن ہے کہ حقوق کے مکافات مکسوب اعمال سے ہو سکے اور موروث اعمال سے نہ ہو سکے اس لئے دوسرے شخص کی جو نیکیاں تم کو ملی ہیں وہ معاوضہ ان حقوق کا نہ ہو سکیں جو تمہارے ذمہ ہیں تو یہ حساب محض لغو ہے خدا سے ڈرنا چاہیے کہیں بننے کے حساب کی طرح نہ ہو جائے کہ لیکھا جوں کاتوں کنبہ ڈوبا کیوں۔ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جس عورت کے کئی نکاح ہوئے ہوں وہ کس کو ملے گی یہ سوال بھی محض فضول ہے کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ وہاں کسی کو قلق نہ ہوگا سب کے سب خوش و خرم رہیں گے یہ نہ ہوگا کہ شوہر و بیوی باہم لڑائی جھگڑا ہو وہ کہے میں لوں وہ کہے میں لوں ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کے پہلے خداوند کو دنیا ہی کی عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی ہی حسین یا اس سے بہتر دیدے کیونکہ دنیا میں بہت لڑکیاں بغیر شادی کے بھی تو مر جاتی ہیں یا عورتیں زیادہ دیدیں۔ غرض اللہ تعالیٰ سب کو خوش کر دیں گے جنت میں کوئی غمگین نہ ہوگا اس لئے یہ سوال محض فضول۔ غرض یہ کہ تم خدا کے ساتھ حساب نہ لگاؤ حساب وہاں کیا کرتے ہیں جہاں مساوات ہو۔ دیکھو دو کا ندر ہم سے اور آپ سے تو حساب کرتے ہیں اور باندنیا ہوں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتے وہاں تجارتی مال کو بھی ہدیہ کہہ کر پیش کرتے ہیں اور جب وہاں سے قیمت پوچھی جاتی ہے تو قیمت نہیں بتلاتے بس یہی کہتے ہیں کہ اس کی کچھ قیمت نہیں صرف حضور کی خوشنودی ہی سب کچھ قیمت ہے۔ اس کے بعد ان کو قیمت سے بھی بہت زیادہ مل جاتا ہے پھر غضب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ساتھ حساب کتاب کرتے ہو جن کا حق یہ ہے کہ

نیا و ردم از حسانہ چیزے نخت تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

(اے خدا ہم اپنے گھر سے کوئی چیز بھی تو نہ لائے تھے آپ ہی ہر چیز ہم کو عطا فرمایا اور ہم خود بھی آپ ہی کے ہیں)

کیونکہ سب چیزیں تو ان ہی کی ملک ہیں اور حساب وہاں ہوتا ہے ایک عوض ایک عاقد کا ہو دوسرا عوض دوسرے عاقد کا اور یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ان اللہ اشترى من المؤمنین انفسہم و اموالہم بان لہم الجندہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جنت کے بدلہ میں ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے جس سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جان و مال ہماری ملک ہے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے تم بچہ کو بلا تملیک پیسہ دیدیتے ہو اور اتفاق کی حادث ڈالنے کے لئے اس کے ہاتھ سے مدرسہ میں دلواتے ہو اب مدرسہ کی کارروائی میں بچہ کا نام چھپے گا کہ فلاں بچہ نے مدرسہ میں چندہ دیا تھا کارروائی میں اپنا نام دیکھ کر بچہ خوش ہوتا ہے تو کیا حقیقت میں چندہ دینے والا وہ بچہ ہے یا آپ ہیں اس کو خود سمجھ لیجئے اور یہاں استطراداً اس کے متعلق چند باتیں یاد آگئیں وہ بھی بتلا دوں ایک یہ کہ باپ کو مناسب ہے کہ بچہ کے ہاتھ سے بھی کبھی کبھی خرچ کرایا کرے کبھی اس کے ہاتھ سے فقیر کو دلواد یا کبھی مدرسہ میں دلواد یا تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے اور مال کی حرص نہ پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ جب بچوں کے ہاتھ سے کسی دوسرے کو رقم دلواد و خواہ فقیر کو خواہ مدرسہ کو تو اس وقت یہ رقم بچہ کو ہبہ نہ کرو بلکہ اباحت کے طور پر دوورنہ وہ اس کی ملک ہو جائے گی پھر ہبہ صبی حرام ہوگا اور اگر غلطی سے ایسا ہو جائے تو فقیر سے یا مدرسہ والوں سے رقم واپس نہ لو بلکہ خود بچہ کو اس کے عوض اور رقم دیدو جس میں نیرت عوض کی قید ضروری ہے ورنہ یہ مستقل ہبہ ہوگا پہلے کا عوض نہ ہوگا اور مدرسہ والوں کو چندہ کرنے والوں کو بھی چندہ لیتے ہوئے ان مسائل کا لحاظ رکھنا چاہیے یہ چندہ جمع کرنے والے ہر شخص کی رقم لے لیتے ہیں خواہ کوئی بچہ دے یا عورت اور ان مسائل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ پانی پت میں ایک مدرسہ کے سفیر جو واعظ التمار تھے کہ ہمیشہ عورتوں ہی میں وعظ کہا کرتے تھے تشریف لائے اور چندہ کا وعظ کہا ان کو ایک ہی حد یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے عورتوں میں نے تم کو جہنم میں سب سے زیادہ دیکھا ہے پس صدقہ کر کے اپنے کو جہنم سے بچاؤ اگرچہ زیور ہی میں سے ہو اسی حدیث کا ہمیشہ بیان کرتے تھے۔ عورتیں مردوں کے اعتبار سے زیادہ مالدار ہیں کیونکہ تھوڑا بہت زیور ہر عورت کے ہاتھ کان میں ہر وقت ہوتا ہے۔ نیز یہ مردوں سے زیادہ سخی بھی ہیں

کیونکہ زیور میں ان کو کونسی مشقت بڑی تھی یا تو شوہر نے کہا کہ بتایا یا ماں باپ نے جوڑ جاڑ کر چہرہ ہا دیا ان کو تو ہر حال میں مفت ہی پڑتا ہے اس لئے چندہ کے ورنہ میں ان کے ہاتھ کان سے بہت جلدی زیور نکلنے لگتا ہے۔ وہ سفیر صاحب غالباً اسی لئے عورتوں میں زیادہ وعظ کہتے تھے کہ یہ مالدار بھی ہیں سخی بھی ہیں اور عقل سے کوری بھی ہیں ہر شخص کی باتوں سے متاثر ہو جاتی ہیں ان سے چندہ خوب ملے گا۔ چنانچہ ہر وعظ کے بعد ان کے پاس بہت سا زیور جمع ہو جاتا تھا۔ ایک دن کسی عورت نے اپنے کان کی سونے کی بالیاں چندہ میں دیدیں سفیر صاحب بڑے خوش ہوئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ان کی خوشی کرکری ہو گئی کیونکہ اس عورت کا خاوند جو گھر میں آیا اس نے بیوی کے کان ننگے دیکھے، پوچھا بالیاں کیا ہوئیں کہا مدرسہ کے مدرسہ چندہ میں دیدی کہا بیوقوف تو کون تھی دینے والی تجھے پہننے کو دی تھی یا تیری ملکیت بنا دی تھی۔ اس کے بعد وہ سفیر صاحب کے پاس آیا اور کہا آپ کو میری بیوی نے سونے کی بالیاں چندہ میں دی تھی وہ واپس کر دیجئے کیونکہ وہ اس کی ملک نہیں ہیں میری ملک ہیں اور اس نے میری بغیر اجازت دی ہیں۔ سیدھی اور معقول بات تھی مگر سفیر صاحب کسی طرح واپس دینے کو تیار نہ ہوئے اور اس سے جھگڑنے لگے۔ ان دنوں میں بھی وہا گیا ہوا تھا۔ سفیر صاحب میرے پاس آئے میں نے ان سے کہا کہ آپ معقول بات کو کیوں نہیں مانتے اور بالیاں واپس کیوں نہیں دیتے تو انھوں نے بڑا عذر یہ کیا کہ میں تو سو روپے کی رسید کاٹ کر دے چکا ہوں۔ اب اگر بالیاں واپس دیدوں تو مدرسہ والے تو مجھ سے روپے وصول کر لیں گے کیونکہ رسید کٹی ہوئی ہے۔ میں نے کہا اس کی تدبیر یوں کیجئے کہ ان سے وہ رسید منگوا لیجئے۔ اور اس پر ان کے قلم سے لکھوا لیجئے کہ ہم نے یہ چندہ واپس لے لیا اور دستخط کرا کے ایک دو گواہیاں بھی کرا لیجئے اسی طرح نئی رسید پر جو آپ کی بھی ہیں ہے واپسی مع دستخط اور گواہوں کے لکھوا لیجئے۔ پھر مدرسہ والے آپ سے کچھ نہ کہیں گے۔ یہ تدبیر سن کر مولوی صاحب کے حواس درست ہوئے ان کا بال بال پچا اور اس غریب کی بالی بچی۔ پس عورتوں سے چندہ لینے والوں کو بڑی احتیاط کرنا چاہئے کیونکہ یہ اکثر بدون شوہر سے پوچھے شوہر ہی کے مال میں سخاوت کیا کرتی ہیں۔ یہ مسائل درمیان میں

استطردا مذکور ہو گئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس طرح آپ بچے کے ہاتھ رقم دلوا کر بچے کا نام کر دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کا نام کر رہے ہیں ورنہ بتلائیے کہ جان آپ کی کدھر سے ہو گئی مال آپ کا کدھر سے ہو گیا یہ تو سب کچھ حق تھا کہ آپ کا نام برائے نام ہے اب بتلاؤ اس کے عوض میں کچھ جنت کی نعمتیں ملیں گی وہ عوض ہے ہرگز نہیں بلکہ سراسر فضل و رحمت ہے مگر اس برائے نام ملک کا شریعت نے اعتبار کیا ہے اور اس کو ملک حقیقی ہی کے احکام دیئے ہیں یہ شریعت کا بڑا احسان ہے ورنہ اگر یہ نہ ہو اور حقیقت کا مسئلہ عملاً بھی مان لیا جائے کہ

درحقیقت مالک ہر شے خداست      این امانت چند روزہ نزدماست

درحقیقت ہر شے کا مالک خدا ہے اور بطور امانت چند روز کے لئے ہمارے پاس ہے (تو عالم میں فساد برپا ہو جائے۔ کوئی کسی کی بیوی کو لے بھاگے کوئی کسی کی نقدی اور زیور پر قبضہ کر لے اور جب مالک کہے کہ یہ تو میری چیز ہے اس کو یہی کہہ کر دھمکا دے کہ تیری کہاں سے آئی تھی سب چیزیں خدا کی ہیں ہم بھی خدا کے ہیں آج تک تو نے برتا اب ہم برتیں گے اس مسئلہ پر عمل ہونے لگے تو پھر شیخ صاحب بھی پٹھانوں جیسا کام کرنے لگیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں

سرپنہان ست اندر زیر و بم      فاش اگر گویم جہاں برہم ز نم

(راز پوشیدہ ہے نظام توحید میں اگر ظاہر کر دوں تو تمام عالم میں تعطل پیدا ہو جائے)

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر توحید کو ظاہر کر دوں تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اس کی وجہ یہی ہے کہ توحید کا تو یہی مقتضا ہے کہ خدا تعالیٰ کے رب و کسی کی ملک نہیں ایک مقام پر مولانا نے اس کے مناسب ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ ایک ایسا ہی شخص کے باغ میں گھس کر انگور کھانے لگا۔ باغبان آگیا تو اس کو دیکھ کر بھی آپ ڈرے نہیں بے تکلف کھاتے رہے۔ اس نے دھمکایا کہ نامعقول یہ کیا کر رہا ہے کہ بدون اجازت کے میرا پھل کھا رہا ہے تو وہ صاحب حقیقت بولے بس خاموش رہے یک نہ لگا۔ باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا ہاتھ بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر تو روکنے والا کون ہے۔ اس نے نوکر کو آواز دی کہ ایک رستا اور ڈنڈا لانا اور اس میں اسکو جکڑ کر ڈنڈے سے مارتا شروع کیا اب وہ لگا چلانے تو باغ والا کہتا ہے کہ بس خاموش رہو

رتا بھی خدا کا ٹھکانا بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر چلانے کی کیا بات ہے غرض خوب مارا آخر  
اس نے اس عقیدہ سے توبہ کی اور کہا ۔

گفت توبہ کردم از جبرائے عیار اختیار است اختیار است اختیار است

اس نے کہا میں توبہ کرتا ہوں اس عقیدہ جبر سے بے شک اختیار سمجھو دیا گیا ہے ہر غیر و شرکاء  
اہل جبر وہی لوگ ہیں جو حقیقت کے متائل ہیں اور اختیار کے انکار سے شریعت کے  
منکر ہیں انھوں نے ۔

در حقیقت مالک ہر شئی خداست میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ فاعل ہر شئی نیز خداست  
کہ ہر کام کرتے والا بھی انسان نہیں بلکہ خدا ہی ہے اور سنت اختیار سے جو خدا تعالیٰ نے  
انسان کو عطا فرمائی ہے انکار کر بیٹھے ہیں ہیں کہتا ہوں بہت اچھا اگر انسان کو اختیار کچھ  
تہیں ہے تو پھر سب کو اعمال صالحہ کے بعد بھی جہنم کے لئے تیار رہنا چاہیے کیونکہ آپ نے  
یہ اعمال تھوڑا ہی کئے ہیں آپ تو مجبور تھے جیسے یہاں مجبور ہو آخرت میں بھی مجبور ہو اللہ  
تعالیٰ جہاں بھیج دیں چلے جانا صاجو! انسان میں صفت اختیار کا ہونا دلیل کا محتاج نہیں  
بلکہ یہ وجدانی امر ہے ہر شخص وجدان سے اس کو محسوس کرتا ہے کہ ہاں میرے اندر اختیار  
ہے۔ دیکھئے مر تعش (جس کے ہاتھ میں ریشہ ہو) اور کاتب کی حرکت ید میں فرق بین ہے  
پہلا شخص حرکت میں مجبور ہے دوسرا مجبور نہیں (ایک شخص کو ڈھا کر زبردستی اس کا منہ  
کھول کر کسی نے شراب پلا دی اور ایک نے رو پیہ ہاتھ میں لیا اور شراب کی بھیٹی پر گیا بھاؤ  
تاؤ کیا اور بوتل خرید کر پی لی کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں بلکہ مجبور پہلا شخص ہے دوسرے کو  
مجبور کوئی نہیں کہہ سکتا) اور یہ ایسا فرق ہے جس کو حیوانات بھی جانتے ہیں اگر آپ کتے  
یا بھیرے کے ڈھیلے یا لاکھی ماریں تو وہ لاکھی ڈھیلے پر حملہ نہ کرے گا بلکہ آپ پر حملہ کریگا  
وہ بھی جانتا ہے کہ لاکھی اور ڈھیلے کی خطا نہیں وہ تو مجبور ہے خطا آدمی کی ہے جو اختیار سے  
ہم کو ستا رہا ہے۔ بہر حال اگر شریعت نہ ہو تو حقیقت سے تو سارے عالم میں فساد ہو جائے  
لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ شریعت نے جو انسان کے برائے نام ملک اور اختیار کو تسلیم کر کے اس کے  
احکام مقرر کئے ہیں اس سے یہ تو مقصود نہیں کہ تم حق تعالیٰ کے سامنے بھی اپنی ملک

بتلا یا کرو۔ بس انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو حقیقت پر نظر رکھے کہ اپنی جان کو اپنی جان نہ سمجھے نہ مال کو اپنا مال سمجھے نہ اپنے کمالات کو اپنے کمالات سمجھے بلکہ سب کو عطا یا نے حق سمجھتا رہے اور بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے شریعت پر نظر رکھے یہ ایک اشکال تھا جس کو میں نے درمیان میں حل کر دیا اب اصل بات کی طرف عود کرتا ہوں کہ تم حق تعالیٰ سے حساب نہ کرو اور شعبان و رمضان میں تفاوت نہ کرو جب موقع ہو فوراً خرچ کر دو تم کو کیا خبر کہ اس وقت کتنا ثواب ملا رمضان سے کم ملایا زیادہ کیا عجب ہے کہ اس وقت ضرورت کے وقت جو مسکین کو سہارا مل گیا ہے اس کی دعائرش سے کتنی اوپر گئی ہوگی اور اس دعا سے تم کو کیا کچھ ملا ہوگا اور مان لو کہ اس وقت رمضان سے کم ہی ثواب ملا تو تم کو یہ کیا خبر ہے کہ رمضان تک تم زندہ رہو یا نہ رہو اور یوں امید تو پہلے زمانہ میں بھی کسی کو نہ تھی کہ ایک دن یقیناً زندہ رہیں گے مگر پہلے زندگی کی ایسی ناامیدی بھی نہ تھی جیسی آجکل ہو گئی ہے کیونکہ آئے دن نئی نئی دباؤں قسم قسم کی بلائیں آتی رہتی ہیں اب تو ایک دن کا بھی کسی کو بھروسہ نہیں اگر کہو کہ ہم وصیت کر جائیں گے کہ رمضان میں اتنی رقم دیدی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وصیت کا ثواب اپنے ہاتھ سے دینے کے برابر نہیں دوسرے کیا بھروسہ ہے کہ ورثہ ادا کریں گے یا نہیں یہ غلطی تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جو راجب الی الخیر ہیں اور جو راجب الی الخیر نہیں ہیں ان کے یہاں تو رمضان کا مہینہ آتا ہی نہیں جیسا ایک جنٹلمین کا قصہ ہے کہ رمضان میں ایک دوست ان سے ملنے گئے تو دیکھا وہ بے تکلف ناشتہ کر رہے سگریٹ پی رہے ہیں کہا کیا آپ رمضان میں ایسا کرتے ہیں کہنے لگے رمضان کیا ہوتا ہے کہا ایک مہینہ کا نام ہے تو جنٹلمین نے مہینوں کی گنتی شروع کی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی۔ الخ کہا ان میں تو رمضان کا نام کہیں بھی نہیں یہ تو نمبر اول کے جنٹلمین تھے اور جو نمبر دوم کے جنٹلمین ہیں ان کے یہاں رمضان آتا تو ہے مگر بلائے بے درماں کی طرح آتا ہے کیونکہ وہ سارے سال تو مشغول رہتے ہیں۔ جنوری فروری میں رمضان کی خیران کو ایک دم ہو جاتی ہے کہ آج رمضان آ گیا تو وہ گھبرا کر کہتے ہیں کہ ابھی ابھی تو گیا تھا ابھی پھر آ گیا۔ صا جو! مسلمانوں کو تو شمسی حساب میں ایسا غلو نہ چاہئے

کہ سال بھر بھی اسلامی مہینوں کی خبر نہ ہو یہ میں نے مانا کہ تجارتی ضرورتیں شمسی حساب پر  
 مجبور کرتی ہیں تو میں اس سے منع نہیں کرتا آپ تجارتی کاغذات میں اسی سے حساب رکھتے مگر  
 نجی معاملات میں کوئی مجبوری ہے دوستوں کو جو رات دن خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں  
 شمسی حساب کی کیا ضرورت ہے اس کو چھوڑو اور اپنی نجی خط و کتابت میں قمری حساب کو  
 استعمال کرو۔ غرض اس میں شک نہیں کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اور اس لئے تمام سال  
 میں رمضان کا مہینہ سب مہینوں سے افضل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے کہ  
 اس کی وجہ سے طاعات کو دوسرے مہینوں پر ملتوی رکھتے ہیں کہ رمضان میں کریں گے یا درکھو کہ شارع کا  
 یہ مطلب ہرگز نہیں ایک تو یہ غلطی تھی ایک دوسری غلطی یہ اور متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ لوگوں نے رمضان  
 کے فضائل میں سے ایسی یہی یاد کر لیا ہے کہ اس میں حسنات کا تضاعف ہوتا ہے اور یہ نہیں یاد رکھا کہ  
 گناہ کا بھی تضاعف ہوتا ہے کیونکہ مبارک مکان و مبارک زمان میں جس طرح نیکی بڑھتی ہے گناہ  
 بھی بڑھتا ہے جیسا کہ زنا کرنا ہر جگہ برابر ہے مگر مسجد میں کرنا بہت ہی بُرا ہے۔ اسی طرح رمضان کا گناہ  
 اور دنوں کے گناہ سے سخت ہوگا پس رمضان میں جبکہ طاعات و حسنات کا اہتمام ضروری ہے ایسا  
 ہی سیئات سے اجتناب بھی سخت ضروری ہے مگر یا لوگوں نے گناہوں میں بھی وہی خانہ ساز  
 حساب لگایا ہے جو حسنات میں لگایا تھا یعنی اللہ تعالیٰ سے ضابطہ کرنا چاہتے ہیں چنانچہ علماء سے  
 پوچھتے ہیں کہ یہ کام کرنا کیسا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ گناہ ہے تو اس کے بعد سوال ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا ہی  
 گناہ ہے یا بڑا گناہ ہے میں ایسے نامعقولوں کو یہ جواب دیتا ہوں کہ کیوں حنا اگر چھوٹا گناہ ہوا  
 تو آپ کا ارادہ کرنے کا ہے اگر کہے ہاں تو میں کہتا ہوں کہ پھر مجھے بھی اجازت دو کہ تمھارے گھر کے  
 چھتر میں ایک چھوٹی سی چنگاری رکھ دوں اور اگر کوئی ایسا کرے اور یہ کہے کہ یہ تو ذرا سی چنگاری  
 ہے اس کا کیا حرج ہے تو تم گوارا کر لو گے اس کا جواب سب یہی دیتے ہیں کہ نہیں کیونکہ ذرا سی چنگاری کا  
 بڑھ جانا کیا مشکل ہے خدا بڑی گھڑی نہ لائے تو حضرت ایسی ہی ہر چیز کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے  
 خصوصاً گناہ کا اور ایک گناہ تو ایسا ہے جس کا بڑھنا بڑے ہی غضب کا ہے اور اسی سے لوگ  
 بہت سی فکر ہیں یعنی زکاہ بدکان پور میں ایک شخص بوڑھے ثقہ یا بند صوم و صلوة تہجد گزار تھے مگر  
 اس بد نظری کی بدولت ایک یہودن کے عشق میں گرفتار تھے اور یہ حال ہوا کہ ایک دن میرے سامنے

روتے لگے اور کہا کہ اس عشق نے تو میرا ایمان بھی برباد کر دیا نہ میرا اسلام کچھ رہا نہ ایمان بس اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں اور وہ مسلمان ہے تو میں مسلمان ہوں۔ میں نے کہا تو بے توبہ کرو یہ کیا بکتے ہو مگر وہ ایسے بخود تھے کہ باوجود میرا ادب کرنے کے میرے سامنے بھی ایسے کلمات کفر کہہ گئے۔ حضرت یہ نظر بد سخت خطرناک ہے۔ حدیث میں ہے النظر سہم من سہام ابلیس (روی الحاکم عن ابی حذیفہ و صحیح اسنادہ کذا فی تخریج المراقی) کہ یہ شیطان کا تیر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے ۵

درون سینہ من زخم بے نشاں زدہ . بچہ تم چہ عجب تیر بے کماں زدہ

(میرے سینے میں ایسا زخم مارا کہ اس کا نام و نشان بھی نہیں ہے میں حیرت زدہ ہوں کہ بدن کمان کے عجب تیر مارا ہے) واقعی یہ تیر بے کمان ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے رمضان میں تمام گناہوں سے عموماً اول نظر بد سے خصوصاً نہایت اہتمام کیسے بچنا چاہیے یہ مضمون صرف استطراداً بیان ہو گیا کیونکہ اس وقت جو آیت میں تے پڑھی ہے اور اس کے مضمون بیان کرنے کا ارادہ ہے اس کو رمضان سے صرف اسی وجہ سے تعلق نہیں ہے کہ آیت میں اتفاق کا ذکر ہے اور رمضان میں اتفاق کی قیامت وارد ہے بلکہ زیادہ تعلق دوسری وجہ سے ہے مگر استطراداً کچھ مضمون اتفاق کے متعلق بھی بیان کر دیا گیا کیونکہ آیت میں تو اتفاق کا بھی ذکر ہے گو مجھ کو مقصود بالذات دوسرا مضمون ہے اب میں اصل مقصود کو شروع کرنا چاہتا ہوں جس کے لئے اول ترجمہ آیت کا سنا ضروری ہے تاکہ ترجمہ نہ جاننے والوں کو بھی ربط کا عجیب ہونا معلوم ہو جائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں (تاکہ آئندہ اتفاق بھی اور دوسرے اعمال صالحہ بھی سہولت سے صادر ہوا کریں) ان لوگوں کے صدقات و نفقات کی حالت مثل ایک بلوغ کی حالت کے ہے جو بلند زمین پر ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زمین تو نشیب کی اچھی ہوتی ہے جس میں پانی ٹھہرے بلند زمین میں پانی کیونکر ٹھہرے گا۔ جو اب یہ ہے کہ زمین بلند سے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ وہ گنبد ہے بلکہ بلند ہے اور مسطح بھی ہے کیونکہ بلندی پر ہوا الطیف ہوتی ہے اس کے بعد ارشاد ہے اصابہا و ایل اس کو موسلا دھار بارش نصیب ہوگئی تو وہ اپنا پھل دوچند لایا یا چار چند۔ دو باتیں اس لئے کہی کہ ضعف کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ضعف کہتے ہیں مجموعہ مثلین کو توضعیفین ثنیم ہے اس کے معنی چار مثل یعنی چار چند کے ہو گئے اور بعض نے کہا ہے



کہ ان مثلیں میں سے ہر مثل کو ضعف کہتے ہیں ان کے نزدیک ضعیفین کا ترجمہ دوچند ہوگا جیسے زوج کبھی ہر فرد کو کہتے ہیں جس کا تشبیہ زوجین بمعنی صغیرین آتا ہے اور کبھی مجموعہ فردین کو کہتے ہیں جیسے دو کے عدد کو زوج کہتے ہیں بمعنی مجموعہ عددین آگے فرماتے ہیں فان لم یصبہا وابل فطل اور اگر اس کو موسلا و دھار بارش نہ پہنچے تو پھوار بھی کافی ہے ای فطل یکفیدہ او یکفیدہ طل یا تو طل مبتدا ہے خبر محذوف ہے یا فاعل ہے جس کا فعل مقدّم ہے اور نکرہ کا مبتدا ہونا جو ممنوع ہے وہ اس وجہ سے کہ مقید نہیں ہوتا اور اگر مقید ہو تو مبتدا ہونا جائز ہے اور یہاں مقید ہے وجہ افادہ کی یہ ہے کہ یہ صورت نکرہ ہے اور معنی نکرہ موصوفہ ہے کیونکہ طل سے مراد مطلق طل نہیں بلکہ وہ طل ہے جو اس باغ سے لگے اس کو پہنچنے اس کے بعد ارشاد ہے واللہ بما تعملون بصیرہ اس کا ربط آیت کے اجزا کی تحلیل سے معلوم ہوگا بدون اس کے معلوم نہ ہوگا اور تحلیل اجزا میں طول ہے اس لئے اُس کو ترک کرتا ہوں اگر موقع ہو تو اخیر میں اس پر بھی تشبیہ کر دوں گا خدا کرے یاد رہے۔ اب میں اپنا مقصود جو اس آیت سے مجھے استنباط کرتا ہے بیان کرتا ہوں اور وہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو میں اپنے احباب سے اکثر خاص خطاب سے عرض کیا کرتا ہوں اور آج عام خطاب سے سب کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ پس مسئلہ تو جدید نہیں مگر شاید تقریر میں کچھ جدت آجائے اور قدیم بھی ہو تو ہر قدیم فرسودہ نہیں ہوتا... آسمان کتنا پرانا ہے مگر حالت یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فارجم البصر هل تری من فطور ثم ارجع البصر کورتین ینقلب الیک البصر خاصاً و هو حسیوہ کہ ذرا دیکھو تو کہیں سے کچھ پھٹا ہوا نظر آتا ہے پھر بار بار دیکھو تو نگاہ تھک کر لوٹ آئے گی (اور کوئی شقاق یا فطور نظر نہ آئے گا) شمس و قمر کتنے پرانے ہیں مگر دیکھو ویسے ہی آب و تاب کی ساتھ اب تک موجود ہیں اور بعض پرانے نئے پڑھوں سے اچھے ہیں۔ بہر حال مضمون کا جدید ہونا کچھ ضرور نہیں مگر آج کل لوگوں کو جدت کا ہیضہ ہے، ہیضہ مردوں کو بھی

ہوتا ہے گو حیض عورتوں ہی کو ہوتا ہے مگر ہیضہ اور حیض قریب ہی قریب ہے۔ تجوید و قرأت سے کون بولتا ہے عام تکلم و تلفظ میں تو حیض ہیضہ برابر ہے۔ قرأت پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک قاری ضا نے اپنے شاگردوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ہر بات قرأت سے کیا کرو تو ایک دفعہ حقہ پیئے ہو قاری ضا کے عمامہ پر چنگاری گر پڑی شاگرد نے قاری صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم قرأت کے ساتھ پڑھ کر نہایت ترتیل سے کہا جناب قاری صاحب جناب قاری ضا آپ کے عمامہ شریف پر آگ کی ایک چنگاری گر پڑی ہے اور ہر جگہ خوب دکھینچا اتنی دیر میں عمامہ کئی انگل جل گیا وہ مسئلہ یہ ہے کہ آج کل بعض سالکین کو سہولت کی بہت تلاش ہے جس کی وجہ صرف راحت طلبی ہے جیسے ایک طبیب ماہر کہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی ہوتی کہ سارا کھانا ایک دم سے پیٹ میں اتر جایا کرے لقمہ لقمہ نہ کھانا پڑے تاکہ تداخل طعام نہ ہو خیر اس شخص کی اس رائے کی بنا تو ایک مصلحت بھی ہے لیکن آج کل تو ایسا ممکن بھی ہوتا تو اس کی بنا راحت طلبی ہی ہوتی۔ افسوس آج کل سالکین بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے خود بخود سارا کام ایک دن میں ہو جائے یہ سخت غلطی ہے۔ صاحبو! راحت کی جگہ تو عالم آخرت ہے اور وہاں بھی جو راحت حاصل ہوگی وہ بھی دنیا کی جہد کا ثمرہ ہے۔

ع چند روزے جہد کن باقی بختند

(چند دن مجاہدہ کر لو پھر تعلق مع اللہ کی دولت پانے کے بعد تمام زندگی بہار دائمی ہمکنار ہوگی) بدون مشقت و مجاہدہ کے راحت نصیب نہیں ہو سکتی ہاں اگر حق تعالیٰ خود ہی دنیا میں راحت دیدیں تو اور بات ہے تمکو طلب راحت کا کیا حق ہے تمہارا مذاق تو یہ ہونا چاہیے کہ

زندہ کئی عطائے تو در بکشتی خدائے تو دل شدہ میتلایے تو ہر چہ کئی رضا تو

آپ اگر زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر میری جان فدا و قربان ہے دل تو

آپ پر قربان ہے جو چاہیں آپ ہمارے ساتھ معاملہ فرمائیں

مولانا ایسے ہی لوگوں کی بابت فرماتے ہیں کہ

پس زبوں و سوسہ باشی دلا گھر طرب را باز دانی از بلا

دلے دل اگر تو راہ عشق کی کلفتوں کو غیش سمجھنے کے بجائے بلا سمجھے گا تو نامراد ہو کر

بُرے و سوسوں میں مبتلا رہے گا۔

اور فرماتے ہیں ۵

تو بیک زخمی گریزانی ز عشق تو بجز نامی چہ می دانی ز عشق  
(تو ایک ہی زخم سے اپنے دعویٰ عشق سے بھاگ نکلا پھر تو سوائے نام عشق سن لینے  
کے اور عشق کا مفہوم تو کچھ نہیں جانتا)

پس آجکل سالکین کی محبت و طلب کی یہ حالت ہے جیسے ایک شخص ایک درخت  
کے نیچے بیٹھ کر کہا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ کسی ظریف نے سُن لیا اس نے اُس کے  
ساتھ دل لگی کی کہ اگلے دن اندھیرے سے اس درخت پر ایک رسی ساتھ لیکر جا بیٹھا  
جب رات کو وہ شخص آیا اور وہی دعا شروع کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ لے تو اس ظریف  
نے دبی زبان سے کہا کہ اے میرے بندے آج میں تجھے کھینچتا ہوں یہ رسی اپنے گلے  
میں ڈال لے وہ بڑا خوش ہوا کہ اب مجھے معراج ہوگی رسی کا پھندا فوراً گلے میں ڈال لیا  
اور ظریف نے کھینچنا شروع کیا جب ایک بالشت زمین سے اٹھا اور پھندے  
سے گلا گھٹنے رگا تو فوراً کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھینچتا اس نے رسی چھوڑ دی  
اور اس نے فوراً پھندا گلے سے نکال کر اپنے گھر کا رستہ لیا پھر ساری عمر اس درخت  
کے نیچے جانے کا نام نہیں لیا بس یہی حالت آجکل کے طالبوں کی ہے کہ جب تک تکلیف  
نہ ہو حتیٰ کہ عمل میں بھی کچھ مشقت نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت و عشق کا  
دعویٰ ہے اور جہاں کچھ تکلیف یا مشقت ہوئی سارا عشق رخصت ہوا حالانکہ ان کو تو  
جان دینے کے لئے تیار رہتا چاہیے ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے۔

متاع جان جانان دینے پر بھی سستی ہے الی آخرہ

مگر اب سالک سالک نہیں ہونا چاہتے بلکہ مالک ہونا چاہتے ہیں اسی لئے سہولت کے  
طالب ہیں چنانچہ میرے پاس کثرت سے خطوط میں یہ فرمائش آتی ہے کہ کوئی سہل طریقہ آسان ساعل  
کوئی سہل نسخہ بتلا دیجئے ایسی درخواست کا جواب ایک بزرگ نے خوب دیا ان سے  
ایک پیشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر نے یہی درخواست کی تھی کہ کوئی سہل سا طریق بتلا دیجئے

جس سے بہت جلدی کامیابی ہو جائے بزرگ نے ابھی اس کا جواب نہیں دیا بلکہ باتوں میں لگا یا اور باتوں میں ان سے دریافت کیا کہ ڈپٹی صاحب ذرا اپنی سوانح عمری تو بیان فرمائیے کہ آپ نے کیا کیا پڑھا اور کس طرح ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ انھوں نے اپنی سرگذشت بیان کی کہ بارہ سال تک انگریزی پڑھی بی۔ اے کا امتحان دیا پھر قانون کا امتحان دیا پھر سال پھر تک ملازمت کے لئے سفارشیں حاصل کیں درخواستیں دیں تو نائب تحصیلدار ہوا پھر کئی سال کے تحصیلدار ہوا پھر ڈپٹی کلکٹر ہوا اور ساہا سال کی ملازمت کے بعد اب پنشن ملی ہے۔ جب یہ اپنی سرگذشت بیان کر چکے تو بزرگ نے فرمایا کہ آپ کو شرم تو نہیں آتی کہ دتیا مردار کیلئے تو اتنی عمر برباد کی اور مشقتیں برداشت کیں اور طلب خدا کے لئے یہ درخواست ہے کہ تھوڑی سی مدت میں کامیابی ہو جائے۔ ڈپٹی صاحب کم از کم طلب خدا کے لئے اس سے دگنی مدت تو صرف کرو کیونکہ آخرت دنیا سے افضل ہے۔ رتو افضل کے لئے مفضول سے دگنی مدت تو چاہئے ورنہ مساوی تو ضرور چاہئے۔ واقعی عقل کا مقتضی تو یہی ہے جو ان بزرگ نے فرمایا۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ جو لوگ طلب خدا میں سہولت کے طالب ہیں وہ کسی سخت غلطی میں مبتلا ہیں ہم کو تو وہ کام کرنا چاہیے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے۔ وصول و حصول کا تقاضا نہ کرتا چاہیے کیونکہ ہماری برائے نام کوشش پر وصول و حصول کا مرتب ہو جانا خود خلاف قاعدہ ہے تو اس برائے نام کوشش پر حصول ثمرات کا اپنے کو مستحق سمجھنا اور عدم حصول پر شکایت کرنا سخت ناانصافی ہے اور وہ کام کیا ہے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے وہ تحصیل عمل بالاختیار ہے کہ اپنے اختیار کو صرف کر کے اعمال کو بجالائیں اور اسی استعمال اختیار کا دوسرا لقب امانت ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانة على السموات والارض والجبال قابلهن ان يحملننا واشفقن منها وحملها الانسان ط کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین و جبال پر پیش کی کہ اس کا تحمل کرتے ہو تو سب نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ اس امانت سے مراد کیا ہے۔ محققین علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تکلیف تشریحی مراد ہے اور تکلیف کے معنی تحصیل عمل بالاختیار کیونکہ مطلق عبادت و اطاعت سے تو کوئی شے خالی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثما استوى الى السماء

وہی دختان فقال لہا ولا رضى ائتیا طوعا او کرہا قالتا اتینا طائعتین ہا کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہمارے احکام (تکوینیہ) کے لئے تیار ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے تیار ہیں اور لفظ طائعتین سے صاف رد ہو رہا ہے ان لوگوں کا جو سموات و ارض و جمادات کی عبادت کو حالیہ یا قسریہ کہتے ہیں میں کہتا ہوں کیا قسرو حال میں طوع بھی ہو کرتا ہے ہرگز نہیں۔ بہر حال عادل و مطیع تو تمام مخلوقات ہیں لیکن مکلف سب نہیں بجز انسان کے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف و اطاعت میں فرق ہے اور جس امانت سے تمام عالم گیرا گیا وہ تکلیف ہی ہے جس سے مراد عمل مع الاختیار ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے کچھ احکام تشریحیہ ہیں ان کا مکلف بالاختیار کون ہوتا ہے یعنی جو شخص ان کا تحمل کرے گا اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کی جائے گی یعنی اس کی قوت ارادہ ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ ہوگی بلکہ عمل و عدم عمل دونوں پر قدرت دیجائے گی پھر جو اپنے اختیار سے احکام کو سجالائے گا اسکو مقرب بنا لیا جائے گا اور جو اپنے اختیار سے احکام میں کوتاہی کرے گا اسکو مطرود کر دیا جائے گا۔ اس سے سموات و ارض و جبال اور تمام مخلوق ڈر گئی۔ انسان اس کے لئے تیار ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس کو مکلف بنا دیا یعنی اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کر دی گئی۔ باقی مخلوقات میں یہ صفت اختیار اور عقل نہیں ہے (وہ جن احکام تکوینیہ کو یا عبادت کو سجالاتے ہیں وہ ان کیلئے طبعی ہیں یعنی ان کی قوت ارادہ اس کے خلاف کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی بخلاف انسان کے کہ جن احکام کلیہ مکلف ہے وہ اس کے لئے طبعی نہیں بلکہ اس کی قوت ارادہ عمل و عدم عمل دونوں کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اب اس کی تکلیف کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ اپنے اختیار سے ایک جانب کو ترجیح دے یعنی جب نمل کو مورات اور جب عدم عمل کو منہیا میں اسی کا نام تحصیل عمل ہے) اور اس کے یازم نہیں کہ غیر انسان عاقل نہ ہو ممکن ہے کہ دوسری مخلوقات بھی عاقل ہوں مگر عاقل کامل نہیں یعنی ان کو عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں جو تکلیف احکام کے لئے کافی ہو۔ آخر صبی براہق بھی تو عاقل ہے مگر باوجود عقل کے مکلف نہیں کیونکہ اس کی عقل کامل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو اور چونکہ اس پر کوئی شرعی اشکال لازم نہیں آتا اس لئے اس کا قائل ہوں کہ تمام

مخلوقات، حیوانات و نباتات حتی کہ جمادات بھی عاقل ہیں یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کے سوا سب غیر عاقل ہے ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو پس وہ مثل مراہق کے عاقل ہو سکتے ہیں اس کی کسی نص سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے۔ آخر ہد ہد کی گفتگو حضرت سلیمانؑ کی ساتھ جو قرآن میں مذکور ہے کیا یہ سب طبعی کلام ہے ہرگز نہیں بلکہ عاقلانہ کلام ہے اور اگر اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ قرار دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کے لئے بعض حیوانات کو عقل دیدی تھی تو میں کہوں گا کہ اب بھی بعض حیوانات کی حرکات ایسی ہوتی ہیں جن کو خالی از عقل کہنا دشوار ہے چنانچہ جس کی حکایت میں اب بیان کرتا ہوں وہ مرحوم مرگیا یعنی ہمارے گھر میں ایک طوطا تھا اس نے ایک دن بیسیوں کو پان کھاتے دیکھ کر خود بھی پنجرہ سے نکل کر اس ترتیب سے پان کھایا کہ اول تو پان کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا پھر چونہ کی ڈبیہ میں سے چونچ پر ذرا سا چونہ لیا پھر کتھ کی ڈبیہ میں سے کتھ لیا اور دودانہ چھالیہ کے اٹھائے اور سب کو بلا کر کھا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں ہی تمباکو کی ڈبیہ تھی مگر تمباکو نہیں کھا یا سب کو اس حرکت پر حیرت ہو گئی کہ اس نے کیونکر باقاعدہ سارا کام کیا اور جب حیوانات میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی وہ مکلف نہیں تو یہاں سے سمجھ لو کہ اگر مجاذیب میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے اور یہ نہ کہنا چاہئے کہ ان کو تو کھانے پینے کا پورا ہوش ہے پھر یہ مجذوب کہہ کر سے ہو اسی لئے شیخ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ مجاذیب پر اعتراض نہ کرو گونہ ظاہر میں وہ صحیح الحواس معلوم ہوں کیونکہ صحت حواس تو بہائم میں بھی ہے جانور بھی اپنے نفع و نقصان کو سمجھتا ہے مگر اتنے ادراک سے وہ مکلف نہیں ہوا تو مجذوب بھی باوجود عقل قلیل کے غیر مکلف ہو سکتا ہے جس کی مثال واضح وہی ہے صبی مراہق کی مگر اس کے لئے ایک معیار بھی ہے کہیں تم کافروں کو بھی مجذوب نہ کہنے لگو وہ معیار یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ۵

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں ہست دانان رحمۃ للعالمین

(جملہ اہل عقل کا مقولہ ہے اور واقعی دین کا محقق تمام کائنات کے لئے اپنے دور حیا میں رحمت ہوتا ہے)

۵۵ نظرافت سے مرحوم کہہ دیا ۱۲

یہ دوسرا مصرعہ جملہ معترضہ ہے جو بطور مدح کے درمیان میں لایا گیا ہے کہ واقعی محقق بھی عالم کے لئے سراپا رحمت ہے یہ گفت کا مقولہ نہیں اس کا مقولہ اگلے شعر میں ہے ۵

گر انارے می خری خنداں بخر  
کہ دہد خندہ اش زدانہ او خیر  
(شعراول میں جملہ اہل عقل کا مقولہ یہ ہے کہ جب انار خریدنے کا ارادہ ہو تو کھلا

ہوا خریدنا کیونکہ انار کا کھلنا اس کے اندر کے دانوں کی حالت آگاہ کرتا ہے)

کہ اگر ایک انار خریدو تو کھلا ہوا خریدو کیونکہ کھلے ہوئے انار کا اندرونی حال ظاہر ہو جاتا ہے  
بند انار مت لو کہیں اندر سے کچا اور خراب نہ نکلے ۵

نامبارک خندہ آن لالہ بود  
کہ خنداں اور سواد دل نمود

رگل لالہ کا کھلنا اس کے لئے نامبارک ہے کیونکہ اس کے اندر کا عیب (سیاہی) ظاہر ہو جاتا ہے) مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کرو اور اس سے فیض لینا چاہو تو پہلے علامات و آثار کو دیکھ کر اسے جانچ لو اگر وہ سالک ہو تو آثار سلوک کو دیکھو اور اگر مجذوب ہو تو یہ دیکھو کہ اس زمانہ کے صلحاء اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں اگر وہ اس کو مجذوب کہیں اچھا سمجھیں تو وہ اچھا ہے گو نماز روزہ کا پابند نہ ہو۔ اگر صلحا زمانہ اس کو مجذوب نہ سمجھیں اور ظاہری حالت اس کی خلاف شرع ہو تو اس کے پاس نہ جاؤ تو امانت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات سے فرمایا کہ یہ صفت اختیار ہے اور یہ عقل ہے ان کو کون لیتا ہے جو ان کو لے گا وہ مکلف احکام بنایا جائیگا اس سے سب ڈر گئے اور انسان تیار ہو گیا پس مکلف بجز انسان و جنات کے کوئی نہیں اور شمس و قمر و اجار جو جہنم میں جائیں گے تو معذب ہو کر نہ جائیں گے تاکہ تکلیف کا شبہ ہو بلکہ آلہ تعذیب ہو کر جائیں گے تاکہ کفار کو ان کو دیکھ کر حسرت ہو کہ افسوس ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا جو ہماری تو کیا اپنی بھی امداد نہیں کر سکتے اور گو امداد امداد کا علم غیبت میں بھی ہو سکتا تھا مگر اس صورت میں کفار کو یہ وسوسہ ہوتا کہ نہ معلوم خدا تعالیٰ نے ہمارے معبودوں کو کہاں مقید کر دیا جو ہماری امداد نہ کر سکے اس لئے سب کو پاس پاس کر دیں گے کہ لو یہ تمہارے معبود ہیں اگر ان میں کچھ طاقت ہے تو ان سے امداد طلب کر لو اس صورت میں ان کو حسرت زیادہ ہوگی اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کو

کیا سوچھی تھی جو اس امانت کے لئے تیار ہو گیا کیا یہی سب سے بڑا تیس مارخاں تھا اس کا جو آپ یہ ہے کہ انسان میں عشق کا مادہ بہت زیادہ ہے اسی لئے میں ابتداء طالب علمی میں کہا کرتا تھا کہ انسان کی حقیقت حیوان عاشق ہے اس کی فصل عاشق ہے کیونکہ ناطق تو جنات و ملائکہ بھی ہیں عاشق انسان کے سوا کوئی نہیں (اور عشق و محبت میں فرق ہے اس لئے محبت کا وجود ملائکہ و جنات میں بھی ہو سکتا ہے میں محبت کی ان سے نفی نہیں کرتا عشق کی نفی کرتا ہوں جس کے لئے جوش اور شور اور بیجان دولہ لازم ہے ۱۲) غرض انسان میں عشق بہت زیادہ تھا اور اس وقت بھی تھا جبکہ اسکو عقل کامل بھی عطا نہ ہوئی تھی (کیونکہ عقل کامل تو بعد حمل امانت کے عطا ہوئی اور غلبہ عشق تو قلت عقل ہی میں زیادہ ہوتا ہے اسی لئے کیفیات باطنہ کا غلبہ قلیل العقل پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ غلبہ کیفیات کے لئے یکسوئی شرط ہے جو غیر عاقل کو زیادہ میسر ہوتی ہے اور عاقل کو تو یکسوئی کے برابر بھی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دماغ برابر کام کرتا رہتا ہے اور یہ گفتگو قاعدہ کی بنا پر ہے ورنہ باب جذب الہی ہر شخص پر مفتوح ہو سکتا ہے وہ کسی قاعدہ سے مقید نہیں۔ بہر حال انسان کے عمل امانت کا منشاء عشق تھا اور اس کو میں نے عارف شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں ۷

آسماں بار امانت تنوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان نے شریعت کے بار کو اٹھانے سے عاجزی ظاہر کی اور ہم دیوانوں کے نام

قرعہ فال نکل آیا یعنی انسان نے سر پر یہ بار اٹھا لیا۔)

اس میں لفظ دیوانہ سے منشاء حمل امانت پر اشارہ ہے (اور اسی سے معلوم ہو گیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے جو محبت کے علاوہ درجہ ہے (۱) جب یہ معلوم ہو گیا کہ امانت اختیار و عقل کا نام ہے تو جو لوگ تسمیل کے طالب ہیں وہ اس امانت اختیار کو برباد کرنا چاہتے ہیں کہ بس ہم کو اپنے ارادہ اور اختیار سے کچھ نہ کرنا پڑے مفت سہولت سے کام ہو جائے یا کہے کوئی ایسا حال غالب ہو جائے کہ گناہ خود بخود چھوٹ جائیں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے ایسا استغراق ہو جائے کہ تازہ میں خود بخود دل لگنے لگے ہمکو احضار قلب کی ضرورت نہ ہو گویا یہ شخص صفت اختیار کو معطل کرنا چاہتا ہے اور جو شخص امانت الہیہ کو اور ایسی بڑی نعمت کو ضائع کرے جس میں انسان تمام مخلوق سے



ممتاز ہے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا بزرگوں نے تو اللہ تعالیٰ کے تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی صوفی کے متعلق سنا کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے لذیذ شوربے میں پانی کا پیالہ بھر کر ڈال دیتا ہے تاکہ نفس کو لذت نہ آئے فرمایا طفل طریقت ہے یہ اس تجلی الہی کو برہنہ کرتا ہے جو لذیذ طعام کے ساتھ متعلق ہے اور اس حکمت کو برباد کرتا ہے جو لذائذ دنیا میں رکھی گئی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ یہ نمونہ ہوں لہذا آخرت کا مگر اس تجلی کا انکشاف اور اس حکمت کی معرفت محض نیت کرنے اور نیت ان اکل اللذیذ لیکون انمود جلالاخرۃ کہنے سے حاصل نہیں ہوتی کہیں آپ آج ہی سے نفس پرستی اور لذات میں انہماک شروع کر دیں بلکہ اس کی معرفت بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

صوفی نشود صفائی تا ورنہ کشد حامی بسیار سفر باید تا پختہ شود حسامی

صوفی کے نفس کی صفائی ہمیں ہوتی جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا جام نہ پیئے بہت مجاہد کے بعد حامی پختگی سے تبدیل ہوتی ہے اس لئے بسیار سفر کی ضرورت ہے اور بسیار سفر کو تو آپ کیا سمجھیں گے میں اس وقت دو سفر بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سالک کا ایک سفر تو الی الاحوال ہے کہ اس پر حالات طاری ہوتے ہیں اور ایک دوسرا سفر من الاحوال ہے جس میں وہ سب احوال سلب ہو جاتے ہیں پھر اس کے بعد دوسرے نوع کے احوال عطا ہوتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں درختوں پر دو قسم کے پھول آتے ہیں ایک چھوٹا پھول ہوتا ہے وہ چند روز کے بعد چھڑ جاتا ہے اس وقت تا واقعہ روتا ہے کہ ہائے میرا باغ برباد ہو گیا مگر محقق خوش ہے کہ الحمد للہ سفر اول ختم ہو کر سفر ثانی شروع ہوا زاول عروج ہے۔ دوسرا نزول ہے ۱۲ ظ) پھر سچا پھول آتا ہے وہ باقی رہتا ہے اب اس پر پھل لگنے شروع ہوتے ہیں یا جیسے صبح دو ہوتی ہیں کاذب جس کا نور جلدی ہی زائل ہو جاتا ہے۔ دوسری صادق جس کا نور بڑھتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

اے شدہ تو صبح کاذب را رہیں صبح صادق راز کاذب ہم بسیں

راے شخص تو صبح کاذب کے فتنے میں پڑ گیا اور دھوکہ سے اسی کو صبح صادق سمجھ گیا حالانکہ صبح صادق کی تحقیق تجھ پر لازم تھی تاکہ کاذب اور صادق کا فرق معلوم کر سکے

عہ اور عجیب بات ہے کہ پہلا پھول زیادہ بھرپور دار ہوتا ہے۔ دوسرا بھرپور دار نہیں ہوتا

یہی کیفیت حالات تلویں تمکین کی ہے ۱۲ ظ

مولانا نے سفر اول کو صبح کاذب سے تشبیہی اور سفر ثانی کو صبح صادق سے کہ جیسے اول صبح کاذب کی روشنی آتی ہے جس کی روشنی بڑھتی چلی جاتی ہے اسی طرح سالک پر دو حالتیں گذرتی ہیں ایک میں احوال ناقصہ عطا ہوتے ہیں اور دوسری منزل میں احوال ناقصہ سلب ہو کر احوال کاملہ عطا ہوتے ہیں۔ اب یہ شخص پختہ ہو گیا اس کو حق ہے کہ لذائذ بھی کھائے اور عمدہ لباس بھی پہنے کیونکہ اب یہ ہر شے میں تجلی حق کا مشاہدہ کرتا اور اس کا حق ادا کرتا ہے۔ صوفی خام کو حق نہیں کہ مرغ مسلم کھایا کرے لیکن اگر بلا تکلف مل جائے تو اڑکار بھی نہ کرے کھالے بشرطیکہ حلال ہو اور حلال بھی حاصل ہوتا ضرور نہیں بلکہ نخالص بھی کافی ہے یعنی جو فتویٰ سے حلال ہو بس وہ حلال ہے زیادہ کاوش اور تقویٰ بھگوانے کی ضرورت نہیں جیسے ایک شخص کی ہمارے قصہ کے افسر پولیس نے دعوت کی تھی آپ نے دعوت قبول کر کے عین وقت پر رکھو دکر یہ شروع کی کہ یہ دودھ کہاں آیا گوشت کس طرح آیا غلہ کیسے داموں سے آیا تنخواہ کے روپیہ سے یا دشوت سے یہ غرض بہرے مجمع میں داعی کو ذلیل کیا یہ تقویٰ کا ہیضہ ہے اگر کسی شخص پر اطمینان نہ ہو تو یا تو اس کی دعوت ہی منظور نہ کرے لطیف پیرایہ سے عذر کر دے یہ نہ کہے کہ آپ کی آمدنی حرام ہے اس لئے دعوت قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس عنوان سے اس کی دل شکنی ہوگی باقی امر بالمعروف کے لئے اور بھی بہت دقت ہے اسی وقت امر بالمعروف ضرور نہیں کیونکہ امر بالمعروف میں یہ بھی شرط ہے کہ ایسا وقت اور موقعہ تجویز کرے جس میں مخاطب کے قبول کی امید ہو پس یا تو عذر کر دے یا یہ کر دے جیسا میں نے ایک کھانا دار سے معاملہ کیا انھوں نے میری دعوت کی میں نے مجمع کے سامنے تو بلا شرط قبول کر لی پھر تنہائی میں لہجہ کران سے کہہ دیا کہ ذرا کھانے میں اس کی رعایت رکھی جائے کہ تمام سامان تنخواہ کی رقم سے کیا جائے۔ وہ کہنے لگے صاحب بھلا یہ کب ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی ناپاک مال کھلاؤں۔ اس طرح اپنا بھی بچاؤ ہو گیا اور داعی کی دل شکنی بھی نہ ہوئی غرض یہ کہ جو مال فتویٰ سے حلال ہو اس میں تا مل نہ کرو۔ مولانا فضل الرحمن خاں صاحب گنج مراد آبادی کے ایک خلیفہ تھے جو حاضر خدمت رہتے تھے ایک بار مولانا کے یہاں کہیں سے کھانا آیا ہاتھ

نے ان کے پاس بھیجا یا وہ کہنے لگے کہ آپ نے کچھ تفتیش بھی کر لیا ہے کہ حلال ہے یا حرام تو مولانا نے فرمایا ارے کھالے بڑا حلال کھانے والا آیا زیادہ تحقیق کرے گا تو بھوکوں مر جائے گا۔ مولانا کا مطلب بھی یہی تھا کہ جو مال فتویٰ سے حلال ہو وہی کافی ہے گو اہل ورع کے نزدیک حلال نہ ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل اللہ کو تو عطاے حق کی اتنی قدر ہے کہ ان بزرگ نے شور بہ میں پانی ملانے والے صوفی کو طفل طریقت فرمایا کہ تجلی الہی کو برباد کرتا ہے اور وہ تجلی مذکور ہے نعماء آخرت کی اور اس کو فقہانے بھی سمجھا ہے میں ان کو بھی حکماء امت سمجھتا ہوں جیسا کہ صوفیہ کو سمجھتا ہوں اور حیرت ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں بڑا جھگڑا ہے مگر یہ جھگڑا غیر محققین میں ہے محقق دونوں کا جامع ہوتا ہے تو ہدایہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ چار انگشت تک ریشم مردوں کو بھی جائز ہے وہاں ایک دلیل تو نقلی لکھی ہے اور ایک دلیل عقلی لکھی ہے لتکون انموذجا لحریر البحتہ یعنی تھوڑا سا ریشم مردوں کے لئے اس واسطے جائز کر دیا گیا تاکہ حریر جنّت کا نمونہ سامنے ہو جائے پھر یہ حکمت دیگر لڈائڈ و نعم کو بھی عام ہے اس لئے اس کے ابطال کو محقق نے ناپسند کیا اور مبطل کو طفل طریقت کہا اسی طرح جو شخص سہولت کا طالب ہے وہ امانت الہیہ اختیار کو باطل کر رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے اہل اللہ نے بہت سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

پتا پتہ ایک بار حضرت غوث اعظم رحمہ اللہ وعظا فرما رہے تھے کہ درمیان میں دفعۃً ساکت ہو گئے اور کچھ دیر تک ساکت رہ کر پھر بیان شروع فرمایا اور کہا کہ اس وقت میرے سکوت کی یہ وجہ ہوئی کہ ایک بزرگ ابھی شام سے بغداد ایک قدم میں بطور کرامت کے آئے تھے میں نے ان کو متنبہ کیا ہے کہ اس تصرف میں حکمت عطاے قدم کا ابطال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قدم اس لئے دیئے ہیں تاکہ ان سے مٹی کا کام لیا جائے جب بطور کرامت کے راستے طے کیا جائے گا تو اس میں یہ حکمت باطل ہوگی وہ بزرگ اس سے توبہ کر کے واپس ہو گئے مطلب یہ ہے کہ خود ایسا تصرف نہ کرنا چاہیے اور اگر بلا قصد کے کبھی حق تعالیٰ طویل راستہ کو قصیر کر دیں تو وہ کرامت غیر اختیار یہ ہے

جو نعمت ہے نیز طے طریق کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں جیسا حدیث میں ہے اللہ اعلم اعلمنا  
 البعد صرف تعرف بالقصد کی ممانعت ہے ۱۲) اسی طرح ایک بار ہمارے حضرت حاجی صاحب  
 کے یہاں بے وقت بہت سے مہمان آگئے گھر والوں کو فکر ہوئی تو حضرت نے اپنا رومال  
 گھر میں بھینچا یا کہ اس کو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کرو ان شاء اللہ تعالیٰ برکت  
 ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایسی برکت ہوئی کہ سب مہمانوں نے فراغت سے کھانا  
 کھا لیا اور بہت بچ رہا۔ اس کی اطلاع حضرت حافظ محمد صنا من صاحب رحمۃ اللہ  
 علیہ کو ہوئی تو آپ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کرامت مبارک  
 ہو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا تعرف عطا فرمایا۔ بس آپ کا رومال سلامت رہے۔ پھر  
 دنیا میں قحط تو کیوں آئے گا۔ اور قحط میں جو حکمتیں ہیں وہ کیوں باقی رہیں گی۔ حضرت  
 حاجی صاحب کو تنبیہ ہوا اور فرمایا حافظ صاحب میں اس سے تو بہ کرتا ہوں ان شاء اللہ  
 پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔ تو حضرت جب اہل اللہ نے حق تعالیٰ کی ذرا سی تجلیات  
 کی اس قدر عظمت کی ہے اور ان کی حکمتوں کے ابطال کی ممنوع قرار دیا ہے تو بتلائیے  
 اتنی بڑی امانت کا ابطال جس پر تکلیف کا مدار ہے کیونکر ممنوع ہوگا۔ اب میں ان  
 لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں جو طریق میں سہولت کے طالب ہیں کہ وہ اس بے ادبی سے تو بہ  
 کریں جس کا بے ادبی ہوتا بھی شاید ان کو اب تک معلوم نہ ہوا ہوگا بلکہ وہ اب تک  
 اس طلب سہولت کو دینداری سمجھتے ہوں گے مگر وہ کان کھول کر سن لیں کہ اس طلب  
 میں وہ امانت الہیہ کا ابطال کر رہے ہیں پس سہل یہ ہے کہ وہ بجائے تسہیل کے اسہال  
 لے لیں جس سے ضعف ہو جائے گا تو پھر یہ معذور ہو جائیں گے۔ اس وقت مولانا ان  
 کے لئے عذر کا مستوی دیدیں گے، پھر وضو کی جگہ تیمم ہو جائے گا اور زیادہ ضعف  
 ہوا تو بجائے قیام کے قعود رہ جائے گا اور اس سے بھی زیادہ ضعف ہوا تو صوم و  
 صلوة سب ساقط ہو جائیں گے جو کامل سہولت ہے اور جب تک معذور نہیں  
 ہوئے اس وقت تک سہولت کی طلب کے کیا معنی جو کہ معذورین کے لئے خاص  
 ہے بلکہ غور کیا جائے تو وہاں بھی ان کو سہولت مزعومہ نہیں ہے کیونکہ اس عذر کے

سبب وہ سہل عمل بھی ان کو دشوار ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ تم تحصیل عمل کے مکلف ہو کہ اپنے اختیار کو صرف کر کے عمل کرو تم کو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں۔ ہاں صرف اتنا حق ہے کہ عمل تمہارے اختیار و قدرت سے خارج نہ ہو سو اس کا شریعت میں پورا لحاظ ہے کہ امور غیر اختیار یہ کا تم کو مکلف نہیں کیا بلکہ اختیارات کا مکلف بنایا ہے اب تم یہ چاہتے ہو کہ اختیارات میں ارادہ و اختیار و قدرت کے استعمال کی بھی ضرورت نہ رہے اس کا تم کو کیا حق ہے بلکہ اس میں سراسر ابطال امانت اختیار ہے جس کا جرم ہوتا اور پیر واضح ہو گیا پس تم کو تو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں ہاں اگر شریعت کسی جگہ خود تسہیل کا لحاظ کرے تو یہ اس کی عنایت ہے مگر تم کو اس کے مطالبہ کا حق نہیں۔ اور نصوص میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے بعض مقامات پر تحصیل و تسہیل دونوں کو جمع بھی کر دیا ہے مگر اس کا التزام نہیں کیا بعض جگہ محض تحصیل عمل کا امر ہے تحصیل معنوت عنہ کی رعایت نہیں کی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شریعت میں کہیں تو صرف امر وہی ہے کہ اس کام کو کرو اور اس کو نہ کرو یہ تو تحصیل کا عنوان ہے اور کہیں امر وہی کی ساتھ سہولت عمل کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے جس میں تکلیف و عنایت دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ مگر اس سے یہ سمجھ لیتا کہ شارع کے ذمہ تسہیل بھی ہے سخت نادانی ہے۔ شارع کو حق ہے کہ امور اختیار یہ کی تحصیل کا امر کرے اور سہولت عمل کا طریقہ نہ بتلائے اور اگر چاہے تو بتلا بھی دے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھ کر اب سنئے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے اتفاق کا امر فرمایا ہے یہ تو تحصیل ہے مگر اس میں تکلیف کی ساتھ عنایت کو بھی جمع کر دیا ہے بعبارت دیگر یوں کہئے کہ طلب تحصیل کی ساتھ تسہیل کی بھی رعایت کی ہے بیان اس کا یہ ہے کہ اتفاق فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری کے لئے عادتہ تصور غایت ضروری ہے جس کے بغیر صدور نہیں ہو سکتا پس صدور فعل کے لئے تصور غایت کا شرط عادی ہونا ضروری ہے اور وہ بھی اکثر لیکن اس میں مجھ کو کلام ہے کہ تصور غایت عقلاً بھی لازم ہے یا نہیں حکماء اس کو عقلاً لازم کہتے ہیں اسی لئے تصور غایت کو علت شمار کیا ہے جس کو علت غائیہ سے موسوم کرتے ہیں مگر اس کے لزوم عقلی میں

کلام ہے۔ آپ مدرسہ میں جا کر طلباء سے پوچھئے کہ وہ کس لئے پڑھ رہے ہیں سو میں سے ساٹھ بھی غایت نہ بتلا سکیں گے اور جو بتلائیں گے بھی ان میں بہت سے اسی وقت گھڑیں گے اور لیجئے کھانا تو سب کھاتے ہیں اور یہ فعل اختیاری ہے ذرا بتلا دو کہ کھانے کے وقت کیا غایت ذہن میں ہوتی ہے اور کیا سوچ کر کھاتے ہو یقیناً بہت سے آدمی کچھ بھی نہیں سوچتے اور کوئی غایت ان کے ذہن میں نہیں ہوتی ہاں جو ان پڑھ ہیں ان کی تو البتہ اس میں ایک غایت ہوتی ہے وہ کیا ہے ؟ ضابطہ (پاغذہ ۲) کہ کھائیں اور بگیں ۔۔۔ اور وہ بھی لازم التصور نہیں بلکہ لازم الترتیب آپ تعجب کریں کہ یہ کیسی غایت ہے ایک بڑے فلسفی نے یعنی صاحب شمس بازغہ نے بھی شمس بازغہ میں غایت کی یہ بھی ایک قسم لکھی ہے کالتغو طلا کل بتدرہ خدا کو مثال بھی ایسی ہی ملی مگر اعتراض کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہر شخص کا اپنا اپنا مذاق ہے ان فلسفیوں کی طبیعت ایسی ہی ہوگی ۔ جیسے ایک بادشاہ نے چار سمت کی چار عورتیں جمع کی تھیں ایک دفعہ اس نے سب کی طبائع کا امتحان کرنا چاہا اور رات کے اخیر حصہ میں سب سے پوچھا کہ اب کیا وقت ہے سب نے باتفاق کہا کہ صبح ہو گیا اس نے دلیل پوچھی تو ایک نے کہا کہ میری نیتہ کا موتی ٹھنڈا ہو گیا ہے یہ بہت لطیف وجہ بیان کی کیونکہ صبح کی ہوا میں خشکی زیادہ ہوتی ہے اس نے موتی کی ٹھنڈک سے اس پر استدلال کیا۔ دوسری نے کہا کہ پان کا مزہ منہ میں بدل گیا ہے۔ تیسری نے کہا کہ شمع کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے یہ دلائل تو لطف اور ادراک پر مبنی تھے۔ چوتھی نے کہا کہ میرا گواہ آرہا ہے بادشاہ نے اس بیوی کو الگ کر دیا کیونکہ اس کے جواب سے کثافت فہم مترشح تھی تو جیسے ان جوابات کی بنا اختلاف مذاق پر مبنی ایسے ہی شمس بازغہ کی مثال ان فلسفیوں کے مذاق کی خبر دے رہی ہے۔ غرض مجھے افعال اختیاریہ میں تصور غایت کا لزوم عقلی مسلم نہیں ورنہ مخالفت نہ ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعادۃ اکثر یہ بدون تصور غایت کے افعال اختیاریہ کا صدور دشوار ہے خصوصاً افعال شاقہ کا اور انفاق فعل شاق ہے تو اس کے قبل اس کی غایت کا تصور ضروری ہوگا سو یہاں دو غایتیں مذکور ہیں۔ اول غایت تو یہ بیان فرمائی ۱۔ ابتغاء مَرْضَاةِ اللّٰہِ کہ وہ لوگ

اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا، طلب کرنے کے لئے اس غایت کا اثر تو تحقیل ہے کہ اس کے تصور کے بغیر اس فعل اختیاری کا صدور عادتاً دشوار تھا اس کے بعد ایک اور غایت بیان فرماتے ہیں و تشبیتاً من انفسہم مفسرین کے لکھا ہے کہ یہاں من بمعنی لام ہے اسی تشبیتاً لا نفسہم یعنی دوسری غرض انفاق میں یہ ہوتی ہے کہ اپنے نفسوں میں (اعمال کے اندر) پختگی پیدا کریں اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض بخیلوں کے انفاق میں بہت دشواری ہوتی ہے جن کا مذاق یہ ہوتا ہے ۵

گر جاں طلبی مضائقہ نیست در زر طلبی سخن در این است

(اگر جان طلب کرو تو کوئی حرج نہیں مگر مال اگر طلب کرو گے تو اس میں اعتراض ہوگا) جیسا مولانا نے ایک بدوی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں ایک کتا اس کا رفیق تھا وہ مرنے لگا تو بدوی اس کی مفارقت کے غم میں رونے لگا۔ کسی مسافر نے پوچھا کہ تو کیوں روتا ہے کہا یہ کتا میرا رفیق سفر تھا اب یہ مر رہا ہے میں اس کے غم میں رو رہا ہوں پوچھا اس کو تکلیف کیا ہے کہا بھوکا ہے فاقہ سے مر رہا ہے اس نے دیکھا کہ ایک طرف ایک پوٹلا بندھا ہوا رکھا ہے بدوی سے پوچھا کہ اس پوٹلہ میں کیا ہے کہا سوکھی ہوئی روٹیاں ہیں کہا ظالم جب تجھے اپنے کتے سے اس قدر محبت ہے کہ اس کے غم میں رو رہا ہے تو اس میں سے ایک روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا تو وہ کہتا ہے ۵

گفت ناید بے درم در راہ ناں لیک ہست آب دو دیدہ را زگاں

(اس نے کہا کہ روٹی تو بغیر مال کے نہیں ملتی اور آنسو تو مفت کے نکل آتے ہیں) کہ مجھے اتنی محبت نہیں جو اسے روٹیاں کھلا دوں روٹی کو تو دام لگے ہیں اور آنسو مفت کے ہیں بس میں اتنی ہی محبت رکھتا ہوں کہ اس کو روٹیوں تو حق تعالیٰ و تشبیتاً من انفسہم میں ایسے بخیلوں کے لئے انفاق کی دشواری اور تنگی رفع کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم انفاق اسی نیت سے کرو کہ اس سے نفس میں قوت پیدا ہوگی اور انفاق سہل ہو جائیگا۔ بار بار اسی نیت سے انفاق کرو تو یہ مادہ راسخ ہو جائیگا اس غایت کا اثر تسہیل ہے اور جو طریقہ سہولت انفاق کا یہاں بتلایا گیا ہے یہ تمام اعمال

میں جاری ہے کہ تکرار عمل سے بہر عمل صعب سہل ہو جاتا ہے گو فطری خلق کی برابر سہولت نہ ہو یعنی جیسے فطری سخی کو اتفاق میں سہولت ہوتی ہے ویسی آسانی گونہ ہو مگر تکرار سے بھی بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے خصوصاً جبکہ تکرار اسی غرض سے ہو تاکہ عمل سہل ہو جائے اور یہ غرض گو بالذات مقصود نہیں بلکہ غرض اول اصل ہے مگر چونکہ اس بجیل کو اتفاق دشوار تھا اس لئے دوسری غرض کو تسہیل کے لئے بیان فرما دیا اسی طرح ایک حدیث میں ہے یا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فانه اغص للبصر واحسن للفرج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فانه له وجاء متفق علیہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ایک غرض بیان فرمادی کہ اس سے عفت فرج و حفاظت نگاہ سہل ہو جاتی ہے۔ اصل مطلوب تو تخصیص فرج و غرض بصر ہے جو کہ بدون نکاح بھی قدرت اختیار میں ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا بھی امر فرمادیا کیونکہ وہ اس مطلوب کی تسہیل کا وسیلہ ہے اسی لئے اغض و احسن صیغہ تفضیل سے فرمایا یعنی یہ غرض و تخصیص میں زیادہ معین ہے اور اسی لئے نکاح کو غرض بصر و احسن فرج کی غایت تسہیل کہا ہے کیونکہ نگاہ و شرمگاہ کی حفاظت بدون نکاح کے بھی ممکن ہے کیونکہ نگاہ کا اٹھانا امر اختیاری ہے کوئی دوسرا تو سر نہیں اٹھا دیتا اور یہ امر مشاہد ہے لیکن اس شخص کو اس میں دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نظر میں مضطر ہوں اور دھوکا اضطراب کا اس لئے ہوتا ہے کہ آجکل لوگ عموماً نگاہ پینچی رکھنے کے عادی نہیں۔ اونٹ کی طرح سر اٹھا کر ہی چلنے کے عادی ہیں اس لئے نگاہ میں اپنے کو مضطر سمجھتے ہیں پھر نگاہ ڈال کر ہٹانے میں اس کو نفس کی ساتھ کشاکشی سخت ہوتی ہے جس کی مقاومت دشوار ہوتی ہے اس دشواری کو وہ اضطراب سمجھنے لگتا ہے حالانکہ وہ اضطراب نہیں ہے کیونکہ وہ اس حالت میں بھی غرض بصر پر قادر رہتا ہے پس وہ مختار ہے اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ جس اضطراب میں میتہ حلال ہو جاتا ہے اضطراب تو وہ بھی نہیں کیونکہ عدم تناول پھر بھی اختیار میں رہتا ہے پھر بھی سخت تکلیف کو شریعت نے اضطراب قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فمن اضطرب فی محنۃ تو معلوم ہو کہ سخت تکلیف بھی اضطراب میں داخل ہے تو غرض بصر میں بھی جب سخت بے چینی ہونے لگے وہ اضطراب کیوں نہیں اور اگر



اضطرار ہے تو وہ شخص معذور ہے تو میں کہوں گا کہ آیت میں اضطرار اصطلاحی کا ذکر نہیں بلکہ اضطرار لغوی کا ذکر ہے اور یہ اضطرار لغوی اکل میتہ میں عذر ہے اور نظر بالشہوۃ میں عذر نہیں اگر کوئی کہے کہ اس فرق کا کیا سبب اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی قسمت خدا کی یہی مرضی یہ جواب تو ضابطہ کا تھا اب میں تبرعاً دونوں میں فرق بھی بتلاتا ہوں کہ اختصار محققہ میں موت کا اندیشہ ہے اور حیات کا بقا مطلوب ہے کیونکہ وہ معراج ترقی ہے حیات ناسوتیہ ہی سے روح کو ترقی ہوتی ہے کیونکہ مدار ترقی اعمال ہیں اور روح مجرد و سوسودہ بعض اعمال کا نہیں ہو سکتا تھا اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو پھر جنت سے دنیا میں ہمارے بھیجے جانے کی کیا ضرورت تھی اور نظری الا جنبیہ سے بچنے میں موت کا خوف نہیں بلکہ غضب بصر میں زیادہ حیات ہے۔ حدیث میں وعدہ ہے کہ جو شخص تقاضائے نظر کے وقت نگاہ سچی کر لے اس کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی ہے۔

اور اس کی ساتھ ایک طبعی حلاوت بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ جب غضب بصر کے بعد اس کا دل یہ کہتا ہے کہ شاباش آج شیطان کو خوب زیر کیا اور یہ فخر اہل اللہ نے بھی کیا ہے مگر اشترو بغر کی ساتھ نہیں بلکہ تحدت بالنعمة کے طور پر اور اس قسم کا فرح محمود ہے چنانچہ نص ہے قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا۔ غضب بصر میں پلنی حیات بھی ہے اور حیات ظاہرہ کا ابقا بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ یہ نگاہ بد جان و ایمان تک لے لیتی ہے ابن القیم نے ایک قصہ لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی امر پر عاشق تھا اور وہ اس سے نفور یہاں تک کہ یہ عشق میں گھل کر مرنے کے قریب ہو گیا اور آثار نزع شروع ہو گئے اس امر کو اطلاع ہوئی تو اس کے دل میں رحم آیا کہ لاؤ ایک دفعہ اس سے مل لوں اب تو مر ہی رہا ہے وہ اس ارادہ سے گھر سے چلا اور اس کی اطلاع کسی نے عاشق کو کی تو فوراً جسم میں قوت آگئی اور اٹھ بیٹھا پھر امر کو اپنی بدنامی کا خیال ہوا اور راستہ ہی سے لوٹ گیا اور مومن کے قول پر عمل پیرا ہوا۔

کہا اس بت سے مرتا ہے وہ مومن کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی اس امر نے اس وقت اسی شعر پر عمل کیا اس کی اطلاع بھی عاشق کو ہوئی تو

پھر گر پڑا اور نزع شروع ہو گیا۔ لوگوں نے اس کو کلمہ کی تلقین شروع کی تو بجائے کلمہ کے اس نے امر کو خطاب کر کے اشعار پڑھنا شروع کئے جس میں ایک شعر یہ تھا

رضاك اشھى الى فؤادى من رحمة الخالق الجليل

اے معشوق تیری رضا مجھے زیادہ محبوب ہے حق تعالیٰ کی رحمت کے نعوذ باللہ تعالیٰ

نعوذ باللہ نعوذ باللہ اور اسی کلمہ کفر پر جان دیدی۔ اور خطرہ نظر عد میں ہے اور وہی حرام بھی ہے باقی اور نظر قجاریہ میں یہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ فوراً غص بصر کرنے سے وہ اثر قوی نہیں ہونے پاتا اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ ممکن ہے اس میں بھی ملاکت ہو جائے تو میں کہوں گا کہ یہ امکان ایسا ہے جیسا امام ابو یوسفؒ کے شاگرد نے مجلس امانی میں سوال کیا تھا کہ آپ نے ابھی جو یہ فرمایا ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ افطار کر لینا چاہیے تو بھلا اگر کسی دن آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کرے اور وجہ فرق کی یہی ہے کہ نظر قجاریہ میں بوجہ عدم الغتات کے و قائق حسن کا ادراک نہیں ہوتا یوں ہی سرسری طور پر صورت سامنے ہو جاتی ہے اب اس کو حکم ہے صرف نظر کا اگر فوراً نگاہ کو ہٹالے تو کچھ خطرہ نہیں اور اگر اس کے بعد عمداً دیکھنے لگا تو اب اس کو اس کی ساتھ تعلق ہو جائے گا جتنا ہے اور تعلق کے بعد اگر وصال نہ ہو تو موت کا خطرہ ہے اور ایک دو بار وصال ہو گیا تو اس سے پیاس بجھے گی نہیں بلکہ زیادہ بھڑکے گی۔

کنار و بوس سے دوتا ہوا عشق مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور اگر کسی کو ہمیشہ وصال میر ہو سکتا ہے تو اس کبخت کو زکاح سے کون چیز مانع ہے ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے لہذا للمتحابین مثل النکاح یعنی جن میں باہم محبت ہو جائے ان کو زکاح کر لینا چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر اس کا علاج نظر و وصال سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی طرف سے خیال کو ہٹاؤ۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی بد صورت بد شکل کا مراقبہ کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو دیکھو میں اس کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں مراقبہ موت و رویت تو سب بتلاتے ہیں میں بد شکل کافر کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں کیونکہ طب میں کبھی طبیبات سے علاج ہوتا ہے کبھی خبیثات سے (اور اگر کوئی شکل قابل نفرت مراقبہ

کے لئے نہ ملے تو پھر اس مجبوب ہی کو بد شکل تصور کر و یعنی یوں خیال کرو کہ یہ ایک دن مرے گا اور اس کا چہرہ خاک میں مل جائے گا اس میں سے خون پیپ ناک اور آنکھ کے راستہ سے بہے گا اس کے بدن میں کپڑے پڑ جائیں گے تھوڑی دیر اس کی اس حالت کا مراقبہ کرو اس سے بھی نفع ہوگا، اور خیال ہٹانے کی یہ صورت نافع نہیں کہ تم براہ راست اس کے حسن کے تصور دفع کرنے کا قصد کرو کیونکہ اس میں پھر استحضار ہوگا حسن کا سلب بھی جلب ہو جائے گا میں نے مولانا سید احمد صاحب دہلوی سے ایک حکایت اسی قبیل کی سنی ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی شادی میں دولہا کے لئے کسی کا دوشالہ مانگ کر مجلس نکاح میں اوڑھا دیا وہ اوچھا آدمی تھا اس نے دوشالہ تو دیدیا مگر اب جو شخص مجلس میں سے آکر پوچھتا کہ دولہا کہاں ہے وہ کہتا ہے کہ دولہا تو وہ ہے مگر دوشالہ میرا ہے لڑکے کے باپ نے کہا تو بڑا اوچھا آدمی ہے بھلا اس کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ دوشالہ میرا ہے اس نے کہا کہ بہت اچھا اب نہ کہوں گا۔ اس کے بعد کسی نے پوچھا کہ دولہا کونسا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ میرا نہیں ہے۔ بارات والوں نے پھر ملاّت کی کہ کنبخت تجھے دوشالہ کے ذکر ہی کی کیا ضرورت ہے اس نے کہا بہت اچھا اب سے ذکر نہ کروں گا اس کے بعد کسی نے پوچھا تو کہا کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ کا ذکر ہی نہیں کہ کس کا ہے اس پر دولہا نے دوشالہ اتار کر پھینک دیا تو دیکھئے اس نے دوشالہ کی نفی کی تھی مگر وہ بھی اثبات تھا اسی طرح مجبوب کے تصور کو بلا واسطہ دفع کرتا یہ بھی جلب تصور ہے بلکہ اس کا صحیح قاعدہ وہ ہے جس کو فلاسفہ اور صوفیہ نے بیان کیا ہے النفس لا تتوجه الی

شیئین فی ان واحد کہ ایک آن میں دو چیزوں کی طرف نفس متوجہ نہیں ہو سکتا اور گو اس کو قاعدہ عقلیہ کہا جاتا ہے مگر میرے نزدیک یہ بھی قاعدہ عقلیہ نہیں بلکہ قاعدہ عادیہ ہے مگر عادۃً اس میں لزوم ایسا ہے جس سے لزوم عقلی کا شبہ ہو جاتا ہے اور اس قاعدہ کے استعمال کا طریقہ وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی دوسری شے کی طرف توجہ کو منوط کر و کیونکہ عشق بطالت سے ہوتا ہے اطباء نے اس کی تصریح کی ہے اسی لئے طلبہ کو عشق زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ بہت بے فکر ہیں (پہلے زمانہ کے طلبہ ایسے بے فکر تھے اس لئے ان میں مرض نہ تھا اور

آج کل بے فکری زیادہ ہے، کیونکہ جو کام ان کے ذمہ ہے مطالعہ و تکرار وغیرہ اختیاری ہے کہ جب چاہیں الگ کر دیں اور بے فکر ہو جاویں باقی جو شخص کسی فکر میں لگا ہوا ہو اس کو عشق نہیں ہوتا چنانچہ گھس کھدے مزدور کو تصور حینان کی کہاں مہلت ہے پس تم بطلالت و بے فکری کو دور کرو اور کوئی شغل اپنے ذمے لگاؤ اور کسی شے کی طرف اپنی توجہ کو منعطف کرو حدیث میں اسی علاج کی تعلیم ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اجنبیہ پر نظر پڑ جائے تو اسی وقت اپنی بیوی سے جا کر مشغول ہو جاؤ۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فان الذی معہا مثل الذی معہا رکہ جو چیز اس کے پاس ہے ویسی اس کے پاس ہے، ظاہر میں یہ جملہ معمولی بات ہے مگر حقیقت میں یہ ایک قاعدہ عظیمہ پر تنبیہ ہے جس کی تقریر حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے فرمائی ہے جو کسی کے کلام میں میری نظر سے نہیں گزری اس کو بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو ہماری اکابر کے کمال علوم کا اندازہ ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ تناولات میں چار قسم کی چیزیں ہیں بعض میں محض لذت مقصود ہے جیسے نوا کہ بعض میں دفع حاجت مقصود ہے بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب حاجت ہے جیسے اغذیہ یومیہ بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب لذت ہے اور عادۃً قرب نساء ایسی ہی چیز ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ میں ہم کو اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ تم اس میں کبھی حاجت ہی کو غالب رکھو اور دفع حاجت میں اجنبیہ اور متکوحہ دونوں مساوی ہیں یہ مطلب ہے ان الذی معہا مثل الذی معہا (لے انہما مساویان فی قضاء الحاجۃ) سبحان اللہ بے نظیر علم ہے۔ بہر حال شارع نے اس حدیث معشر الشباب تو وجوا الیہ میں نکاح کی ترغیب اس لئے دی ہے تاکہ غضب بصر سہل ہو جاوے اور یہ شارع کے ذمہ نہ تھا بلکہ محض عنایت تسہیل کی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ جس کو غضب بصر دشوار ہو وہ نکاح کر لے گو شارع کو یہ بھی حق تھا کہ بدون اس کے بھی غضب بصر کا امر فرماویں کیونکہ نظر اختیاری ہے جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا اور اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شارع بھی تسہیل کا لحاظ فرماتے ہیں پس صوفیہ اہل بدعت نہیں جو اعمال شرعیہ میں سہولت کا طریق بتلاتے ہیں اور اسی میں مشائخ علماء ظاہر سے ممتاز ہیں کیونکہ علماء اس کو نہیں جانتے پس صوفیہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی کہ اعمال شرعیہ کی تسہیل کے طرق

بتلاتے ہیں۔ میں نے بتلا دیا کہ شارع نے بھی کبھی اس کا لحاظ فرمایا ہے۔ چنانچہ اول تو شارع نے تہییل غرض بصر کے لئے نکاح کو تجویز کیا اور جو نکاح پر قادر نہ ہو اس کے لئے اسی تہییل کے لئے ارشاد ہے ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ له وجاء کہ جو نکاح نہ کر سکے وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ بمنزلہ اختصار کے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ اختصار کے بعد بھی بعض دفعہ شہوت کم نہیں ہوتی چنانچہ تجربہ ہے کہ ایسے لوگ باندیاں خریدتے ہیں اور ان سے مجامعت کرتے ہیں ہاں ان کو انزال نہیں ہوتا اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع عضو کے بعد بھی شہوت باقی رہتی ہے ایسا مرد مساحقہ کا طالب ہوتا ہے ایک بزرگ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت باقی رہتی ہے۔ وہ حکایت یہ ہے۔ ایک شخص کو خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تمنا یہ تھی چنانچہ ایک بار ملاقات ہوئی اور حضرت خضر نے دریافت فرمایا کہ بتلاؤ مجھ سے کیا کام ہے کہا میرے لئے دعا کر دیجئے کہ بے فکری کی زندگی نصیب ہو۔ فرمایا دنیا میں بے فکری دشوار ہے کیونکہ یہ دار ابتلا ہے یہاں چین نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ تم دنیا میں مختلف لوگوں کی حالت دیکھ کر کسی ایک کو تجویز کر لو میں دعا کروں گا کہ تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ اس نے کہا بہت اچھا یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی تو بے فکر ملے گا۔ چنانچہ اس نے سیاحت شروع کی اور امرار و سلاطین کا امتحان شروع کیا معلوم ہوا کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی فکر ضرور ہے بے فکر کوئی نہیں۔ پھر ایک چہری کو دیکھا کہ وہ بڑا بے فکر ہے صبح کو دکان کھولتا ہے دس بارہ لڑکے جوان اس کے پاس دکان میں رہتے ہیں جو اس کے بیٹے معلوم ہوتے تھے اور نوکر چاکران کے علاوہ تھے۔ وہ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھتا اور خوب خیرات کرتا اور تجارت بھی کرتا ظاہر میں اس کو کوئی فکر معلوم نہ ہوتا تھا یہ اس کے پاس تین دن ٹھہرا اور اس کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا کہ بس میں بھی اسی کے مثل ہونے کی دعا کراؤں گا پھر خیال ہوا کہ اس سے بھی دریافت تو کرنا چاہیے مبادا اس کو کوئی ایسا فکر ہو جس کی مجھے اطلاع نہ ہو چنانچہ اس سے دریافت کیا اور وجہ بھی بتلا دی کہ میں نے حضرت خضر سے درخواست کی تھی انہوں نے یہ جواب دیا اور اب تجھ کو دیکھ کر مجھے خیال ہوتا ہے کہ تیری جیسی زندگی کی دعا کراؤں یہ سن کر وہ جوہری سانس بھر کر آبدیدہ ہوا اور کہا خدا

میری جیسی مصیبت تو کسی دشمن کو بھی نہ دے پھر قصہ بیان کیا کہ میری بیوی بہت حسین ہے ایک دفعہ وہ بیمار ہوئی اور مرنے کے قریب ہو گئی میں رونے لگا تو اس نے کہا کیوں روتے ہو تم تو چار دن کے بعد دوسرا نکاح کر لو گے پھر مجھے بھول بھال جاؤ گے میں نے کہا یہ ہرگز مجھ سے نہ ہوگا کہا سیتے ہی کہا کرتے ہیں تو میں آستہ نہ نکال کر اپنا عضو کا ڈالا لکھتے اطمینان ہو گیا اس نے کہا ہاں واقعی اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کجخت اچھی ہو گئی۔ درمیان میں بیکار ہو چکا تھا تو اس نے نوکروں سے تعلق پیدا کر لیا اور یہ جتنے لڑکے آپ کے سامنے ہیں سب انہی نوکروں کی عنایت ہیں مگر میں غاموش ہوں کیا کہوں کیونکہ یہ بلا میں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہے اب شخص اپنے گھر واپس آیا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پوچھا کہ تم نے کسی کو تجویز کیا کہا واقعی دنیا میں کوئی بھی فکر سے قالی نہیں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا بس تم یہ خیال چھوڑ دو اور اس کی درخواست کرو کہ حق تعالیٰ تم کو اپنی محبت عطا فرمائیں اور آخرت کی بیفکری نصیب ہو کہا ہاں بس اسی کی دعا کر دیجئے واقعی یہی بات ہے پھر اگر کچھ بیفکری ہے تو تعلق مع اللہ ہی میں ہے مولانا فرماتے ہیں ۷

پہنچ کنبے لے دو د بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست  
 رکونی گوشہ بغیر پریشانی اور جال کے نہیں مگر ہاں تنہائی میں حق تعالیٰ کی یاد ہی چین آرام ہے  
 خلوت گاہ حق سے مراد تعلق مع اللہ ہی ہے تو اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو اپنی حالت پر حسرت تھی اس حسرت میں خواہش کو بھی دخل تھا کہ تمتع کی خواہش موجود مگر فقدان اسباب و آلات سے معذور اس لئے غمزدہ تھا اور روزہ ان سب سے بڑھ کر ہے کہ شہوت بھی کم ہو جاتی ہے اور انسان بھی بیکار نہیں ہوتا۔ مگر ایک بات سمجھ لیتا چاہیے کہ بعض دفعہ روزہ سے ابتداء صوم میں شہوت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے اس کے دھوکہ نہ کھایا جائے کہ شریعت نے یہ کیسا علاج تجویز کیا بات یہ ہے کہ بعض دفعہ قلت شہوت کا منشا کثافت اخلاط ہوتا ہے ایسی حالت میں چونکہ روزہ سے اخلاط میں لطافت پیدا ہوگی تو اول اول شہوت بڑھے گی مگر یہ برابر روزہ رکھتا ہے تو کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ قلت شہوت کا منشا کبھی کثافت اخلاط ہوتا ہے اس کو میں بہت دعو کی کھتا کہتا ہوں

اور بیاتنگ دہل کہتا ہوں کہ جس پر شہوت کا زیادہ غلبہ ہو وہ اس وقت خوب پریٹ تنکر کھانا کھالے تو شہوت افسردہ ہو جائے گی مگر شارع نے یہ علاج اس لئے تجویز نہیں کیا کہ اس سے لحوق امراض کا اندیشہ ہے بہر حال کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہے گوا بتداء میں ضعف کا احساس نہ ہو چنانچہ اخیر حصہ رمضان میں ہر شخص کو ضعف معلوم ہوتا ہے گوا فطار و سحر میں اس نے کتنا ہی پریٹ بھر کر کھایا ہو کیونکہ میرے نزدیک سبب ضعف تبدیل وقت ہے، تقلیل غذا سے ضعف نہیں ہوتا پس جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح صوم تقلیل غذا ہے جب افطار و سحر میں خوب پریٹ بھر کر کھالیا تو اس روزہ سے فائدہ ہی کیا ہوا ان کا قول میرے نزدیک صحیح نہیں بلکہ صرف تبدیل وقت ہی ضعف بہمیت کے لئے کافی ہے۔ غرض یہ حدیث صاف بتلا رہی ہے کہ شارع نے جس طرح تحصیل اعمال کا اہتمام کیا ہے اسی طرح تسہیل اعمال کا بھی کہیں کہیں لحاظ فرمایا ہے چنانچہ یہ حدیث تو رعایت تسہیل میں صریح تھی اب آیت میں غور کیجئے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے اول ایک غایت تحصیل عمل کے لئے بیان فرمائی اس کے بعد دوسری غایت تحصیل عمل کے لئے ذکر فرمائی کہ تکرار انفاق سے انفاق سہل ہو جاتا ہے پس انفاق میں یہ غرض بھی ملحوظ رکھنا چاہئے اور یہ طریقہ تمام اعمال کی تسہیل میں مفید ہے تکرار عمل سے ہر عمل سہل ہو جاتا ہے جیسا اوپر بھی مذکور ہو چکا ہے مگر طریق تسہیل کا بتلانا شارع کے ذمہ نہیں ہے وجہ ہے کہ تمام احکام میں اس کی رعایت نہیں کی گئی اور ہر عمل کی سہولت کا طریقہ شارع ذہنیں بتلایا نیز علماء کے ذمہ بھی طرق سہولت بتلانا لازم نہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ علماء کے ذمہ یہ بھی نہیں کہ سائل کے جواب میں ایسی تقریر کریں کہ مخاطب کی سمجھ ہی میں آجائے جبکہ وہ مسئلہ ان کے فہم سے عالی ہو ہاں مسئلہ کی تقریر کر دینا جبکہ وہ ضروری سمجھیں ان کے ذمہ ہے خواہ مخاطب سمجھے یا نہ سمجھے اور اگر مخاطب سے فہم کی امید نہ ہو تو علماء کے ذمہ تقریر کرنا بھی لازم نہیں ان کو یہ کہہ دینے کا حق ہے کہ تم اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ راپور میں ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ معراج کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا مجھے اس پر کچھ اشکالات ہیں میں نے کہا بیان کیجئے کہا یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان زمین سے آسمان پر پہنچ جائے کیونکہ درمیان میں کرہ زہریر ہے کرہ نار ہے۔ نیز حکما کا

لہ جن مقام پر حدیث یا معشر الشیاء ذکر شروع ہوا ہے اس مقام سے ذرا پہلے اس کا بیان آیا ہے ۱۲ منہ

قول ہے کہ چند میل اوپر ہوا نہیں ہے وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ سانس کیلئے ہوا کی ضرورت ہے پھر معراج کیونکر ہوئی میں نے کہا بدون تنفس کے زندہ رہنا محال ہے یا مستبعد ہے اسی طرح زمہریر و نار میں زندہ رہنا محال یا مستبعد ہے گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت محال و مستبعد میں فرق ہی نہ سمجھتے تھے میں نے ان دونوں میں فرق ظاہر کیا اور کہا اب آپ کے اشکالات کا حاصل یہ ہوا کہ معراج کا واقعہ مستبعد ہے سو اس سے ہم کو انکار نہیں معجزات مستبعد تو ہوتے ہی ہیں ورنہ معجزہ ہی کیوں کہا جاوے لیکن محال ہرگز نہیں کیونکہ اس میں عقلی استحالہ کچھ نہیں وہ کہنے لگے کہ یہ دقائق میں نہیں سمجھتا مجھے اس کی کوئی نظیر مشاہدات میں بتلائے میں نے کہا کہ نظیر پر ثبوت دعویٰ موقوف نہیں ہوتا کیونکہ نظیر بھی تو ایک واقعہ ہے اگر ہر واقعہ کو دوسرے واقعہ کے واسطے مانا جائیگا تو یا تو تسلسل لازم آئیگا اور وہ محال ہے یا کہیں سلسلہ کو قطع کر دے تو یہ آخیر کا واقعہ بدون نظیر کے مانا گیا پھر واقعہ معراج ہی کو اولاد و نظیر کے کیوں نہیں مانا جاتا مگر وہ پھر بھی وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتے رہے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا میں اتنی کسر رہ گئی کہ میں آپ کے سامنے آسمان پر اڑوں کہ دیکھو معراج یوں ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تنفس کی ضرورت مکت طویل میں ہوتی ہے اور مکت طویل ہی سے حر و برد کا اثر بھی لازم آتا ہے سرعت سیر میں نہ تنفس کی ضرورت ہے نہ مرورنی النار سے احتراق لازم آتا۔ ہے چنانچہ چراغ کی لو میں جلدی جلدی انگلی چلائی جائے تو آگ کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا پس اگر بان لیا جائے کہ اوپر ہوا نہیں ہے تو اس واقعہ معراج پر کیا اشکال ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طبقہ کو جو نہایت سرعت سے طے کیا ہے جس میں آپ کو تنفس کی ضرورت ہی نہیں ہوئی اور ضرورت ہوئی بھی تو پندرہ بیس منٹ حبس دم کرنے سے ہلاکت نہیں ہوتی اور اسی سرعت کی وجہ سے آپ کے جسم پر نار و زمہریر کا اثر نہیں ہوا مجھے یہ جواب پستد آیا اور خیال ہوا کہ اس وقت یہ بات معلوم ہو جاتی تو سائل کی تسلی ہو جاتی مگر مجھے زیادہ خیال نہیں ہوا کیونکہ تسلی کرنا ہمارے ذمہ نہیں ہے۔ علیگڑھ میں ایک پروفیسر میرے پاس آئے جو علوم عربیہ کے استاد وہاں مشہور تھے۔ انھوں نے ایک حدیث حاکم کا متن پرٹھا و لا ظہرت الفاحشة



فی قوم الاسلط علیہم الموت یعنی وبا اور طاعون کثرت ترنا سے ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا طاعون و زنا میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ کہا ارتباط نہیں سمجھ میں آیا میں نے کہا پھر اس کے نہ سمجھنے سے ضرر ہی کیا ہوا کہنے لگے ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے سے نفع ہوتا۔ میں نے کہا وہ نفع کیا ہے کہنے لگے اطمینان میں نے کہا اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل کہا اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کو طلب نہ فرماتے۔ میں نے کہا کہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیم کے لئے نافع ہو وہ آپ کے لئے بھی نافع ہو۔ بس وہ اس پر خاموش ہو گئے۔ میں نے اس کے بعد ان سے کہا کہ مولانا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملائوں کو اس کا ارتباط معلوم نہیں۔ الحمد للہ کہ ہم کو بعض اسرار کا علم بھی بزرگوں کے طفیل سے حاصل ہے مگر ہم بتلانا مصلحت نہیں سمجھتے اور میں نے یہ شعر پڑھا۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں قدر از درہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست  
 (اہل اللہ اسرار شریعت کو ظاہر کرنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں ورنہ یہ بتا نہیں ہے کہ ان حضرات کو اسرار کا علم نہیں ہے) ہمیں خبر ہے مگر آپ کو نہیں بتلاتے کیونکہ اسرار کا بتلانا ہمارا ذمہ نہیں صرف احکام کا بتلانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر میں نے احباب کے جلسہ خاص میں اس ارتباط کی تقریر کر دی۔ غرض اسی طرح طرق تسہیل کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں بلکہ مشائخ کے بھی ذمہ نہیں گو مشائخ مشائخ بنے اسی سے ہیں مگر وہ فن تسہیل سے واقف ہیں مگر یہ ان کے ذمہ نہیں محض ان کی عنایت و رحمت کے مخلوق پر کہ وہ طرق تسہیل بتلا دیتے ہیں اور وہ بھی اس طریق کو اس شخص کے لئے استعمال کرتے ہیں جو تحصیل میں ساعی ہو اور جو شخص تحصیل اعمال میں کوتاہی کر کے تسہیل کا طالب ہو وہ اس کی ساتھ تسہیل کا معاملہ نہیں کرتے بلکہ تکلیف کا معاملہ کرتے ہیں (یہاں پہنچ کر اذان عصر ہو گئی تو فرمایا کہ بس میں اب ختم ہی کرتے والا ہوں یہ فرما کر خاموش ہو گئے اور اذان کے بعد فرمایا کہ) اب میں مقصود کی توضیح کر کے چند باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کر کے ختم کرتا ہوں میرا مقصود اس آیت کی تلاوت سے یہ تھا کہ شارع نے اہل میں ہم کو اعمال اختیار یہ کی تحصیل کا مکلف کیا ہے اور شارع کے ذمہ تسہیل کی رعایت نہیں مگر محض عنایت کی وجہ سے بعض دفعہ تسہیل کی بھی رعایت فرمالتے ہیں۔

جیسا کہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ پس سالکین کی یہ بڑی غلطی ہے کہ وہ سہولت کے طالب ہیں اور طلبِ تحصیل میں کوتاہی کرتے ہیں اس میں مقصود بالذات کوتاہی اور مقصود بالعرض کو اصل قرار دینا ہے نیز صفت اختیار کا ابطال ہے جو امانت الہیہ ہے۔ اب میں مختصراً تشبیہ کے متعلق جو اس آیت میں مذکور ہے کچھ عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ نے یہاں نفقات کو جنات سے تشبیہ دی ہے وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح باغ میں پھل کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح نفقات میں زیادت ہوتی ہے اور وابل سے اخلاص کی تشبیہ مقصود ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ اوپر دیا ہے فی الانفاق کی مذمت ہے کالذی یتفق مالہ ریاء الناس ولا یؤمن بالله والیوم الآخر الا یہ اس کے بعد انفاق کی فضیلت بیان فرمائی گئی اور جب وابل سے مراد اخلاص ہے اور اس کے مقابلہ میں طل مذکور ہے اور وابل کہتے ہیں موسلا دھار بارش کو طل کہتے ہیں پھوار کو تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وابل سے اخلاص کامل مراد ہے اور طل سے اخلاص قلیل مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر اخلاص کامل ہو تو نفقات میں ترقی زیادہ ہوگی اور اگر اخلاص قلیل ہو تو وہ بھی ترقی کے لئے کافی ہے گو زیادہ ترقی نہ ہو اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے بلکہ اس سے وہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل ہی کا مطلوب ہوتا ان کے ذہن نشین ہو جائے تو ان سے کوئی غل نہ ہو سکے گا کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہو سکتا جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے سامنے ایک جنازہ کی نماز شروع ہوئی اور وہ شریک نہ ہوئے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی فرمایا کہ میں نیت کی تصحیح میں مشغول رہا یہی سوچتا رہا کہ اس وقت اس میت کی نماز پڑھنے میں کیا نیت ہے کیونکہ نماز جنازہ میں مختلف نیلتیں ہوتی ہیں کبھی اعزاء و اقربا کی خاطر سے پڑھی جاتی ہے کبھی میت کی وجاہت کا اثر ہوتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ میت محلہ دار ہے اگر نماز نہ پڑھیں گے تو اہل محلہ ملامت کریں گے یہی وجہ ہے کہ رئیس یا عالم کو جنازہ کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے غریبوں کو جنازہ کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا اگر اخلاص منشا ہوتا تو یہ فرق کیوں ہوتا۔ اسی طرح حافظ اگر تراویح میں سوچتا رہے کہ میں تراویح میں جو بنا سزا کر قرآن پڑھ رہا ہوں اس میں کیا نیت ہے کیونکہ تنہا نماز پڑھتے ہوئے ایسا اہتمام نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ تراویح ہرگز نہ پڑھا سکے گا

پس اس وہم کا علاج کر دیا گیا کہ تم کس وہم میں پڑے ہمارے یہاں اخلاص قلیل بھی کافی ہے بس تم اپنی طرف سے برا قصد نہ کرو اس کے بعد بیٹھ کر ہو کر کام میں لگو اور اخلاص کامل کے لئے سعی کرتے رہو اسی طرح سے ایک دن اخلاص کامل بھی میسر ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی دن اخلاص کامل پر عمل کو مو قوت رکھا تو تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا یہ مطلب ہے فان لم یصبہا و ابل فطل کا کہ ابتدا میں اخلاص قلیل ہی کو کافی سمجھو اور عمل شروع کر دو یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل ہی مطلوب ہے بلکہ مطلوب تو اخلاص کامل ہے مگر اس کے حصول کا طریقہ یہی ہے کہ اول قلیل ہی سے عمل شروع کر دو ظل پر مجھے ایک لطیفہ ہارون رشید کی باندی کا یاد آ گیا گو مضمون سے اس کو تعلق نہیں مگر لفظ ظل سے تعلق ہے۔ ہارون رشید نے اپنی ایک جا رہ کو کسی غلام سے ہنستے بولتے دیکھ لیا جس کا نام تھا ظل (غلام لونڈیوں کے ایسے ہی نام ہمارے عرف میں رکھتے ہیں جیسے بہار وغیرہ) ہارون رشید نے اس جا رہ کو ڈانٹا اور کہا خبردار جو کبھی اس سے بات کی بلکہ کبھی زبان سے اس کا نام بھی مت لینا ایک بار وہ لونڈی قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی یہی آیت آئی اس کو معلوم ہوا کہ امیر المومنین ایسے موقع پر موجود ہیں جہاں اس کی آواز جا رہی تھی تو اس نے کیا مزہ کیا کہ آیت کو اس طرح پڑھا فان لم یصبہا و ابل فالذی نہانی عند امیر المومنین امیر المومنین ہنسنے لگے اور خطا معاف کر دی اور نام لینے کی اجازت دیدی پس اصل مقصود تو اخلاص کامل ہے اور اسی کا امر ہے وہی مطلوب ہے اور اس سے تکمیل عمل کی مقصودیت پر دلالت ہو گئی مگر چونکہ اس میں بعض وہمیوں کو غلو ہو جاتا ہے اس لئے فطل میں اس کی تعدیل کر دی گئی گویا قاصداً لہا و ابل میں تکمیل کی تعلیم تھی اور فطل میں تعدیل کر دی گئی تو اس آیت میں چار چیزیں مذکور ہوئیں تحصیل، تسہیل، تکمیل، تعدیل اور اسی مناسبت سے میں اس بیان کا نام التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل تجویز کرتا ہوں اور اس مضمون کو خاص رمضان سے یہ تعلق ہے کہ طاعات رمضان کو بھی مثل تکرار انفاق کے تسہیل اعمال میں بڑا دخل ہے یعنی رمضان میں یہ خاصیت ہے کہ اس ماہ میں جن طاعات پر مداومت کر لے سکا بھران پر مداومت تسہیل رہتی ہے اور جن گناہوں سے بچنے کا اہتمام کر لے سال بھران سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ ابن حبان نے ایک حدیث مرفوعہ روایت کی ہے من سلمہ الجمعة سلم لہ ما بینہ و بین الجمعة الاخری ومن سلمہ رمضان سلم لہ السنة کلھا و قلت اخرجہ

السیوطی فی الجامع الصغیر و اعزاه الی المدار قطنی و ابن عدی و احمد عن عائشة بلفظ اذا سلمت  
 الجمعة سلمت الايام و اذا سلم رمضان سلمت السنة و قال العزیزی و هو حدیث ضعف (۱۳۵)  
 رہا یہ کہ رمضان میں یہ خاصیت یا کیفیت ہے یا بالخاصہ ہے دونوں احتمال ہیں اگر بالخاصہ ہے  
 تو تب تو وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور بالکیفیت ہے تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ مہینہ بھر کسی عمل  
 سے رکنے میں اس سے اجتناب کی عادت ہو جاتی ہے اب سال بھر اس سے بچنا سہل ہو جاتا ہے  
 اسی طرح کسی عمل کے کرنے میں بھی ایسا ہی سمجھو مگر سہولت کے معنی یہ ہیں کہ اگر اب اس عادت کے کام لو تو  
 سہولت ہو جائے گی یہ معنی نہیں کہ عادت سے کام لینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی جیسے کسی شخص کی آنکھیں  
 بنائی گئیں اور ان میں روشنی آگئی تو آنکھ کے درست ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اس سے کام  
 لے گا آنکھیں کھولے گا تو نظر آئے گا اگر کوئی احمق یہ کہے کہ میں تو آنکھ نہ کھولوں گا کھولنے سے نظر آیا تو  
 فائدہ ہی کیا ہو آنکھ بننے کے تو یہ معنی ہیں کہ بدون کھولنے بھی نظر آئے تو ایسی تلمیحی اس احمق  
 کی پس یہ مطلب نہیں کہ رمضان لاٹھی لے کر تم کو گناہوں سے روکے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ...  
 اس کی ایسی برکت ہے کہ اس میں گناہوں کو اہتمام سے چھوڑ کر بعد میں اس برکت  
 سے کام لیتا چاہو تو گناہوں کا چھوڑنا آسان ہوگا ورنہ پھر یہ عالم ابتلا ہی کیا ہوا اگر حیرانم سے  
 گناہ چھوڑا دیئے جائیں۔ پس اب بقیہ رمضان میں اہتمام کے ساتھ گناہوں سے بچو خصوصاً گناہ  
 بد اور غیبت سے اور اعمال صالحہ کا اہتمام کرو تلاوت قرآن و نماز و ذکر میں مشغول رہو اور دوسرے  
 دنوں سے آجکل کچھ کام بڑھا دو اور ایک عمل جس کو رمضان سے خصوصیت ہے ابھی باقی ہے یعنی  
 شب قدر کی تلاش کرنا اس کا بھی خاص اہتمام کرو ابھی کچھ لیا لی قدر باقی ہیں ان کو غنیمت  
 سمجھو دو راتیں تو گزر گئیں ہیں اگر ان میں اہتمام نہ کیا ہو تو بقیہ ہی کا اہتمام کر لو تاکہ فان لحد  
 یصبرھا و ابل قطل ہی کا مصداق ہو جائے اور کل رات میں نہ جاگ سکو تو زیادہ حصہ جاگ لو  
 یہ بھی نہ ہو سکے تو دوسری راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لو یہ بھی فان لحد یصبرھا و ابل قطل میں داخل  
 ہے غرض نہ سب راتیں ضروری ہیں نہ پوری رات ضروری ہے ہر صتنا ہو جائے غنیمت ہے اس سے  
 دریغ نہ کرو۔ مرا از زلف تو موئے بسندست، ہوس رارہ مدہ بوئے بسندست  
 مجھے اے محبوب آپ کے زلف ہی کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس کو راہ مت دو

زلف محبوب کی خوشبو ہی کافی ہے یہ شعر شیخ عبدالحق نے اس موقع پر لکھا ہے جہاں حدیث میں یہ قصہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج واداع میں حلق راس کے بعد اپنے موئے مبارک تقسیم فرمائے تھے شیخ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال دنیا میں موجود ہیں گو سند صحیح کے ساتھ ہم کو نہ ملیں مگر ہم کو یہ خبر ہی کافی ہے شیخ میں عشق کا غلبہ ہے اشعار محبت بڑے موقع سے ذکر کرتے ہیں چنانچہ اس حدیث کی شرح میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کے وقت کا واقعہ مذکور ہے کہ ایک دن صحابہ جماعت کی ساتھ نماز پڑھ رہے تھے حضرت صدیق اکبرؓ امام تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرہ کا پردہ اٹھا کر صحابہ کی جماعت کو دیکھا اور تبسم فرمایا صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم کو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک دیکھ کر ایسی حالت ہوئی کہ قریب تھے کہ نماز توڑ دیا شیخ اس وقت کو بیان کر کے یہ شعر لکھتے ہیں ۵

در نماز خم ابروئے توچوں یاد آمد      حالتی رقت کہ محراب یفریاد آمد

رناز میں جب آپ آپ کے ابرو کا خم یاد آتا ہے تو ایسی حالت ہوتی ہے کہ محراب بھی فریاد کیا،

خیر یہ تو استنظر ادا ذکر ہو گیا اصل مقصود پہلا شعر تھا کہ ۵

مرا از زلف تو موئے بسندست      ہوس رارہ بوئے بسندست

تو اگر ساری رات نہ جاگ سکو تو جتنا ہو سکے اور دنوں سے کچھ زیادہ شب قدر میں جاگ لو۔

ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے ۵

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہونچے وہاں      گر چہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

میں عالی ہمتوں کی ہمت کم نہیں کرتا بلکہ کم ہمتوں کی ہمت بڑھاتا ہوں کہ وہ زیادہ نہ کر سکیں تو قلیل ہی سے ذریعہ نہ کریں اور جو زیادہ کر سکتے ہیں وہ زیادہ میں کمی نہ کریں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمادیں اور عمل کی توفیق ہو۔ و صلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و علیہ و آلہ و اصحابہ

وبارك و سلم و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين ط

قابل مطالعہ کتب | معلم الحج - حج عمرہ و زیارت - تاریخ الخلفاء - بنیان المشید

فتائل و الاحکام مشہور و الایام - شرعی پردہ - ثبات التور - موقوفات کمالات اشرقیہ - شریعت اور طریقت

حیات اشرق - زاد السعید - مصیبت کے بعد راحت - ملنے کا      مکتبہ تھانوی - بندر روڈ - کراچی - ۱۱

عقد اتامل - وہابی کی پہچان - اعمال قرآنی طب روحانی پتہ      ۲۰

۱۵۰ ترجمہ گذشتہ صفحہ پر ہو چکا ہے۔

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

(رواه البخاری)

وصف مسہب

# المعرق والرحیق للمحرق والغریق

حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الايقا

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی  
ایم۔ اے جناح روڈ

وعظ مسمی بہ

## المعرق والرجیق للمحرق والغریق

ایم	م	م	م	م	م	الاشتات	
کہاں ہوا	کہاں ہوا	کہاں ہوا	کہاں ہوا	کہاں ہوا	کہاں ہوا	الاشتات	
کب ہوا	کب ہوا	کب ہوا	کب ہوا	کب ہوا	کب ہوا	متفرقات	
کس طرح ہوا	کس طرح ہوا	کس طرح ہوا	کس طرح ہوا	کس طرح ہوا	کس طرح ہوا		
کیوں ہوا	کیوں ہوا	کیوں ہوا	کیوں ہوا	کیوں ہوا	کیوں ہوا		
سبب خاتفاہ امداد یہ تھا: بکھیرا	۱۲ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ بروز شنبہ بوقت صبح	۱۳ گھنٹہ ۵۴ منٹ	موت پڑنے پر یہ بھی کہ	یہ حق اہل خاتفاہ کی درخواست پر	انسان پر وہ کیفیت طاری ہوا کرتی ہیں کبھی شوق کبھی سکون دونوں میں حکمتیں ہیں اپنے لئے کوئی خاص صورت جو نر نہ کرنا چاہیے۔ وصول دونوں سے ہو جاتا ہے اور جنت میں جو ابھی بہ کیفیت کے متاثر ہوگی۔	ساکین کو یا مخصوص اور سب مسلمانوں کو بالعموم احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ وکان لہ تقریباً ۵۰	الحمد للہ اس وعظ کی تسوید تفصیلی کا جلد ہی موقع آگیا اللہ تعالیٰ تسوید مواعظ کا اہتمام کر نیوالیکو جزائے خیر عطا فرماویں اس کی تسوید تفصیلی ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ یکشنبہ کو شروع ہو کر ۲ شعبان ۱۳۳۵ھ کو اختتام کو پہنچی۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله نحمدہ نستعینہ ونستغفرک ونؤمن بک ونفوضک علیہ ونعوذ باللہ من شرکنا وشرکنا  
من سیئات اعمالنا من ینہدنا اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشهد ان لا الہ الا اللہ  
وحدہ لا شریک لہ ونشهد ان سیدنا ومولانا محمداً عبداً ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ  
وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ان الابرار یشربون  
من کماؤس کان مزاجہا کافورہ عینا یشرب بها عباد اللہ یجرونہا تفریحاً یوفون بالتذر وینحافون

مہ مگر منابطے بعد ختم وعظ بھی ۵۰ منٹ تک کچھ باقی ماندہ مضامین نوٹ کئے لہذا وقت ضیض ۴ گھنٹہ ہے ۱۲ جامع

یوماً کان شرکاً مستطیراً ویطعمون الطعام علی حبه مسکیناً ویتیما و اسیراً ۵ انما نطعمکم  
 لوجه اللہ لانزید منکم جزاءً ولا شکوراً ۶ انا نخاف من ربنا یوماً عبوساً قمطیراً ۷ قوقحہ  
 اللہ شرذک الیوم ولقہم تضرۃ و سراً و راہ و جزا ہر بما صبروا جنتہ و حریراً متکئین فیہا  
 علی الاراعک ۸ کلابون فیہا شمساً ولا نزمہریراً ۹ ودانیۃ علیہم ظللہا و ذللت قوطفہا  
 تذلیللاً ۱۰ ویطاف علیہم بانیۃ من فضۃ و اکواب کانت قواریراً ۱۱ قواریر من فضۃ  
 قدر و اہا تقدیراً ۱۲ ویستقون فیہا کاساً کان مزاجہا زنجبیللاً ۱۳ عیناً فیہا تسمی سلسبیللاً۔  
 اس وقت مجھ کو جن مضمون کا بیان کرتا ہے وہ ان آیات کا مدلول نہیں ہے مگر علم اعتبار کے  
 طور پر ان آیات کو اس مضمون سے ایک مناسبت لطیفہ ہے اور اسی لطافت کی وجہ سے اُن  
 کو پڑھا گیا ہے ہر چند کہ ان آیات کی دلالت قواعد شرعیہ سے اس مضمون پر کافی نہیں ہے  
 مگر وہ مضمون دیگر نصوص صریحہ میں منصوص ہے اور اس کا مقتضایہ تھا کہ اس وقت میں  
 انہیں آیات کی تلاوت کرتا جن آیات کی دلالت اس مضمون پر صریح ہے مگر اس کو  
 تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کوئی نئی بات نہ معلوم ہوتی اور جی یہ چاہا کرتا ہے کہ بیان میں افادہ  
 جدیدہ ہو اس لئے میں نے ان آیات کو جدید فائدہ کے لئے تلاوت کیا ہے تاکہ ان سے  
 اس مضمون پر ایک لطیف استنباد ہو سکے اس لطافت کی غرض سے میں نے ان آیات کو  
 بیان کے لئے اختیار کیا۔ اب وہ مضمون سننا چاہیے جو کہ بہت ضروری ہے گو اس وقت کا بیان  
 محض اس مضمون کی ضرورت کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ بعض طالبین کی استدعا کی  
 وجہ سے ہو رہا ہے مگر بات یہ ہے کہ محض استدعا بیان کے لئے محرک کافی نہیں بلکہ  
 استدعا کے بعد جب کوئی ضروری مضمون بھی ذہن میں آجاتا ہے اس وقت بیان ہوتا  
 ہے پس مضمون کی ضرورت کو بھی بیان میں دخل ضرور ہے اور اس مضمون کا اصل خطاب  
 اہل ذکر کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس کی ضرورت سالکین کو جو اللہ کا نام بیٹے  
 والے ہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کے بیان کے لئے یہ مجلس  
 جس میں سالکین کثرت سے ہیں اختیار کی ہے گو استدعا پرسوں (جمعرات کو) ہوتی  
 تھی اور شاید مستدعی نے قرب جمعہ کی وجہ سے یہ خیال کیا ہو گا کہ بیان جمعہ میں ہو گا۔



اور شاید اسی خیال سے استدعا بھی جمعہ کے قریب کی گئی کیونکہ وہ دن بھی ایسا ہے جس میں اہل علم کی عادت بیان کرنے کی ہے مگر میں نے چند وجوہ سے کل بیان نہیں کیا۔ ایک تو کچھ طبیعت اچھی نہ تھی اور میں نے وعدہ اسی شرط پر کیا تھا کہ اگر طبیعت میں نشاط ہو تو بیان کر دوں گا گو نشاط کا پیدا ہونا جی کے سمجھانے پر ہے جب آدمی کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو نشاط بھی پیدا ہو ہی جاتا ہے پس یہ کوئی مانع قوی نہ تھا۔ مگر وعدہ نشاط ہی پر معلق تھا اور اصل وجہ کل نہ بیان کرنے کی یہ تھی کہ جمعہ کے دن مجمع عام ہوتا ہے اور اس مضمون کا تعلق زیادہ تر خاص جماعت سے ہے ہی مقصود بالخطاب ہیں۔ دوسرے جمعہ میں اجتماع ایک دعوت عامہ للصلوة کی بنا پر ہوتا ہے لوگ نماز کی غرض سے آتے ہیں اس کے بعد اگر بیان کیا جاتا ہے تو بعض لوگوں کو شرما شرمی بیٹھنا پڑتا ہے آزادی نہیں رہتی اور جمعہ کے علاوہ کسی دن میں بیان کیا جائے تو دعوت عامہ کی وجہ سے اجتماع نہ ہوگا بلکہ دعوت خاصہ سبب ہوگی اور یہاں تو دعوت خاصہ بھی نہیں ہوتی بلکہ اتفاقاً یا خود کسی سے سن سنا کر سب لوگ جمع ہو گئے ہیں تو اس صورت میں جو کوئی سنے گا آزادی سے سنے گا۔ کیونکہ وہ خاص اسی غرض کے لئے آیا ہے بہر حال چونکہ اس مضمون کی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے اس لئے یہ خاص وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا۔ عام وقت اور عام مجمع اختیار نہیں کیا گیا اور یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ اس کی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے۔ سب کو محسوس نہیں ہوتی ورنہ درحقیقت مضمون عام ضرورت کا ہے سب مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہے مگر کیا کیا جائے آج کل مسلمانوں نے عموماً ذکر اللہ کو چھوڑ رکھا ہے ایک خاص جماعت ہی ذاکر رہ گئی ہے ورنہ کیا ذکر اللہ بھی ایسی چیز ہے جو کسی خاص جماعت سے مخصوص ہو اس کی تو ہر مسلمان کو ضرورت ہے اگر سب ذاکر ہوتے تو اس مضمون کے مخاطب بھی سب ہی ہوتے مگر افسوس کہ آج کل عموماً مسلمان ذکر سے غافل ہیں رات دن دنیا ہی کے قصہ میں لگے رہتے ہیں۔ نہیں کہ ان کو وقت نہیں ملتا اے صاحب وقت تو اتنا ملتا ہے کہ اس کو رادھرا دھرا کٹے پھرتے ہیں مگر یہ کہئے کہ وقت کی قدر ہی نہیں اور ذکر کی طلب ہی نہیں طلب وہ چیز ہے کہ

اپنا وقت خود نکال لیتی ہے اور عام لوگوں کی میں کیا شکایت کروں ستم یہ ہے کہ سمجھ دار لوگ بھی اس سے غافل ہیں اور سمجھ دار لوگوں سے میری مراد اہل علم ہیں کہ ان کو بھی پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و وعظ گوئی ہی میں مرزا آتا ہے ذکر سے جان چراتے ہیں پرسوں میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا جو اہل علم ہی میں سے ہیں گو مشاہیر و ممتازین میں سے نہیں وہ لکھتے ہیں کہ اور اد سے میرا بڑا جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا کہ روز صبح کو سورہہ یسین پڑھو ظہر کے بعد ہر روز انا فحتمنا پڑھو بعد عشا کے سورہہ ملک پڑھو اور روزانہ چکی کی طرح کئی ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرو۔ ہاں مطالعہ کتب میں بہت جی لگتا ہے مگر انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس وسوسہ کو دفع کرتا ہوں اور ہمت کے سب اور اد پورے کرتا ہوں یہ علم کا اثر تھا کہ وسوسہ کی غلطی پر متنبہ ہو گئے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ وسوسہ ہی کیوں آیا کبھی روٹی کھانے کے متعلق وسوسہ نہ آیا کہ یہ روز گہیوں کی روٹی کھانا کہاں کا جنم روگ لگا کبھی بیوی کے پاس لیٹنے میں یہ خیال نہ ہو کہ یہ کہاں کا جنم روگ چھپے لگ گئی اور اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوق اس کے پاس روزانہ آیا کرے تو کیا اس کو کبھی یہ خیال ہو گا کہ یہ کہاں کا جنم روگ چھپے لگا کبھی نہ ہوتا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ تو یہ بہا تا ڈھونڈھے گا کہ اور تھوڑی دیر بیٹھے عاشق محبوب کے ساتھ مجالست اور محاورت میں کبھی اختصار کا طالب نہیں ہوتا بلکہ خدا سے یہ چاہتا ہے کہ وصل کی رات کبھی تمام ہی نہ ہو پھر وہ اس کی روزانہ آمد و رفت سے کیونکر گھبرا سکتا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا ”وما تلتک بمیمنک یا موسیٰ“ تو آپ جواب میں عرض کرتے ہیں ہی عصای اتو کو علیہا و اھشی بہا علی غنمی ولی فیہا صا رب اخوی یہاں آپ نے ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب سے کام لیا مگر اطناب مہل نہیں جس کو اسہاب کہا جائے بلکہ اطناب مفید جو کہ بلاغت کی ایک نوع ہے اور مفید کس کو موسیٰ علیہ السلام کو کیونکہ اس اطناب سے ان کو اپنے شوق کا اظہار مقصود تھا کہ جب محبوب کے ساتھ بات کا موقع مل گیا تو جہاں تک دائرہ بلاغت میں رہ کر کلام میں وسعت ہو سکے اس کو وسعت دینا چاہیے۔ اس لئے آپ نے عصا کے متعلق جتنی باتیں بیان میں آسکتی تھیں سب بیان کر دیں

یہ بھی اہل طریق کا ایک معمول ہے کہ وہ سوال کا جواب مقام ادب میں بھی پورا دیتے ہیں گو اس میں اطناب ہی ہو جائے البتہ ایسا اطناب نہ ہو جو بے کار و فضول ہو بلکہ جو اب پورا ہو اور اطناب مفید ہو۔ آجکل یہ عجیب ادب نکلا ہے کہ بزرگوں کے سامنے گفتگو ادھوری کرتے ہیں آدھی بات زبان پر ہوتی ہے آدھی پریٹ میں کبھی جواب پورا ہی نہیں دیتے کیونکہ پوری بات کہنا خلافت ادب ہے سبحان اللہ اور تکلیف دینا بڑا ادب ہے ارے بھائی اگر ان کے سامنے بولنا بے ادبی ہو بھی تو امر کے بعد تو بے ادبی نہ رہے گی کیونکہ مشہور مسئلہ ہے "الامر فوق الادب" اول تو جواب پورا دینا بے ادبی ہے ہی نہیں اور اگر فرضاً ہو بھی تب بھی امر کے وقت تو امر کا بجالانا ہی ادب ہے۔ یہاں محض اہل حال کی ایک غلطی معلوم ہوئی وہ یہ کہ بعض اہل حال بیماری اور مصیبت وغیرہ میں دعا نہیں کرتے اور اس کو خلافت ادب سمجھتے اور یوں کہتے ہیں ۵

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن

کہ حال خستہ دلاں را تو خوب می دانی ۶۶

آپ کے سامنے حال دل کہنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ آپ تو حال دل خستہ کو خوب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہے پھر دعا کی کیا حاجت ہے۔ وہ سن لیں کہ گو بظاہر تمہاری دلیل صحیح ہے اور اس کے لحاظ سے دعا کی ضرورت نہیں مگر ایک دوسری وجہ سے ضرورت ہے وہ کیا وہ ضرورت یہ ہے کہ محبوب کا امر ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم بے ضرورت ہی ان سے مانگو اور اپنی احتیاج ظاہر کرو۔ گو وہ سب کچھ جانتے ہیں اسی کو مولنا فرماتے ہیں ۵

ازدعا نبود مراد عاشقاں جز سخن گفتن باں شیریں دہاں

دعا سے عاشقوں کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ اسی بہانے سے اس محبوب حقیقی سے خوب دیر تک لذت کلام و مناجات حاصل ہوتی ہے۔

یعنی دعا سے عاشقوں کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ محبوب کے ساتھ کچھ دیر باتیں ہی کر لیں کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہوگی کہ وہ خود دعا کا امر فرماتے ہیں تو وہ عاشق بڑا محروم ہے جس کو محبوب اجازت دے کہ ہم سے باتیں کرو اور وہ منہ بند کر لے کہ آپ کو

تو سب معلوم ہے پھر میں کیوں کہوں یہ تو خامی عشق کی دلیل ہے اگر عاشق ہوتے تو اس موقع کو غنیمت سمجھتے کہ جب وہ بولنے کی اجازت دے رہے ہیں تو مجھ کو خوب بولنا چاہیے۔ اسی لئے امر کے بعد وہ خوب بولتے ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ دوسرے اس کو بے ادب سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ۷

بے ادب تر نیست زو کس در جہاں      با ادب تر نیست زو کس در جہاں

(مولانا رومیؒ عاشقان حق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بظاہر بے ادب ان سے جہاں میں کوئی نہیں ہے لیکن ان سے با ادب بھی باطن میں جہاں کے اندر کوئی نہ ہوگا اور بظاہر بے ادب جوش عشق میں معلوم ہوتے ہیں۔)

جہاں سے مراد علانیہ ہے اور نہاں سے مراد باطن ہے یعنی عاشق سے بڑھ کر ظاہر میں کوئی بے ادب نہیں ہوتا (کیونکہ وہ ایسا سر ہو کر دعا کرتا ہے جیسے کسی سے لڑ رہا ہو) اور باطن میں اس سے بڑھ کر با ادب کوئی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے زیادہ بولنے کا منشا محبت ہے اور اس طریق میں محبت ہی بڑا ادب ہے (وہ دلیل قولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان اللہ یحب الملحین فی الدعائهم) مگر اتنا فرق ہے کہ محبت میں عارف تو حدود کا خیال رکھتا ہے اور مجذوبین و مسلوب العقل لوگوں سے بعض کلمات حدود سے باہر بھی نکل جاتے ہیں مگر چونکہ منشا اس کا بھی محبت ہی ہے اس لئے وہ ظاہر میں بے ادب معلوم ہوتے ہیں مگر باطن میں ادب سے بھرے ہوئے ہیں ان پر ملامت کا حق نہیں گو تقلید بھی جائز نہیں بہر حال امر کے بعد عاشق کو سکوت جائز نہیں جب وہ بولنے کا حکم کرے تو بولنا چاہیے۔ اس لئے یہ کسی ناقص کا کلام ہے ۷

پہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن الخ محقق کا کلام یہ ہے کہ ۷

ازدعا نہ بود مراد عاشقاں      جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

دعا سے مراد عاشقوں کی صرف یہی ہوتی ہے کہ اس بہانے سے حق تعالیٰ کے ساتھ شرف ہم کلامی نصیب ہو جائے اور

گفتگوئے عاشقاں در کار رب      جوشش عشق است نے ترک ادب

(عاشقوں کی گفتگو حق تعالیٰ کی محبت میں جوش عشق سے ہوتا ہے نہ کہ ترک ادب سے جیسا کہ اہل

ظاہر ان کے ظاہر کلام سے بدگمانی کرتے ہیں)

اس وقت بولنا ہی ادب ہے اور پوری بات کہتا ہی محبت کی علامت ہے اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام پر ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب کے ساتھ جواب دیا کیونکہ وما تلك بيمينك يا موسىٰ کے جواب میں اتنے لمبے جواب کی ضرورت نہ تھی صرف ہی عصا کہدینا کافی تھا بلکہ صرف ”عصا“ بھی کافی تھا ”ہی“ کا بڑھانا بھی اطناب ہے بلکہ یا، متکلم کی بھی ضرورت نہ تھی صرف ”عصا“ ہی کافی تھا اور خیر اس کو اگر کوئی اطناب نہ مانے تو آگے ”اتو کوء علیہا و اھش بھا علی غنمی تو یقیناً اطناب ہے کہ یہ میری لاکھی ہے جس پر میں سہارا لیا کرتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑا کرتا ہوں پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اتنا اور بڑھاتے ہیں ولی فیہا ما رب اخری کہ اس سے میرے اور بھی کام نکلتے ہیں۔ اس میں تفصیل کا موقع رکھ لیا کہ ایسی بات کہی جس سے پھر سلسلہ کلام کا تازہ ہو سکے کہ وہ پوچھیں ہاں صاحب وہ دوسرے کام کیا ہیں تو پھر اور باتیں بیان کروں یا بے پوچھے عرض کر سکیں کہ اس وقت جو عرض کیا تھا ولی فیہا ما رب اخری اس وقت اس کی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس وقت اطناب کا منشاء صرف یہی تھا کہ عاشق محبوب کے ساتھ گفتگو میں اختصار نہیں کیا کرتا بلکہ یہ چاہا کرتا ہے کہ ایک منٹ کی بات ہو تو چار منٹ لگ جائیں کیونکہ اس کو محبوب کے ساتھ گفتگو کرنے میں لطف آتا ہے جان میں جان آتی ہے تو وہ ایسے موقعہ میں تطویل کلام کے لئے موقعہ ڈھونڈا کرتا ہے۔

اسی طرح عارفین دعا ضرور کرتے ہیں جس میں مقصود محض حق تعالیٰ سے مناجات اور نیاز مندی کی چپکے چپکے باتیں کرنا ہوتا ہے عارف کو تو دعا میں ثواب کا قصد بھی نہیں ہوتا گواہل ظاہر کو اس سے وحشت ہوگی مگر میں سچ کہتا ہوں کہ عاشق کو محبوب سے باتیں کرتے ہوئے بجز لذت خطاب کے اور کسی طرف التفات نہیں ہوا کرتا۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو اس مقام پر تطویل کی ہے تو اس سے ان کو ثواب کا قصد تھا۔ صاحب اس پر تو ان کو التفات بھی نہ ہوگا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عارفین کو ثواب سے استغنا ہوتا ہے ہرگز نہیں ان کا تو کوئی فعل بھی طلب

ثواب سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ طلب ثواب کے معنی طلب رضا ہی تو ہیں اور طلب جنت اور طلب رضا واحد ہے اور ظاہر ہے کہ عاشق کا کوئی فعل طلب رضا، محبوب سے خالی نہیں ہوتا پس عاشق کا دعا کے وقت محض خدا تعالیٰ سے بات چیت کا قصد کرنا یہ بھی حقیقت میں طلب ثواب ہی ہے پس یوں کہتا چاہیے کہ ان کو ثواب کا قصد ہوتا ہے مگر ادھر خیال و التفات نہیں ہوتا جب محبوب عاشق سے کوئی بات کہتا ہے تو اس کا جواب دیتے ہوئے عاشق کو ثواب کی طرف التفات نہیں ہو سکتا کوئی نفسہ مقصود ضرور ہے اور اتنی بات تو ہم کو بھی حاصل ہے کہ گو ہماری نماز کچھ چیز نہیں ہے مگر نماز کے وقت ہم کو بھی ثواب پر التفات نہیں ہوتا گو اگر کوئی پوچھے کہ تم نماز کیوں پڑھتے ہو تو سوال کے بعد جواب میں ہی کہیں گے کہ ثواب کے لئے پڑھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ثواب کا قصد تو ہوتا ہے ورنہ یہ جواب کیوں دیتے مگر نماز پڑھتے ہوئے اس پر التفات بہت کم ہوتا ہے پس یہی مطلب ہے میرے اس قول کا عاشق کو دعا میں ثواب کا قصد بھی نہیں ہوتا اور بھلا ثواب سے عاشق کو استغنا کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ سید العاشقین صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ کھانے کے بعد یوں فرماتے تھے: "غیر مودع ولا مستغنی عنہ دینا" سبحان اللہ کیا عیدیت ہے کھانا کھا چکنے کے بعد اس کو اٹھا دینا چونکہ ایک قسم کے اعراض کو موہم ہو سکتا ہے تو آپ اس کو اس طرح دور کرتے ہیں کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ میرا پیٹ بھر گیا اور چونکہ اب کھانے کی گنجائش نہیں رہی اس لئے کھانے کو اٹھاتے ہیں ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتے شام کو پھر مانگیں گے اور ہم اس سے مستغنی نہیں ہوئے ہیں۔ جب دنیوی نعمتوں سے بھی عاشق کو استغنا نہیں ہے تو ثواب سے ان کو کیونکر استغنا ہو سکتا ہے۔ بعض جہلا کی عادت ہے بزرگوں کے سامنے کچھ ہدیہ پیش کرتے ہیں تو یوں کہا کرتے ہیں کہ ہے تو حقیر ہدیہ اس قابل نہیں کہ پیش کیا جاوے آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے نہ آپ کو اس کی پروا ہے مگر ہماری خاطر سے قبول کر لیجئے یہ نہایت سخت کلمہ ہے نعم الہیہ سے کسی کو استغنا نہیں مشائخ کی بزرگی بھی اسی وقت تک ہے جب تک اللہ تعالیٰ دونوں وقت کھانے کو دے رہے ہیں اور جو

یہ نہ ہونہ معلوم کیا حالت ہو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ  
عبدالقادر صاحب کا قصہ بیان فرماتے ہیں یہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھائی ہیں مگر  
تقویٰ میں سب سے بڑھے ہوئے تھے گو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح  
زیادہ مشہور نہیں ہوئے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے ان کے سامنے دھیلہ کی کوڑیاں ہدیہ  
میں پیش کیں آپ کو اس کی رغبت پر رحم آیا اور غریب ہوتا تو اسی سے ظاہر تھا کہ بیچارے  
نے دھیلے کی کوڑیاں پیش کیں تو آپ نے فرمایا بھائی ان کو تم ہی اپنے کام میں لے آؤ اس نے  
اصرار کیا کہ حضرت میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ ہلکے قبول کر لیں میں نے آپ ہی کی نیت سے  
جمع کی ہیں مگر آپ نے عذر کر دیا وہ بیچارہ واپس لے گیا اس پر بتلا عتاب ہو گئے یا تو اس  
لئے کہ ایک مسلمان کی دل شکنی ہوئی تھی یا اس لئے کہ آپ کے نفس میں کوئی بات مخفی ہوگی  
ممکن ہے کچھ وسوسہ استغناء کا تحقیر ہدیہ کی بنا پر آگیا ہو کہ میں یہ کوڑیاں لیکر کیا کروں  
بعض دفعہ نفس میں کچھ دقیقہ مخفی ہوتا ہے اور کسی عمل میں نفس کا کچھ شائبہ ہوتا ہے جس کی  
بتلا کو خیر نہیں ہوتی اسی لئے بعض دفعہ شیخ مرید کی کسی ادنیٰ بات پر تشدد کرتا ہے جس سے  
مرید کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شیخ بڑے متشدد ہیں کہ ذرا ذرا اسی بات پر مواخذہ کہتے ہیں مگر حقیقت  
میں وہ بات مرید کی نظر میں خفیف ہوتی ہے اور شیخ کی نظر میں شدید ہوتی ہے کیونکہ اس  
میں نفس کا جو کید ہے وہ مرید کی نظر سے خفی ہے اور شیخ کی نظر میں جلی ہے۔ حدیث میں آیا ہے  
"الشرك اخفى في امتي من دبيب النمل على الصفا" کہ شرک میری امت میں چلنے پھرنے پر چھوٹی کی  
چال سے بھی زیادہ خفی ہے بھلا اول تو چھوٹی کی چال ہی کیا ہوتی ہے پھر وہ بھی چمکتے پتھر پر  
اس میں تو کچھ بھی اس کا احساس نہیں ہو سکتا تو جو مرض ایسا خفی ہو دوسرے تو اس کو  
کا عدم سمجھیں گے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بھی شرک فرما رہے ہیں۔ تو  
کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی متشدد تھے کہ اتنی ذرا اسی بات کو شرک سے  
تعبیر فرماتے ہیں ہرگز نہیں پھر حق تعالیٰ کی نظر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ  
ہے وہ تو اس سے بھی خفی تر کو جانتے ہیں اس لئے بعض دفعہ حق تعالیٰ کسی ایسی  
بات پر مواخذہ فرماتے ہیں جس کا مقابل مواخذہ ہونا بتلا کو معلوم نہیں ہوتا گو

کتنا ہی بڑا عارف ہو مبتلا کو بعض دفعہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کام میں نفس کا کچھ شائبہ تھا مگر حق تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے اس لئے مواخذہ فرماتے ہیں اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے عارفین پر کہ ان کی بات بات پر مواخذہ فرمائیں۔ کیونکہ جس بچہ کو استاد روز ایک قمچی مار دیتا ہو یہ اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس پر شفقت ہے اور جس بچہ کو کبھی سزا نہ ملتی ہو اس پر خطرہ ہے کہ شاید استاد اسے اپنے مکتب سے نکالنا چاہتا ہے اس کو آزاد چھوڑ دینا اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس سے محبت نہیں ہے اس لئے دنیا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ مواخذہ ہوتا رہتا بھی رحمت کی دلیل ہے بلکہ اگر آخرت میں بھی مواخذہ ہو اور کسی مسلمان کو حق تعالیٰ جہنم میں بھیج دین تو یہ بھی ان کی رحمت ہے کیونکہ قدر نعمت کے داند کہ بمصیبت گرفتار آید۔ نعمت کی قدر مصیبت کے بعد معلوم ہوا کرتی ہے جو شخص جہنم کا عذاب بھگت کر جنت میں جائے گا اس کو جنت کی بہت قدر ہوگی۔ ایک حدیث کے متعلق اپنے استاد علیہ الرحمۃ کا ایک مضمون یاد آ گیا جو اسی اصل پر مبنی ہے۔

وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت میں جب سب جہنمی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے تو جنت میں کچھ جگہ خالی رہ جائے گی اور جہنم بھی نہ بھرے گی۔ تو جنت عرض کرے گی کہ مجھ سے بھرنے کا وعدہ تھا تو مجھے بھرا جائے اور جہنم بھی کہنے لگی کہ ہل من مزید کچھ اور بھی ہے تو حق تعالیٰ جہنم کے لئے کسی نئی مخلوق کو پیدا نہ کریں گے بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دیں گے یہ مشابہات میں سے ہے ہم اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتے۔ تو حق تعالیٰ کے قدم رکھنے سے جہنم سمٹ کر بھر جائے گی اور کہے گی قط قط یعنی بس بس میں بھری اور جنت کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا کر کے اس میں آباد کر دیں گے جس سے وہ بھر جائے گی۔ جب یہ حدیث ہم نے پڑھی تو میں نے حضرت استاد سے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ تو ہم سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ بدون کچھ کئے بغیر مشقت کے جنت لے لیں گے کاش ہم انہیں بس سے ہو جاتے۔ تو حضرت استاد نے فرمایا خدا نے ہم ان میں سے ہوتے میاں وہ ہم سے زیادہ خوش قسمت نہ ہوں گے ہم ہی ان سے اچھے ہوں گے واقعی ان حضرات کے علوم بھی عجیب ہیں جن کا دوسری جگہ کہیں پتہ نہیں فرمایا ہم دنیا کے



مصائب پھیل کر جب جنت میں جائیں گے تو جوش میں کہیں گے الحمد للہ الذی اذہب عنہم  
الحزن ان ربنا لعفور شکور الذی احلنا دار المقامتہ من فضلہ لا یمسنا فیہا نصب ولا  
یمسنا فیہا الغوب ہ انہیں یہ بات کہاں نصیب کیونکہ جہاں حزن ہو وہیں اذہب عنہم  
کا بھی لطف ہے انہیں کیا لطف جن کو مشقت ہی نہیں ہوئی وہ تو یہ سمجھیں گے کہ بس یوں ہی  
ہوتا ہو گا کہ پیدا ہوئے اور جنت میں بس گئے ان کو جنت کی قدر ویسی نہ ہوگی جیسی ہمیں ہوگی  
تو اب سمجھ لو کہ جس شخص کو دنیا کی تکالیف کے ساتھ جہنم کا عذاب بھی بھگتنا پڑے اس کو  
دخول جنت کے وقت اذہب عنہم کا لطف اور اس سے زیادہ حاصل ہو گا گناہ کی  
قدر اور لذت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو ڈوبنے کے بعد ساحل پر پہنچا ہو اس کے دل  
سے ساحل کی لذت پوچھو اور جو شخص ڈوبا ہی نہیں اس کو ساحل کی قدر اور لذت اس کے  
برابر نہیں ہو سکتی۔

اب میں یہاں اپنا ایک قصہ ایک شبہ کے واقع ہونے کا اور اس کے جواب کے متکشف  
ہونے کا بیان کرنا چاہتا ہوں اور گو یہ مضمون متن میں بیان کرنے کے قابل تھا تمہید میں بیان  
کرنے کا ارادہ نہ تھا مگر اسی وقت یاد آیا تو میں بیان کئے دیتا ہوں نہ معلوم پھر یاد رہے نہ رہے  
ایک دفعہ مجھ کو کچھ پریشانی سی پیش آئی تھی جیسا کہ زمانہ طلب میں عموماً اہل طریق کو  
پیش آیا کرتی ہے جبکہ وہ مجاہدات اور اذکار و اشغال کچھ مدت تک کر لیتے ہیں اور شمرہ محسوس نہیں  
ہوتا تو دل میں وصول کے لئے اضطراب اور بے چینی اور عجلت کا مضمون پیدا ہوتا ہے  
یہی حالت باوجود مجاہدہ نہ کرنے کے براہ ہوس مجھ کو پیش آئی اور قلب میں یہ خیال پیدا  
ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے گو ہم اس قابل نہیں مگر الٹی سیدھی ہم کو حق تعالیٰ کی طلب بھی  
ہے گو عشق سعدی تابز انوہی کی مثل ہی شیخ سعدی نے ایک عاشق کو دیکھا تھا جو کسی محبوب  
کی طلب میں کوٹھے پر سے کود پڑا تھا۔ ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ آپ نے قصہ پوچھا کہ یہ  
کیوں پڑا ہے کیسے ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ اپنے محبوب کو دیکھ کر کوٹھے  
پر سے کود پڑا اس لئے چوٹ لگ گئی۔ تو شیخ سعدی رہ بھی اسی زمین کی ایک سیرتھی  
یہ چڑھ کر کود پڑے اور فرمایا "عشق سعدی تابز انو کہ بھائی ہمارا عشق اتنا ہی ہے کہ ایک بلندی سے

تو ایسے ہی گو ہماری طلب کامل نہیں مگر پھر بھی بحد الشکر کچھ تو ہے۔ ادھر حق تعالیٰ قادر ہیں۔ ان کو اسباب و وسائط کی کچھ ضرورت نہیں وہ اگر چاہیں تو دفعۃً واصل کر سکتے ہیں ادھر وہ علیم بھی ہیں ہماری اس بے چینی اور اضطراب کی ان کو خیر بھی ہے پھر رحیم بھی ہیں اس حالت میں ان کو رحم بھی آتا ہوگا پھر وصول میں دیر کیوں ہے بیلد کی کیوں نہیں ہو جاتا واقعی سچ فرمایا خلق الانسان عجولاً انسان میں عجلت کا مادہ فطری ہے غرض ان مقدمات کے بعد وصول کی تاخیر سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کس لئے ہے جب زیادہ الجھن بڑھی تو میں نے مثنوی سے فال لی اور اس فال کا یہ مطلب نہ تھا کہ میرے اعتقاد میں مولانا رومی نے آکر ورق لوٹ دیئے ہرگز نہیں بلکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ مولانا رومی متبرک بزرگ اور محقق تھے ان کا کلام بھی متبرک اور جامع ہے۔ حق تعالیٰ اس برکت کو اس طرح ظاہر فرما دیتے ہیں کہ اس میں سے کوئی موافق مضمون نکال دیتے ہیں چنانچہ مثنوی کھولتے ہی سرورق پیرا اس کا جواب موجود تھا۔ یہ بھی نہیں کہ سطر میں گننے کی ضرورت پڑی ہو جس کا جی چاہے۔ مثنوی مطلوبہ کھول کر دیکھ لے یہ اشعار سرورق پریں گے اور جواب بھی ایسا نکلا کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی زندہ ہوتے تو یہی جواب دیتے۔ واقعی عجیب جواب ہے جس میں کمال یہ ہے کہ میرے مقدمات بھی سب تسلیم کر لئے گئے پھر جواب دیا گیا فرماتے ہیں

چارہ مے چوید پئے من داد تو می شنودم دوش آہ سرود تو

رتمہاری طرف سے سعی اور ہماری تلاش ہم کو تسلیم ہے۔ اور اے عاشق ہم نے کل تیری آہ اس میں طلب اور علم کو تسلیم کیا گیا کہ بیشک تم کو طلب بھی ہے اور درد کے لئے چارہ کی تلاش بھی ہے اور مجھ کو اس کی خبر بھی ہے میں تمہاری آہ و فریاد کو سن رہا ہوں

می تو انم ہم کہ بے این انتظار رہ نمایم داد ہم راہ گزار

( میں اس کی قدرت رکھتا ہوں کہ بے انتظار ہی تم کو قرب تمام عطا کر دوں )

تا ازیں طوفان دوراں دارہی برسہ گنج و صالم پانہی

( تاکہ تم اس طوفان مجاہدات سے نجات پا جاؤ اور میرے قرب کے خزانے کو پا جاؤ )

ضروری اطلاع: ہر خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور ذکر فرمائیں۔

اس میں قدرت کا ذکر ہے کہ یہ مجھی مسلم ہے کہ ہم بدون کسی انتظار کے بھی داخل بنا سکتے ہیں اور ہم کو رحم بھی آتا ہے کہ تم کس طوفان بلا میں گرفتار ہو۔ جلدی وصول ہو جانے میں اس طوفان سے بھی نجات ہو جائے گی۔ ان سب مقدمات کا مقتضا تو یہی ہے کہ وصول میں دیر نہ ہوتی مگر ایک مقدمہ تمہاری نظر سے رہ گیا وہ یہ کہ جیسے ہم علمِ قائم کا درحیم ہیں اسی طرح ہم حکیم بھی ہیں پس تم نے یہ تو دیکھ لیا کہ طلب و رحمت و قدرت کا مقتضا تعجیل تھی یہ نہ دیکھا کہ حکمت کا مقتضا تاخیر ہے آگے تاخیر کی حکمت کا بیانا ہے اور الشرح عجیب حکمت ہے فرماتے ہیں ۷

لیک شیرینی و لذات مقرر ہست بر اندازہ رنج سفر

لیکن وصل کی شیرینی اور قرب، منزل کی لذت سفر کے مشقتوں کے اعتبار سے محسوس ہوتی ہے وہ حکمت یہ ہے کہ قرار گاہ پر پہنچنے کی شیرینی اور لذت مشقت سفر کے موافق محسوس ہوا کرتی ہے جس کو سفر میں زیادہ تعب اور مشقت ہوتی ہے اس کو منزل پر پہنچنے کے بعد اتنی ہی لذت بھی آتی ہے اور جس کو بدون تعب کے وصول ہو گیا اسے منزل پر پہنچنے کی پوری قدر نہیں ہوتی ۷

زاتکہ از فرزند خویشاں بر خوری کز نریبے رنج و محنت ہا بری

جو مسافر کئی سال پر اپنے بال بچوں میں آتا ہے جس کو گھر آکر بہت لطف محسوس ہوتا ہے جو مسافر کئی سال کے بعد اپنے گھر پر آتا ہے بیوی بچوں سے مل کر اس کو زیادہ خوشی ہوتی ہے پس یہ حکمت ہے تاخیر فی الوصول میں تاکہ تم کو وصول کی پوری قدر ہو۔ اگر ستے ہی پہنچ جایا کرتے تو وصول کی بے قدری کرتے کیوں اس لئے کہ ۷

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دید گوہرے طفلی بقرص ناں دید

(جو شخص کسی چیز کو مفت پا جاتا ہے اس کو مفت میں دیدیتا ہے جس طرح نادان بچہ موتی کو روٹی کے بدلے میں دیدیتا ہے)

اور جس شخص کو مشقت اور مصیبت کے بعد وصول ہو گا اس کی تو عمر بھر یہ حالت رہے گی کہ ۷

بر دل سالک ہزاراں عنم بود گرز بارغ دل خلالے کم بود

اس کو ذرا ذرا سی کوتاہی پہاڑ کی برابر گراں معلوم ہوگی اور جو آسانی سے پہنچ گیا ہے وہ اتنا پھونک پھونک کر قدم نہ رکھے گا کیونکہ عدم وصول کی بے چینی کا اندازہ ہی نہیں ہوا پس یہ جو اب دیکھ کر میری تسلی ہوگئی جو بہت بڑی حکمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرات میں جو اہل تصرف بھی ہوئے ہیں وہ تصرف سے کام نہیں لیتے تھے اور کسی کو ایک توجہ سے واصل نہیں بناتے تھے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات صاحب تصرف نہ تھے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بس یہ تو محض ملا ہیں نماز روزہ کر لیتے ہیں ان میں تصرف وغیرہ کچھ نہیں یہ بالکل غلط ہے بجز اللہ ہمارے حضرات میں بڑے بڑے صاحب تصرف بھی ہوئے ہیں جن کو تصرف کی کامل قدرت حاصل تھی مگر وہ اس سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ طالبین ہی سے چکی پسواتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ یہ خود محنت کر کے واصل بنیں تاکہ وصول کی قدر ہو اور جو تصرف سے واصل ہوگا اس کو وصول کی قدر نہ ہوگی۔ دوسرے بلا اذن تصرف کرنا کمال عیدیت کے بھی خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون صاحب تصرف ہوگا اگر آپ تصرف کرتے تو سارے عالم کو ایک دم سے وکی بنا دیتے کسی کی مجال نہ تھی جو کفر کر سکتا مگر آپ نے اس سے کام نہیں لیا۔ حضرت ابو طالب کے متعلق آپ کی خواہش بھی تھی کہ یہ ایمان لے آئیں مگر آپ نے قوت تصرف کو استعمال نہیں کیا۔ تو خدا معاف

سوال :- هذا الكلام يردّه ظاهر ا قوله تعالى انك لا تهدي من اجبت ولكن الله يهدي من يشاء فانه يكفي قدرة التصرف عنه صلى الله عليه وسلم. جواب :- ليس فيه نفى ذلك ولو كان كذا كان حق العبادة انك لا تهدي من شئت ولكن قال تهدي من اجبت فعلم به انه صلى الله عليه وسلم لم يرد هداية احد نعم اجبرها بعض والمحج غير الارادة ولو اراد ذلك و صرف فيه همة لهدى الله الناس جميعا ۲ «جامع» ثم المشية لو درجتان احد هما صرف القدرة فقط وثابتها صرف الهمة مع ذلك والثابت بالاية لو ثبت هو الاول فقط والمنتفى في كلامنا هو الثاني ۱۲ (اشرف)

کہ ابوطالب کے نام کے ساتھ زبان سے حضرت ہی نکلتا ہے حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے مگر چونکہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی اور محبت بھی ایسی کہ جان نثار تھے اور چچا بھی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے محبت تھی اس لئے زبان پر ان کے نام کے ساتھ بیساختہ حضرت نکل جاتا ہے ابو جہل کے نام کے ساتھ کبھی نہیں نکلتا کیونکہ وہ آپ کا چچا تھا اگرچہ حقیقی نہ تھا مگر اس کے ساتھ ہی موزی بھی بہت تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے بہت ایذا دی ہے اس لئے اس کے نام کے ساتھ کوئی تعظیمی لفظ نہیں نکلتا۔ ایسے ہی ابو لہب کے نام کے ساتھ بھی نہیں نکلتا کہ وہ حقیقی چچا ہے مگر ایذا میں ابو جہل کے مثل تھا بعض لوگ سورہ تبت کے پڑھنے سے کراہت کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی مذمت ہے اس کے پڑھنے سے آپ کو ایذا ہوتی ہوگی اور اس کے متعلق ایک خواب بھی مشہور ہے۔ مگر جو خواب دلائل شرعیہ کے خلاف ہو وہ حجت نہیں ہوا کرتا، بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام الہی کے پڑھنے سے کبھی ایذا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں یہ ماننا کہ وہ آپ کا چچا تھا مگر ادھر یہ بھی تو دیکھو کہ حق تعالیٰ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا علاقہ تھا پھر محبوب اگر اپنے کسی عزیز سے بغض رکھے تو کیا عاشق کو اس سے بغض نہ ہوگا ضرور ہوگا اور محبوب اگر اس عزیز کی مذمت کرے تو کیا عاشق کو اس سے ایذا ہوگی کبھی نہیں ہوگی بلکہ لذت آسگی رہاں یہ ضرور ہے کہ کسی خاص صورت کی تعیین کر لینا مناسب نہیں کہ اس میں سورہ تبت اور اس کے غیر سب برابر ہیں۔ ممکن ہے کسی نے اسی صورت کو قرأت کے لئے ورد بنا لیا ہو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشرطیکہ خواب کا قصہ صحیح ہو لطیف عنوان سے خواب میں متنبہ فرمایا ہو ممکن ہے کہ اس شخص میں ادب کم ہو آپ نے بطور معالجہ کے اس کے لئے یہ تجویز فرمایا ہو (جامع) بہر حال اگر آپ تصرف سے کام لیتے تو کم از کم اپنے عزیزوں پر تو ضرور اثر ڈال دیتے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ اسی سنت کا اتباع ہمارے حضرات کرتے ہیں وہ بھی تصرف سے کام نہیں لیتے اور اگر کبھی کسی متوسط نے ایسا کیا بھی تو اکابر نے اس کو مٹا دیا ہے۔ چنانچہ حضرت جتید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک

دفعہ کسی بادشاہ سے گفتگو کر رہے تھے ساتھ میں حضرت شبلی بھی تھے اثنائے گفتگو میں بادشاہ نے حضرت جنید کو کوئی سخت کلمہ کہا وہ تھل سے تھل سے کام لیتے رہے مگر حضرت شبلی سے نہ رہا گیا وہاں کوئی قالین بچھا ہوا تھا جس پر شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی حضرت شبلی نے اس تصویر پر توجہ کا اثر ڈالا تو وہ سچ مچ شیر بن گیا۔ حضرت جنید نے دیکھ لیا انہوں نے فوراً اس پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ پھرمٹ گیا اور تصویر کی تصویر رہ گئی بادشاہ نے پھر کسی بات پر کوئی سخت کلمہ کہا حضرت شبلی نے پھر توجہ کی جس سے دوبارہ وہ تصویر سچ مچ سیر کی صورت بن گئی۔ حضرت جنید نے پھر ہاتھ رکھ کر اس کو مٹا دیا کئی بار ایسا ہوا حتیٰ کہ ایک دفعہ بادشاہ کی نظر بھی شیر پر پڑ گئی تو اس کا رنگ فق ہو گیا اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو حضرت جنید نے تسلی کی کہ آپ نہ گھبرائیں اس کی مجال نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کچھ بھی کہہ سکے آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ آپ کو حق ہے کہ میں جو چاہوں کہیں میں کبھی آپ کے مقابلہ میں تصرف نہ کروں گا۔ یہ شبلی بچہ تھا اس سے تھل نہ ہوا اس نے تصرف سے کام لے لیا۔ مگر میں اپنے سامنے اس کے کسی تصرف کو آپ پر چلنے نہ دوں گا بالکل بے فکر رہیں۔ حضرت جنید نے تو اس کو بے فکر کر دیا مگر اس کو ان حضرات کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو کتنی قوت عطا کی ہے بس اس کے بعد سنبھل سنبھل کر باتیں کرنے لگا پھر کوئی گستاخی نہیں کی۔ سو ہمارے اکابر تو ایسے ہوئے ہیں کہ خود تو تصرف کیا کرتے اگر کسی چھوٹے نے کیا بھی تو اس کو مٹا دیا غرض وہ تصرف اس کو نہیں کرتے کہ اول تو اس میں سالک کو نعمت کی قدر نہیں ہوتی کیونکہ قدر تو بعد مشقت ہی کے ہوتی ہے دوسرے پھر وہ ہمت توڑ دیتا ہے پس توجہ ہی کے سہارے پر چلتا ہے۔ تیسرے یہ طریقہ خلاف سنت بھی ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کبھی تصرف سے کام نہ لیتے تھے اس مقام پر پہنچ کر حضرت مولانا کو ماقبل کا ربط یاد نہ رہا تو جامع و عظم سے دریا فرمایا تو اس نے اطلاع کی کہ یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ خدا تعالیٰ کا مواخذہ بھی رحمت ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں اس پر فرمایا کہ ۱۲ جامع) میں یہ بیان کر رہا تھا کہ

حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر کبھی گرفت ہو جانا بھی رحمت ہے۔ جیسے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ساتھ معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل ابھی آتی ہے اسی پر یہ مضمون چل پڑا تھا کہ وصول میں تاخیر ہونا بھی رحمت ہے اس میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں اور اسی حکمت کے ضمن میں اپنے اکابر کے تصرف نہ کرنے کی وجہ بھی بتلا دی تھی اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے اس غریب کا ہدیہ جو دھیلہ کی کوڑیاں تھیں واپس کر دیا تو اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ اسی دن سے تمام فتوحات بند ہو گئیں اور فاقہ پر فاقہ گزرنے لگا اول تو انہوں نے اس کو حکمت خاص پر محمول کیا کہ شاید رفع درجات کے لئے یہ معاملہ ہو رہا ہے مگر پھر تلبہ ہوا کہ نہیں یہ تو عتاب ہے۔ عارف کو خدا تعالیٰ نے ایک نور دیا ہے وہ اس سے سمجھ لیتا ہے کہ کونسی مصیبت رفع درجات کے لئے آئی ہے اور کونسی عتاب کی وجہ سے آئی ہے (جس کی ایک علامت یہ ہے کہ جس مصیبت کا منشا عتاب ہوتا ہے اس سے بے چینی اور پریشانی بڑھتی ہے) غرض آثار سے وہ سمجھ گئے کہ یہ فتوحات کی بند کسی عتاب کی وجہ سے ہے پھر سوچنے سے خیال آیا کہ فلاں دن اس غریب کی کوڑیاں واپس کر دی تھیں شاید یہ بات ناپسند ہوئی ہے۔ بس اسی وقت گھبرا کر بلایا اور خود سوال کیا کہ بھائی وہ دھیلہ کی کوڑیاں ہمیں دید و آہ یا تو دینے سے بھی نہ لیا تھا یا خود اس سے مانگ رہے ہیں ۵

ابن چنیں شیخے گدائے کو بکو عشق آمد لا ابالی قاتقوا

ایسا شیخ آج گدائی گلی درگلی کر رہا ہے عشق کی یہی شان ہے یہ بڑا ہی لا ابالی

ہے اس سے بچ کے رہو

واقعی یہ عشق بھی بہت ناچ پچاتا ہے وہ بیچارہ یہ سن کر باغ باغ ہو گیا۔ اور کہا مولانا واقعی مجھے آپ کے انکار سے بہت کلفت ہوئی تھی اور میں نے اب تک وہ کوڑیاں خرچ نہیں کیں۔ دل نے گوارا ہی نہیں کیا کہ ان کو خرچ کروں اب تک ویسی ہی رکھی ہیں آپ نے کہا بس جلدی لے آؤ اب میں اس کلفت کا تحمل نہیں کر سکتا جو تم کو ایذا دینے سے

مجھے پہنچ رہی ہے چنانچہ اس نے وہ کوڑیاں دیں اور آپ نے خوش خوش لے لیں۔ بس اسی دن سے فتوحات کا دروازہ کھل گیا صاحبو! عارفین کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ وہ دھیلہ کی کوڑیوں سے بھی مستغنی نہیں ہیں اور اگر کبھی ذرا بھی کسی ادنیٰ نعمت سے استغنا کا دوسرا پیدا ہو جائے تو پھر خود مانگتے ہیں پھر ان کو دعا میں ثواب یا جنت سے استغنا کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ مولانا نے فرمایا ہے کہ

ازدعا نہ بود مراد عاشقان جز سخن گفتن بہ آل شیریں دہاں

دعا سے عاشقان حق کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ سے اسی بہانہ سے ہم کلامی کی لذت نصیب جاتی ہے اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو لذت خطاب کے سوا جنت یا ثواب کی طلب اور پروا نہیں ہوتی ہرگز نہیں پروا تو ان کو ہر چیز کی ہے ہاں غلبہ لذت و خطاب میں بعض دفعہ ثواب وغیرہ کی طرف التفات نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے نماز کی مثال سے اس کو واضح کر دیا تھا اور یہ مضمون دعا کا اس پر چلا تھا کہ عاشق محبوب کے روز روز آنے اور دیر تک بات چیت کرنے سے نہیں گھبرایا کرتا بلکہ وہ تو اس کا موقع ڈھونڈا کرتا ہے کہ کسی طرح اور دیر تک باتیں ہوں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جواب میں اسی لئے اظہار سے کام لیا تھا اس پر درمیان میں ان سالیکن کی غلطی ظاہر کر دی تھی جو دعا کو ترک کر دیتے ہیں اور بتلا دیا تھا کہ گو حق تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اور تمہارے بتلانے اور مانگنے کی ضرورت نہیں مگر محبت کا مقتضا یہ ہے کہ جب محبوب بولنے کی اجازت دے تو بات چیت کے موقع کو غنیمت سمجھے اور خوب عرض و نیاز کرے اور جو چاہے مانگے (یعنی حدود میں رہ کر جامع) عرض عاشق کبھی محبوب کے روز روز آنے سے نہیں گھبرایا کرتا جیسا کہ ہم روز روز دو وقت روٹی کھانے سے نہیں گھبراتے تو حیرت ہے کہ ہم لوگ روٹی سے تو مستغنی نہیں ہیں مگر ذکر سے مستغنی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اہل علم بھی خطا میں لکھتے ہیں کہ اور اد سے جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا جس کا تذکرہ ابھی کیا تھا افسوس ان لوگوں نے دنیا کے کاموں کو کبھی جنم روگ نہ سمجھا دیکھئے جو لوگ کسی کام پر ملازم ہیں وہ روزانہ



اسی کام پر لگتے ہیں کوئی روز آٹے کی مشین چلاتا ہے کوئی روز تعمیر کے کام پر جاتا ہے آخر اس کو جنم روگ کیوں نہیں سمجھا گیا بس یوں چاہیے کہ ہر دن نیا کام کیا جائے ایک ہی کام روز روز کیوں کیا جاتا ہے اس کا منشا صرف یہ ہے کہ ان کاموں کو تو مفید اور ضروری سمجھتے ہیں اس لئے عمر بھر روزانہ کرنے سے بھی نہیں گھبراتے اور ذکر کو مفید اور ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ جنم روگ معلوم ہوتا ہے حضرت یہ ہماری بد قسمتی ہے ورنہ ذکر ایسی چیز ہے کہ مسلمان کو تو اس سے کبھی غفلت نہ ہوتا چاہیے تھی، غالباً حضرت خواجہ عبید اللہؒ احرار کا ارشاد ہے کہ مجھے بہت زمانہ کے بعد معلوم ہوا کہ عالم میں اہل غفلت بھی ہیں ورنہ ابتداء سے میں یہ سمجھتا تھا کہ سب لوگ ذاکر ہیں۔ خدا سے غافل کوئی نہیں۔ خواجہ صاحب بچپن ہی سے صاحب نسبت تھے مادر زاد ولی تھے ان پر کبھی غفلت گزری ہی نہیں اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ سب ایسے ہی ہوتے ہوں گے بعد میں معلوم ہوا کہ دنیا میں اہل غفلت بھی ہیں۔ اس نمونہ کے ایک بزرگ اس زمانہ میں بھی ہوئے ہیں۔ مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب مادر زاد ولی تھے۔ ایک دفعہ کوئی گوجران کی بھینس چرائے گیا حضرت نے تلاش کیا تو لوگوں نے اسی پر شبیہ ظاہر کیا کہ حضرت فلاں شخص لے گیا ہے آپ نے اس سے فرمایا کہ بھائی ہماری بھینس اگر لی ہو تو دید و اس نے قسم کھالی کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس نہیں لی کسی نے جھوٹ موٹ میرا نام لے دیا ہے آپ کو یقین آ گیا اور لوگوں سے کہا کہ اس نے نہیں لی وہ تو قسم کھاتا ہے۔ یہاں تو وہ قسم کھا کر بری ہو گیا مگر خدا تعالیٰ سے کیونکر چھوٹتا غیب سے اس پر افتاد پڑی اور نقصان پر نقصان اموات پر اموات ہونے لگیں سمجھ گیا کہ یہ حضرت کے سامنے جھوٹی قسم کھانے اور ان کو تکلیف پہنچانے کا وبال ہے آخر جھک مار کر آیا اور اقرار کیا کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس چرائی تھی میری خطا معاف کر دیجئے فرمایا کہ تو نے قسم کھا کر کہا تھا میں نے نہیں لی۔ کہا میں نے جھوٹی قسم کھالی تھی یہ سن کر حضرت گھبرا گئے اور فرمایا اللہ کسوں (یعنی اللہ کی قسم یہ پرانا محاورہ تھا) مجھے تو آج خیر ہوئی کہ مسلمان جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے پہلے بزرگوں کے محاورات سیدھے

سادے ہوتے تھے اللہ کی قسم کی جگہ اللہ کسوں کہتے تھے تو بعض مادر زاد ولی اور صاحب استغراق آجکل بھی ہوتے ہیں بہر حال ذکر ایسی ہی چیز ہے کہ ہر مسلمان کو لازم ہونا چاہیے مگر بد قسمتی سے آجکل لازم نہیں رہا اس کی بھی ایک خاص جماعت رہ گئی ہے سو اس مضمون کا تعلق ان ہی اہل ذکر سے ہے اس لئے اس کے لئے ایک خاص مجلس منعقد کی گئی ورنہ حقیقت میں یہ مضمون سب مسلمانوں کے لئے عام تھا۔ اب اس کو سن لیجئے وہ مضمون یہ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں رضا چاہئے۔ اور اپنی تجویز کو ان میں دخل نہ دینا چاہیے“ گو یہ بات سب کو معلوم ہے اور اعتقاداً سب ذاکرین اس کو ماننے ہوئے ہیں مگر حالاً کبھی اس میں کوتاہی ہو جاتی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ الوان محبت مختلف ہیں کسی میں الہتاب ہے اور کسی میں خمود ہے یعنی بعض میں طلب کا لون کیفیت عشقیہ و شوقیہ کے ساتھ ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے الہتاب اور اضطراب یعنی سوزش و شورش اور بعض میں انس کے ساتھ ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے خمود اور برودت تو کبھی صاحب خمود اپنے کو الہتاب و احتراق سے خالی دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں محبت سے محروم ہوں کیونکہ وہ محبت کو لون الہتاب کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے پھر عجلت کی وجہ سے اپنے لئے الہتاب کو تجویز کرتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ کسی طرح میرے اندر بھی الہتاب پیدا ہو اور جب کسی حکمت سے حق تعالیٰ اس میں یہ کیفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھ کر مغموں رہتا ہے مگر یہ اس کی غلطی ہے اس نے یہ نہیں سمجھا کہ محبت کا ایک لون برودت بھی ہے پس یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں محبت سے محروم ہوں ہرگز محروم نہیں ہو محبت سے تم بھی حصہ لئے ہوئے ہو۔ مگر اس کا رنگ دوسرا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ محبت سے اپنے کو خالی سمجھنے والا کیا کبھی ایک دن کی نماز بھی ترک کر سکتا ہے اگر کوئی اس کو ہزاروں روپیہ دے اور یہ کہے کہ آج نماز نہ پڑھو تو کیا یہ اس کو گوارا کر سکتا ہے ہرگز نہیں کوئی مسلمان اس کو گوارا نہ کرے گا ہاں شرط یہ ہے کہ صاحب طلب ہو طالب دنیا نہ ہو ورنہ وہ تو ایک پلیسہ میں بھی نماز کو بیچ دے گا ہزاروں کا تو کیا ذکر چنانچہ آجکل بہت مسلمان دین فروش کر رہے ہیں

اور بعض اہل علم بھی اس گناہ میں مبتلا ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ عوام کی دین فروشی تو بصورت دنیا ہوتی ہے وہ گناہ کو گناہ کی شکل میں کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہگار بھی سمجھتے ہیں۔ اور مولوی صاحب کی دین فروشی بصورت دین ہوتی ہے وہ گناہ کو طاعت بنا کر کرتے ہیں غلط فتوے دیں گے اور ٹھونس ٹھانس کسی کلیہ کے تحت میں داخل کر دیں گے۔ ان سے تو وہ عوام ہی اچھے جو گناہ کر کے ڈرتے اور اپنے کو بُرا سمجھتے ہیں اور یہ مولوی صاحب تو طاعت بنا کر ڈرتے بھی نہیں کیونکہ اپنے نزدیک وہ گناہ کو ثنیت کے موافق بنا چکے ہیں شاید اس پر کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ تم نے عوام کی دین فروشی کو علماء کی دین فروشی سے اچھا کیونکر کہہ دیا۔ اور ان کو صاحب خشیت اور مولویوں کو خشیت سے خالی کیونکر بنا دیا حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت تو علماء ہی میں ہوتی ہے۔ جہلا میں نہیں ہوتی چنانچہ حق تعالیٰ اس کی تصریح فرماتے ہیں انما یخشى اللہ من عبادة العلماء اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم خشیت کے لئے شرط ہے علت نہیں ہے۔ اس کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ علم کو علت خشیت سمجھتے ہیں اس لئے اس پر یہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ آیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ کوئی عالم خشیت سے خالی نہ ہو۔ اور کسی مولوی سے گناہ کا صدور نہ ہو حالانکہ اس کے خلاف مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ اشکال پہلے مجھے بھی ہوتا تھا پھر خود بخود قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ اس کا حصر کا مفہوم تو یہ ہے کہ ”لا یخشى اللہ من عبادة الا العلماء“ جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ”لا خشية الا بالعلم“ نہ کہ ”لا علم الا بالخشية“ پس یہ حصر ایسا ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لا صلوة الا بطہور کہ نماز بدون وضو کے نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا جہاں وجود ہوگا وضو کے ساتھ ہوگا بدون وضو کے نہ ہوگا۔ یہ تو مطلب نہیں کہ جب وضو کا وجود ہو تو اس کے ساتھ نماز کا وجود بھی لازم ہو اسی طرح یہاں پر علم شرط خشیت ہے کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے گو وہ مولوی بھی نہ ہو کیونکہ جاہل بھی خدا سے ڈرتا ہے تو اسے کم از کم عذاب ہی کا علم ہے تو خشیت بدون علم کے اس کو بھی نہیں ہوتی باقی یہ ضرور نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں

خشیت لازم ہو کیونکہ علم اس کی علت نہیں اور علت کا وجود تو معلول کے وجود سے مستلزم ہوتا ہے مگر شرط کا وجود مشروط کے وجود کو مستلزم نہیں ہوتا ہاں انتفاء مشروط انتفاء مشروط کو بیشک مستلزم ہوتا ہے سو ایسی نظیر کوئی نہیں دکھا سکتا کہ کہیں خشیت کا وجود بدون علم کے ہو گیا ہو تو علم لو از م خشیت سے ہوا نہ کہ خشیت لو از م علم سے بہر حال اس آیت کی تفسیر میں بہت لوگوں نے غلطی کی ہے اس لئے میں نے متنبہ کر دیا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ علوم معقولہ سے فہم قرآن میں بہت سہولت ہو جاتی ہے چنانچہ شرط اور علت کا نام سنتے ہی طلبہ فوراً سمجھ گئے ہوں گے کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے یہ کام کی بات تھی اس لئے درمیان میں بیان کر دی گئی۔ غرض جو لوگ طالب دنیا ہوں ان کا تو ذکر نہیں مگر طالب حق جو صاحب خمود ہی ہو ہرگز کسی طبع کی وجہ سے نماز کو قضا نہیں کر سکتا پس اس کا اپنے کو محبت سے خالی سمجھنا غلط ہے اگر محبت سے محروم ہوتا تو نماز سے اتنی محبت نہ ہوتی اور طالب ہو کر بھلا محروم کیونکر ہو سکتا ہے میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے

من تقرب الی شبرا تقربت الی ذرا و من تقرب الی ذرا عا تقربت الی باعا

یعنی جو میری طرف ایک بالشت بھر قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس سے قریب ہوتا ہوں اور جو ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں ایک باع یعنی دونوں کھلے ہوئے ہاتھوں کی مقدار اس سے قریب ہوتا ہوں اور یہاں چونکہ طلب موجود ہے تو قصد قرب بھی موجود ہے اور اس پر وعدہ ہے عطا، تقرب کا تو محرومی نہیں ہو سکتی بلکہ یقیناً یہ شخص مقرب ہے۔ گو اس کا تقرب بصورت تنزل ہی ہو اور گو اس کے زعم میں خلود اور محرومی ہو کیونکہ عروج قرب حق کی یہ بھی ایک قسم ہے کہ تنزل کی صورت میں ہو مولانا فرماتے ہیں ۵

گفت پیغمبر کہ معراج مرا نیست از معراج یونس اجتبا

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری معراج کو حضرت یونس علیہ السلام کے

معراج پر ترجیح مت دو ان کا عروج بصورت نزول ہے قرب حق بصورت نزول ہے قرب

حق بصورت عروج پر منحصر نہیں ہے جیسا کہ سجدہ میں قرب بصورت نزول ہے )

قرب نز پستی ببالا رفتن است      قرب حق از قید ہستی رستن است

د قرب حق بلندی اور پستی پر جانا نہیں ہے۔ قرب حق قید ہستی سے خلاصی پانا ہے )  
مولانا نے حدیث لا تفضلونی علی یونس بن متی کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس کے عموم میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو کیونکہ جس طرح قرب حق کی ایک صورت پستی سے بلندی کی طرف جانا ہے اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہے کہ بلندی سے پستی کی طرف جائے قرب حق صورت عروج ہی میں منحصر نہیں بلکہ کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے اگر قرب ہمیشہ بصورت عروج ہی ہوا کرتا تو حق تعالیٰ والسجدوا اقترب نہ فرماتے بلکہ والسجدوا ابتعد فرماتے کیونکہ سجدہ میں تو بلندی کی طرف نہیں جاتا بلکہ بندہ پستی کی طرف جاتا ہے اگر یہ بعد ہوتا تو حق تعالیٰ اسپرواقترب کو مرتب نہ فرماتے حالانکہ نس میں صراحتاً سجدہ کو سبب قرب فرمایا گیا ہے معلوم ہوا کہ قرب کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے پس تم یہی سمجھو کہ تم کو اسی صورت سے قرب عطا ہوا ہے۔ صاحب اگر تم خدا سے دور ہوتے تو وہ طاعات و ذکر کی تم کو کبھی توفیق نہ دیتے اور یہ طلب تمہارے اندر پیدا نہ کرتے۔ یہ مسنون حضرت عابدی صاحب نے بیان فرمایا تھا واقعی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے شبہات کے حل کرنے کے امام تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ فرمایا کہ جو شخص حج کر کے یہ وسوسہ رکھے کہ نہ معلوم میرا حج قبول ہوا یا نہیں وہ بڑا بدگمان ہے۔ اگر حج تعالیٰ قبول حج منظور نہ ہوتا تو وہ تم کو اپنے دربار میں آنے بھی نہ دیتے دور ہی سے دھکے دیدیتے جیسا کہ ہزاروں کربا وجود و سعادت دولت کے حاضری کی توفیق نہیں دی۔ جب حق تعالیٰ نے تم کو اپنے گھر تک بلا لیا تو امید قوی رکھو کہ ان شاء اللہ تعالیٰ حج قبول ہے اور حدیث میں ہے۔ انا عند ظن عبدیابی“ اس قاعدہ سے امید ہے کہ اگر تمہارا حج قابل قبول بھی نہ ہو تو اس گمان نیک کی برکت سے قبول ہو جاوے گا۔

اسی طرح ایک واقعہ ایک ذاکر نے عرض کیا کہ حضرت میں چوبیس ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرتا ہوں مگر کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا۔ فرمایا یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو اس قدر ذکر کی توفیق ہی سبحان اللہ اس سے زیادہ اور کیا حل ہوگا غرض جو شخص طلب میں مشغول ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ میں صرف طالب ہی ہوں اور اسی طلب سے کام کر رہا ہوں بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کو بھی اس سے محبت ہے صاحب حق تعالیٰ ہی کی محبت سے آپ کام کرتے ہیں اگر ان کو محبت نہ ہوتی تو آپ کی کیا مجال تھی جو طلب میں مشغول ہوتے اور ذکر و طاعات بجالاتے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۷

اب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا دُپست  
 دپانی مت تلاش کر دپہلے اپنے اندر پیاس پیدا کرو پیاس کی برکت سے پانی تمہارا اندر سے جوش یعنی پانی کی تلاش کم کرو اور اپنے اندر تشنگی پیدا کرو جہاں تشنگی ہوگی وہاں پانی خود بخود پہنچ جائے گا آگے فرماتے ہیں کہ جس طرح پیاس سے پانی کے طالب ہیں اسی طرح پانی بھی ان کا طالب ہے ۷

تشنگاں گر آب جو بیند از جہاں آب ہم جو ید بعالم تشنگاں  
 دپیاس سے لوگ اگر جہاں سے پانی تلاش کرتے ہیں تو پانی بھی اپنے پیاسوں کو تلاش کرتا ہے ۷

مطلب یہ ہے کہ ہر محب محبوب بھی ہوتا ہے اور ہر طالب مطلوب بھی ہوتا ہے تم تنہا اپنے ہی کو طالب نہ سمجھو بلکہ تمہارا بھی کوئی طالب ہے اور اسی کے طلب کے اثر سے تمہارے اندر طلب پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ۷

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں کیں بہ نسبت ہست ہم این وہم آں  
 (جس کو عاشق دیکھو سمجھ لو کہ یہ محبوب بھی ہے اگر مطلوب اور محبوب نہ ہوتا تو اس کو طلب ہی نہ ہوتی)

پس اتنا فرق ہے کہ تمہارا عشق تو ایسا ہے کہ تم نے دنیا میں غل مچا دیا ڈھول پیٹ دیئے۔ کہ ہائے ہم مرے ہائے ہم چلے۔ تم نے تو ایک شور برپا کر دیا اور معشوق کا عشق

مخفی ہے وہ ڈھول نہیں پیٹتے - فرماتے ہیں :-

عشق معشوقان تہان است دستیر عشق عاشق باد و صد طیل و نقر  
 (معشوقوں کا عشق پوشیدہ ہوتا ہے اور عاشقوں کا عشق ڈھول کی طرح ظاہر ہوتا ہے)  
 بیک عشق عاشقان تن زو کند عشق معشوقان خوش و قرہ کند  
 (لیکن عاشقوں کا عشق ان کو لاغر کرتا ہے اور معشوقوں کا عشق ان کو قرہ کرتا ہے)  
 تمہارے عشق کی شان تو یہ ہے کہ اس سے چہرہ زرد ہو گیا لبوں پر خشکی آگئی  
 اضطراب اور بے چینی بڑھ گئی اور عشق محبوب کی شان عدم تغیر و عدم تاثر ہے۔  
 پس قرہ کند کہتا مجاز ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہاں تاثر اور تغیر نہیں ہے جیسا  
 عاشق کو کیفیت عشق سے تاثر و تغیر ہوتا ہے جیسے گرہ و آہ و زاری و زردی رنگ  
 و رخ و غیرہ۔ اور چونکہ عدم تاثر و عدم تغیر کے لئے عادتاً مخلوق میں قرہ ہی لازم ہے  
 تو مولانا نے بطور کنایہ کے لازم بول کر لزوم کا قصد کر لیا اور یہ کوئی جرم نہیں۔  
 قرآن و حدیث میں ایسے محاورات کا استعمال بکثرت موجود ہے حدیث میں آتا ہے  
 کہ قیامت میں حق تعالیٰ بندہ سے فرمائیں گے۔ ”مرضت فلم تعدنی و اسدطعمک قلم  
 تطعمنی“ کہ میں بیمار ہوا تو میری عیادت کو نہ آیا میں نے کھانا مانگا تو نہ دیا نہیں۔  
 مومن عرض کرے گا ”یا رب کیف اعودک و کیف اطعمک و انت رب العالمین“  
 کہ الہی میں آپ کی عیادت کیسے کرتا اور آپ کو کھانا کیسے کھلاتا آپ تو رب العالمین  
 ہیں اور ان تغیرات سے منزہ ہیں ارشاد ہو گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور اس نے  
 مجھ سے کھانا مانگا سو تو نے اس کی عیادت نہ کی نہ اُسے کھانا دیا اور اگر تو اس کو  
 پوچھنے جاتا اور اس کی خدمت کرتا ”لو جدتني عندہ“ تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا  
 بتلائے یہ مجاز کا استعمال ہے یا نہیں ورنہ کیا حق تعالیٰ پر مرض کا حقیقی اطلاق  
 صحیح ہو سکتا ہے ہرگز نہیں علی ہذا قرآن میں حق تعالیٰ کے روف و رحیم اور غضب  
 و غیرہ کا جو استعمال ہے کیا اس کو حقیقت پر حمل کیا جا سکتا ہے کبھی نہیں علماء نے خود  
 تصریح کی ہے کہ ان صفات کا حل حق تعالیٰ پر غایات کے اعتبار سے ہوتا ہے

نہ کہ مبادی کے اعتبار سے (۱۲)

پھر صوفیہ ہی نے اگر مجاز کا استعمال کر لیا تو کیا قصور ہو گیا ان علماء، خشک سے خدا بچائے کہ خواجواہ صوفیہ پر دھڑا دھڑا کفر کے فتوے لگانے لگے۔ حالانکہ اس سے بڑھ بڑھ کر نصوص میں الفاظ موجود ہیں اور رات دن یہ خود اس میں تاویل کرتے ہیں پھر صوفیہ کے کلام میں تاویل کر لینے اور کنایہ و مجاز پر حمل کرنے سے ان کو کیا چیز مانع ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض صوفیہ سے دین کا ضرر بھی ہوا ہے مگر غیر محققین سے باقی محققین سے کبھی ضرر نہیں ہوا محقق ایک جگہ اگر مجاز کا استعمال کرتا ہے تو دوسری جگہ اس کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں تو مولانا نے عشق الہی کی ایک مثال بیان کر دی اور دوسری جگہ ان تمثیلات سے براہ ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں

اے بروں از وہم و قال ذیل من

خاک بر فرق من تمثیل من

داے وہ ذات کہ ہمارے وہم اور ذیل قال سے بالاتر ہے ہمارے تمثیلات پر خاک ہو اور ہمارے سر پر بھی یعنی جو بے مثل ذات ہے اس کی مثال کیسے ممکن ہوگی) اس کے بعد تمثیل کا عذر بیان کرتے ہیں کہ جب یہ تمام تمثیلات ناقص ہیں تو پھر ان کو بیان کس لئے کیا جاتا ہے۔ تو فرماتے ہیں

بندہ نشکبذ تصور بر خوششت

ہر دم ت گوید کہ خانم مفرشت

(لیکن بندہ کو بدون تصور صبر نہیں آتا ہے اور تصور بدون مثال کے

ممکن نہیں ہے پس ہر وقت اپنی جان کو پیش کرتا رہتا ہے)

یعنی بندہ کو بدون آپ کے تصور کے صبر نہیں آتا اور تصور بدون مثال کے نہیں

سکتا کیونکہ غائب کا تصور کسی نہ کسی صورت ہی سے ہوگا مگر وہ صورت عین حق نہ

ہوگی بلکہ محض مثال ہوگی۔ آخر نمازیں جو تم حق تعالیٰ کا تصور کرتے ہو تو کیا



یہ ذات کا تصور ہے ہرگز نہیں بلکہ مثال کا تصور ہے ورنہ وہ تو درار الورا ثم درار الورا ہے جو بھی مثال خدا کی ہمارے ذہن میں آتی ہے حق تعالیٰ سب سے پاک ہیں۔ اسی لئے صوفیہ یونانیوں کی ترقی کی وجہ سے روزانہ تصور سابق سے توبہ و استغفار کرتے جاتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مثال سابق ناقص تھی اسی کو ایک آزاد صوفی نے اس عنوان سے بیان کیا ہے جو ظاہر میں بہت وحشت ناک ہے واقعی بعضوں کا جی ہی چاہتا ہے کہ ان پر فتوے لگے مگر وہ محض عنوان ہی کے درجہ میں وحشت ناک ہے مطلب وحشت ناک نہیں۔ وہ کہتے ہیں

بیزارم ازاں کہتہ خدائی کہ توداری

ہر روز مراتازہ خدائے دکرے ہست

رہم ایسے جمود سے کہ تیرے تصور میں بے زار ہیں ہمارے تصور میں تو

ہر روز ترقی ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ تم کو ترقی نہیں تم جمود پر ہو اور ہم حق

تعالیٰ کی ہر روز ترقی باطنی کے سبب نئی نئی شان کا مشاہدہ کرتے ہیں

ظاہر میں تو شرک معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہر دن نیا خدا ہے اور تمہارے پرانے

خدا سے میں بے زار ہوں مگر مطلب یہ ہے کہ تم کو چونکہ ترقی نہیں ہوئی اس لئے

ساری عمر ایک ہی مثال سے حق تعالیٰ کا تصور کرنے رہتے ہو اور مجھ کو روزانہ

ترقی ہے اس لئے مجھے ہر دن نئی مثال سے تصور ہوتا ہے۔ غرض مجاز کا استعمال

جس طرح قرآن و حدیث میں ہے یوں ہی صوفیہ کے کلام میں بھی ہے اس سے

متوحش ہونا دلیل ناواقفیت ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے کو صرف طالب ہی نہ سمجھو بلکہ خدا تعالیٰ کو

بھی تم سے محبت ضرور ہے اور اسی محبت کا یہ اثر ہے کہ تم کو طلب دیدی پھر

اپنے کو محروم کیوں سمجھتے ہو پس میں نے حضرت حاجی صاحب کے ارشاد سے مولانا

رومی کے اقوال سے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "من تقرب الی"

ذرا عاقبت الی باعاً“ سے بلکہ یوں کہو کہ حق تعالیٰ سے کیونکہ یہ حدیث قدسی ہے جو حق تعالیٰ کا ہی ارشاد ہے قرآن میں اور حدیث قدسی میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ قرآن متلو ہے اور یہ متلو نہیں ہے۔ یہ ثابت کر دیا ہے کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا تو حیرت ہے کہ یہ شخص باوجودیکہ اس میں آثار محبت موجود ہیں (یعنی طلب اور قصد ۱۲) پھر اپنے کو محبت سے خالی سمجھتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو شراب پلانی گئی ہو مگر زیادہ تیز نہ ہو تو وہ یوں سمجھے کہ مجھے سوڈا پلایا گیا ہے۔ جیسے رڑکی میں اس کا عکس ہوا تھا کہ وہاں ایک مولوی صاحب گئے اور رات کو ایک مسجد میں وعظ کہا اگلے دن ایک تاجر نے ان کی دعوت کی تو یہ اس کی دوکان پر گئے اس وقت وہ تاجر سوڈے کی بوتل پینے کے واسطے کھول رہا تھا۔ پہلے پہل سوڈے کی بوتلوں کی ڈاٹ باہر کی طرف بڑے زور سے کھلتی تھی۔ تو اس کی تیزی سے مولوی صاحب یہ سمجھے کہ شراب پنی رہا ہے۔ آپ نے اس کو نصیحت کی کہ ہم سے محبت کرتے ہو اور شراب پیتے ہو۔ اس نے کہا یہ شراب نہیں ہے بلکہ سوڈا ہے۔ ان کو یقین نہ آیا کہ بھلا ایسا جوش شراب کے سوا بھی کسی چیز میں ہو سکتا ہے۔ اس نے پھر یقین دلایا غرض بڑی مشکل سے ان کو یقین آیا کہ واقعی سوڈا ہی ہے۔ اب اس تاجر نے مولوی صاحب سے بھی کہا کہ ایک بوتل آپ بھی پی لیں اول تو انھوں نے انکار کیا مگر اصرار کے بعد ایک بوتل پی لی۔ تھوڑی دیر کے بعد تاجر نے یہ شرارت کی کہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ جھومتے کیوں ہو کہا یہ تو شراب تھی مجھے اس کا نشہ چڑھنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر میں آپ بھی اسی طرح جھومیں گے۔ بس یہ سن کر مولوی صاحب کا تو رنگ فق ہو گیا اور کہنے لگے اللہ کے واسطے مجھے کسی کو پھری میں بند کر دو تاکہ مجھے نشہ کی حالت میں کوئی دیکھنے نہ پائے۔

لوگ کیا کہیں گے کہ رات تو یہ وعظ کہہ رہے تھے اور اب شراب پینے لگے اور خدا کے واسطے کسی سے کہتا نہیں میں تو پہلے ہی شراب سمجھ کر نہیں بھی اس سے روکتا تھا مگر تم نے دھوکہ سے مجھے پلا دی تاجر نے کہا کہ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا اب ذرا لوگ بھی تو آپ کا تماشا دیکھیں۔ مولوی صاحب رونے لگے اور اس کی بہت خوشامد کرنے لگے تب وہ ہنس پڑا اور کہا مولوی صاحب آپ تو بہت ہی بھولے نکلے کہ ساری بوتل پینے کے بعد بھی آپ کو یہ احتمال باقی رہا کہ شاید یہ شراب ہی ہو میں تو آپ سے ہنسی کر رہا تھا آپ گھبرائیں نہیں بڑی کوشش سے ان کو اطمینان ہوا۔ تو جیسے ان مولوی صاحب نے سوڈے کی بوتل کو شراب سمجھ لیا تھا ایسے ہی بعض سالکین شراب محبت پنی کر یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے سوڈا پنی رکھا ہے صاحب یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم شراب کو سوڈا سمجھتے ہو محض اس لئے کہ اس میں تیزی کم ہے سو یاد رکھو کہ شرابیں مختلف ہیں کسی میں تیزی کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ اسی لئے کسی میں التہاب ہے اور کسی میں نہیں جس میں التہاب نہیں ہوتا وہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھنے لگتا ہے۔ غرض بعض دفعہ محبت ایسی لطیف کیفیت کے ساتھ ہوتی ہے جس کا خود صاحب محبت کو بھی پتہ نہیں چلتا مگر پہچاننے والا پہچان لیتا ہے۔ سو اس حالت میں آپ کو محقق کی بات مان لینی چاہیے۔ اسی محبت کی کمی کے تو ہم پر دو واقعے یاد آگئے۔

ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ نے مولانا محمد قاسم صاحب سے فرمایا کہ میں اپنے اندر حاجی صاحب کی ایسی محبت نہیں پاتا جیسے مریدوں کو شیخ سے ہوا کرتی ہے۔ تو مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کا عملی جواب دیا کہ اول تو اس بات کو طال گئے، ادھر ادھر کی باتیں کرتے لگے تھوڑی دیر میں فرمایا کہ مولانا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ آپ حاجی صاحب سے بھی بڑھے

ہوئے ہیں پس یہ سن کر مولانا گت گویا ہی گھبرا گئے۔ اور فرمایا تو بہ کرو تو بہ کہاں میں اور کہاں حاجی صاحبؒ میں تو ان کی خاک پا کے بھی برا بر نہیں مجھے آپ کی اس بات سے سخت تکلیف پہنچی۔ تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ تو یہ کہتے تھے کہ مجھے حاجی صاحبؒ سے محبت نہیں پھر اتنی تو بہ استغفار اور گھبراہٹ کیوں ہے۔ مولانا نے فرمایا جزاک اللہ واقعی تمہارے اس بات سے مجھے معلوم ہو گیا کہ بہت محبت ہے تو مولانا نے زبانی جواب دیا بلکہ عملی جواب دیا کیوں اس لئے کہ

گرچہ تفسیر زبان روشن گراست لیک عشق بے زباں روشن تراست

(اگرچہ تفسیر زبان کی روشن ہے لیکن عشق تو بے زبان ہی زیادہ عمد تفسیرین کرتا)

بعض دفعہ زبانی جواب سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو بے زبان سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح ایک بار حضرت مولانا مظفر حسین صاحبؒ کا ندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک رئیس نے گڑھی پختہ میں عرض کیا کہ حضرت حدیث میں آیا ہے کہ جب تک آدمی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیوی بچوں اور ماں باپ سب سے زیادہ محبت نہ ہو اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوتا تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں سے زیادہ محبت نہیں ہے بلکہ ان سے کم ہے۔ اس لئے اندیشہ ہوتا ہے۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے بھی اس کا عملی جواب دیا کہ اول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا۔ ان رئیس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں مزہ آنے لگا تو درمیان میں مولانا نے فرمایا کہ آپ کے والد صاحب بھی بڑے اچھے آدمی تھے مجھے ان کی ایک حکایت یاد آگئی بس یہ سن کر وہ رئیس کہنے لگے کہ حضرت یہ بیچ میں آپ نے کیا بات شروع کر دی۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد کا ذکر کیسا وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کیجئے جو اب تک کر رہے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کو تو اپنے والد کا تذکرہ بہت ناگوار ہوا۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

تذکرہ میں کسی کا ذکر کیونکر گوارا ہو سکتا ہے فرمایا تم تو کہتے تھے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ماں باپ سے زیادہ محبت نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں ان کے تذکرہ سے ناگواری کیوں ہوئی۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے مگر وہ ایسی رگہ ریہے میں سرایت کی ہوئی ہے کہ پتہ نہیں پاتا۔ موقعہ پر اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اب تو رئیس صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا مولانا واقعی آپ نے خوب سمجھایا۔ دلائل سے اس طرح سمجھ میں نہ آتا جیسا آپ نے عملاً سمجھا دیا تو حضرت واقعی بات یہی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اگر باپ ماں یا بیوی بچے نعوذ باللہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ بے ادبی اور گستاخی کا کلمہ کہہ دیں تو اس وقت دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے کہ آپ ان کو کچا کھا جائیں گے اور تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔ اگر بیوی بچوں کی محبت زیادہ ہے تو اس وقت وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ موقعہ پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کی محبت نہیں جیسی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ مگر اس کا دعویٰ نہ کرنا چاہیے کہ ہم کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب سے زیادہ ہے بس دل کو تو سمجھا لو مگر زبان سے دعویٰ نہ کرو اور نہ اتنی تو اضع کرو کہ اپنے کو محبت سے خالی ہی سمجھنے لگیو۔ بس یہاں تو خاموشی ہی چاہیے خود کچھ فیصلہ نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو کس کے سپرد کر دو اور جو کچھ وہ فیصلہ کر دے اس پر مطمئن رہو۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتوان گشت بہ تصدیق خرم چند

کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ کہ وہ صلی ہو یا نہیں چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں

بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب کوئی تم سے پوچھے کہ تم کو خدا سے محبت ہے یا نہیں تو

سکوت کرو کچھ جواب نہ دو کیونکہ انکار تو کفر ہے اس لئے کہ اس میں تکذیب ہے حق

تعالیٰ کے قول وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ اور اقرار دعویٰ ہے اور دعویٰ پر

کبھی پکڑ ہو جاتی ہے اور امتحان ہونے لگتا ہے گو تحدث بالنعمة کے طور پر محبت ظاہر کرتا ہے دعویٰ نہیں مگر بعض دفعہ تحدث بالنعمة اور دعویٰ کی صورت ایک ہو جاتی ہے لہجہ کے ذرا سے فرق سے بات بدل جاتی اور تحدث نعمت دعویٰ بن جاتا ہے اور دعویٰ اس طریق میں بہت سخت چیز ہے۔ حضرت سمنون محب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ غلبہ حال میں ان کے منہ سے یہ نکل گیا ہے

فلیس لی فی سواک حظ فکیف ماشئت فاخذتہ

(میرے لئے آپ کے سوا کسی شے میں کوئی لذت نہیں پس آپ ہمارے اس

دعویٰ میں جس طرح چاہیں امتحان کر سکتے ہیں)

کہ مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہیے مجھے آریا لیجئے بس فوراً امتحان شروع ہو گیا اور امتحان بھی ایسا سخت جس کی انسان کو برداشت مشکل ہے یعنی پیشاب بند ہو گیا۔ پیشاب بند ہونے کی ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ الامان سارے طبیب اور ڈاکٹر عاجز ہو گئے مگر کسی طرح بند نہ کھلا کیونکہ وہ تو امتحان تھا اور دعا اس لئے نہ کرتے تھے کہ محبوب رو کھٹے ہوئے تھے۔ بس ان کے دعویٰ کی حقیقت تو ظاہر کر دی پھر خود ہی رحم فرمایا اور ادھر ہی سے دعا کی اجازت ہوئی مگر اجازت بھی اس طرح نہیں ہوئی کہ ان سے کہا ہو یا بلا واسطہ ان کے پاس پیغام بھیجا ہو بلکہ اس طرح اجازت ہوئی کہ رات کے وقت ایک فرشتہ کو حق تعالیٰ نے بھیجا جس نے رات بھر حضرت سمنون کی آوازیں دعا کی سے

خوشتر آں باشد کہ سرد لیراں گفتم آید در حدیث دیگران

(بہتر یہی ہے کہ محبوبوں کے اسرار کسی دوسرے کی زبان سے عیاں ہوں)

سننے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت سمنون ہی دعا کر رہے ہیں صبح کو مریدوں نے آکر عرض کیا کہ حضرت کیا رات کو آپ دعا کر رہے تھے فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہا آپ کی آواز آرہی تھی آپ سمجھ گئے کہ ادھر سے دعا کی اجازت ہو گئی ہے مگر اب بھی خود دعا نہیں کی کیونکہ ادھر سے اجازت بلا واسطہ ہوئی تھی۔ تو آپ نے

بھی بواسطہ دعا کی واقعی محبوب کے انداز بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں جن کو عشاق ہی سمجھتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے یہ

خوبی ہمیں کرشمہ نازم حرام نیست

بسیار شیو باست بتاں را کہ نام نیست

(میں نے سنا ہے)

دخوبی اس کرشمہ ناز و حرام کا نام نہیں ہے بہت سی ادائیں بتوں کی اور ہیں جن کا ابھی تک نام بھی لغت میں نہیں ہے ان کو صرف عاشقوں کا دل سمجھتا اور

حضرت سمون نے اس انداز کو سمجھ لیا کہ جب ادھر سے بواسطہ اجازت دی گئی ہے تو

مجھے بھی بواسطہ دعا کرنی چاہیے ابھی بلا واسطہ دعا کی اجازت نہیں چنانچہ آپ نے

بھی فرشتوں جیسے آدمیوں کو واسطہ بنایا یعنی معصوم بچوں کو بس روز مکتب میں جا

اور بچوں سے کہتے۔ اعوالعمک الکذاب اے بچو اپنے جھوٹے چچا کے لئے دعا

کرو۔ چچا تو اس واسطے کہ عرب میں بڑی عمر والے کو غم ہی کہا کرتے ہیں اور کذاب

اس لئے کہا کہ دعویٰ نباہ نہ سکے۔ تو صاحبو! یہاں دعوے کا کام نہیں اور زیادہ

تواضع بھی اچھی نہیں کہ اپنے کو محبت سے خالی کہنے لگو بس یہاں تو خاموشی ہی

مناسب ہے، واقعی محبت کا راستہ بھی عجیب ہے۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں

ارے یار وجسے کہتے ہیں الفت

قیامت ہے قیامت ہے قیامت

اور ایک عاشق نے عشق کی حقیقت کو خوب ہی بیان کیا ہے یہ

عاشقی چہیست بگو بندہ جاناں بودن

دل بدست زگرے دان و حیراں بودن

دعاشقی کیا ہے کہدو کہ محبوب کا غلام بن جانا اور دل کو اس کے سپرد کر کے خود حیراں رہنا،

بس یہاں تو یہی کرنا چاہیے کہ دل ان کو سپرد کر کے خود حیراں کھڑا مہرے زکا کرے زبا سے

اقرار کرے نہ نفی کرے اس سے اگلا شعر بہت سخت ہے اہل ظاہر اس سے متوحش ہونگے مگر جمع

خاص ہے اور اس سے پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ صوفیہ مجاز اور کنایہ کا استعمال کثرت سے

کرتے ہیں تو امید ہے کہ غلط فہمی نہ ہوگی پھر میں اس کا مطلب بھی بیان کر دوں گا تو استبعاد رفع ہو جائے گا۔ کہتے ہیں ۷

سوی زلفش نظرے کردن درویشیدن ؛ گاہ کافر شدن و گاہ مسلمان بودن  
کبھی تو محبوب کے زلف پر نظر کرنا اور حالت قبض و غم میں مبتلا ہو جانا اور کبھی اس کے  
چہرے کو دیکھنا اور حالت بسط اور لذت وصال میں مسرور ہونا)

اس میں زلف سے مراد تجلیات جلالیہ ہیں اور رخ سے مراد تجلیات جمالیہ اور کفر سے  
مراد فناء ہے اور اسلام سے مراد بقا ہے کیونکہ کفر میں جہل بالتصدیق ہوتا ہے اور اسلام  
میں علم و تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح حالت فنا میں کچھ خبر نہیں رہتی تو وہ مشابہ جہل  
کے ہے اور بقا میں واردات و علوم کا ادراک ہوتا ہے وہ مشابہ تصدیق اسلام کے  
ہے۔ غرض یہاں بولنے چالنے کا موقع نہیں ہے حیرت ہی حیرت ہے۔ بس گلا گھونٹ کر  
حجرہ بند کر کے بیٹھو اور ان کی طرف متوجہ رہو۔ نواب شیفتہ خوب فرماتے ہیں ۷

چہ خوش ست با تو بزمی بہ نہفتہ ساز کردن

در خانہ بند کردن در شیشہ باز کردن

کیا اچھی حالت ہوگی کہ آپ کے بزم میں مخفی راز و نیاز کی باتیں کرنا اور گھر کا دروازہ بند  
کر کے شراب محبت حقیقی کا شیشہ کھولنا اور پینا)

پس سالکین کو چاہیے کہ ہر حالت میں راضی رہیں اور زبان کو بند رکھیں نہ اپنے  
کو صاحب محبت کہیں نہ خالی اور محروم کہیں میں نے بتلا دیا کہ طالب محروم نہیں ہوا  
کرتا دیکھو کہیں تمہارے خالی کہنے پر وہ واقعی خالی ہی نہ کہ دیں اور بالفرض اگر تم  
کو محبت ہی نہ ہو جب بھی خاموش ہی رہو جب محبت تقسیم ہوگی تو تم کو بھی مل جائیگی  
کیونکہ چپکا کھڑے رہنے والے پر بھی رحم آجاتا ہے دیکھو جب مٹھائی تقسیم ہوتی  
ہے تو بعض بچے تو اچھلتے کودتے اور چلاتے ہیں کہ ہمیں بھی دو اور بعض بیچارے  
چپکے کھڑے رہتے ہیں تو ان پر تقسیم کرنے والوں کو رحم آیا کرتا ہے کہ یہ بچہ بیچارہ  
کچھ نہیں بولتا خاموش کھڑا ہے اس کو ضرور دینا چاہیے تو اس کو خاموشی کی وجہ سے



اوروں سے پہلے حصہ مل جاتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض تم میں محبت نہ بھی ہو جب بھی دعویٰ یا نفی سے چلاؤ تمہیں صورت سوال بن کر چپکے بیٹھے رہو ان شاء اللہ تم پر رحم کر کے ایک دن محبت عطا کر دی جائے گی صاحبو! یہ الوان محبت ہیں کسی میں التہاب و اضطراب ہے اور یہ بھی انہیں کا رنگ ہے اور کسی میں جمود و خمود ہے یہ بھی انہیں کا رنگ ہے میں دوبارہ مولانا کا شعر یاد دلاتا ہوں ۷

عشق معشوقاں نہاں است دستیر عشق عاشق یا دو صد طبل و تفریح  
 (عشق معشوقوں کا پوشیدہ رہتا ہے اور عاشقوں کا عشق ڈھول کی طرح <sup>بجارتا ہے</sup>)  
 تو صاحب خمود کو خوش ہونا چاہیے کہ اس کو عشق محبوب کا خاص رنگ عطا ہوا ہے اور ایک حالت تردد و حیرت کی ہے اس پر بھی راضی رہنا چاہیے یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ۷

در تردد ہر کہ او آشفست است حق بگوش او معما گفت است

(جو عاشق خاموش کچھ سوچ رہا ہو تو سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں

کوئی معمہ (راز محبت) کہہ دیا ہے وہ بیچارہ اسی کو سوچتا رہتا ہے)

اس کے کان میں کوئی معما کہہ دیا ہے کہ سوچتے رہو وہ بیچارہ اسی کو سوچ رہا ہے جیسے ہم لوگ آپس میں پہلی کہا کرتے ہیں جس کو دوسرا گھنٹوں سوچتا ہے۔ ایک اور عاشق اس مضمون کو دوسرے عنوان سے کہتے ہیں ۷

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است بر عنذ لیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(پھول کے کان میں آپ نے کیا کہہ دیا ہے کہ وہ مہنس رہا ہے اور بلبل کے کان میں

کیا راز کہہ دیا ہے کہ وہ ہر وقت اشکیا رہے)

تو صاحب ان کے مختلف الوان ہیں کسی کو ہنسنا رکھا ہے اور کسی کو رلا رکھا ہے بس جس وہ ہنسنا تے ہیں وہ رونے کی ہوس نہ کرے اور جس کو وہ رلاتے ہیں وہ ہنسنے کی خواہش نہ کرے جس کو جس حال میں رکھیں راضی رہے خود کچھ تجویز نہ کرے

کہ ہائے میرے اندر الہتاب ہوتا اضطراب ہوتا یا صاحب الہتاب یوں کہے  
کہ میرے اندر برود و خمود ہوتا۔ ان تجویزوں کو چھوڑو میں یہ نہیں کہتا کہ تدبیر  
نہ کرو۔ تدبیر ضرور کرو۔ مگر تدبیر کے یہ معنی نہیں کہ حالت موجودہ سے راضی نہ رہو بلکہ تدبیر کے یہ معنی ہیں کہ  
کسی محقق سے اپنا حال کہدو پھر جو وہ کہے اسکا اتباع کرو۔ اور یہی تدبیر ہے اور جب تک حق تعالیٰ  
خود تم کو بصیرت نہ دے دیں اس وقت تک محقق کا اتباع کرتے رہو اس کے بعد ہنسی کر رہو۔ طالب کو محرومی کا  
دوسرے بھی نہ لانا چاہئے۔ ان شاء اللہ طالب ضرور واصل ہو کر رہیگا یاں یہ ضرور ہے کہ کوئی جلدی ہوتا  
ہے کوئی دیر سے کیونکہ آج اگر کسی پہلوان کی چار سیر خوراک ہے تو ایک بچہ یہ ہوس نہ کرنے لگے کہ میں بھی آج ہی  
سے چار سیر کھانے لگوں تو اسکا انجام یہ ہے کہ دو دن میں ختم ہو جائیگا اس لئے ہر شخص کو اتنی ہی خوراک  
دی جاتی ہے جس کا اس کو تحمل ہے۔

۵ چارپارا قدرت بارہ بر ضعیفقاں قدرہمت کار نہ  
(جانوروں پر بقدر تحمل بوجھ لا دو کمزور لوگوں کو انکی صحت کے اندازہ سے کام پیر کرو)  
۶ طفل را اگر ناں دہی بر جا شیر طفل مسکین را ازاں ناں مردہ گیر  
بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دو گے تو بچہ کو اس روٹی سے مرا ہوا پاؤ گے،  
بچہ کو تو یہی مناسب ہے کہ اس وقت دودھ ہی پیتا رہے پھر جب رفتہ رفتہ بڑا ہوگا اس دن وہ بھی اس  
پہلوان کی طرح سیروں مہتمم کر لیگا۔ جلدی مناسب نہیں تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں خمود و جمود کی جگہ شوق و  
ذوق والہتاب و اضطراب کا رنگ عطا ہو جائے یہ تمہاری غلط تجویز ہے تم کو کیا خبر کہ یہ شوق و  
ذوق کے غلبہ میں تمہارا کیا حال ہوتا اب تو یمان بھی سلامت ہے ممکن ہے کہ غلبہ شوق میں  
تمہارا ایمان بھی رخصت ہو جاتا ہے

تو بندگی چو گدایاں بشرط مردکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم بندگی بشرط مزدوری مت کرو کیونکہ خواجہ بندہ پروری خوب جانتے ہیں)

بس حق تعالیٰ خود ہی ہر ایک کی تربیت اس کے مناسب حال طریقہ سے فرماتے ہیں ہم کو

سمجھنا چاہئے کہ یہ صورت ہمارے لئے تجویز کی گئی ہے یہی بہتر ہے۔ شوق و ذوق بیشک عجیب آثار

ہیں لیکن بعض دفعہ خطرناک بھی ہیں اس لئے ہر ایک کے مناسب نہیں ہوئے قرآن مجید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

پھر قربان ہو جائے آپ کے کہ آپ نے شوق کی دعا بھی فرمائی تو کن قیود کے ساتھ فرماتے ہیں۔  
 "والسائل شوقاً الى لقاءك في غير ضراء مضرة ولا فتنة مضلة یعنی میں آپ کے شوق  
 لقا مانگتا ہوں مگر اس طرح جس میں نہ ضرا مضر ہو نہ گمراہ کن فتنہ ہو لوگ حدیثوں سے تصوف  
 نہیں سمجھتے حالانکہ حدیث و قرآن ہی میں تصوف ہے اور کہیں نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس  
 جگہ شوق کے لئے دو قیدیں بیان فرمائی ہیں ایک یہ کہ ضرا مضرہ نہ ہو میرا ذوق میں اس کی تفسیر  
 ہے کہ اس سے جسمانی تکالیف پیدا نہ ہوں دوسرے یہ کہ فتنہ مضلہ نہ ہو اس میں آپ کے بتلا دیا  
 کہ شوق کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ بعض درجات خطرناک بھی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض  
 دفعہ شوق کے غلبہ سے ایک ضرر تو جسم کا ہوتا ہے وہ یہ کہ جوشش عشق سے بدن گھلنے لگتا ہے  
 جیسے تپ دق سے گھلتا ہے کہ حرارت اندر ہی اندر جسم کو کھا لیتی ہے۔ اور یہ دنیا کو بھی مضر ہے  
 دین کو بھی کیونکہ ترقی مطلوب میں جسم کو بھی بڑا دخل ہے مدعیان تصوف اس کو نہیں سمجھتے وہ یہ  
 سمجھتے ہیں کہ جسم میں جس قدر لاغر و ضعیف ہوگا اسی قدر روح لطیف ہوگی اور ترقی روح  
 سے ہوتی ہے یہ غلط ہے ترقی مطلوب صرف روح سے کبھی نہیں ہو سکتی ورنہ روح تو عالم  
 بالا میں بدون جسم کے پہلے سے موجود تھی اگر ترقی مطلوب کا مدار صرف روح پر تھا تو اس کو  
 جسم میں مقید کر کے کیوں بھیجا گیا بس عالم ارواح ہی میں رکھا جاتا معلوم ہوا کہ ترقی مطلوب  
 کی بعض فرد بدن ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے کیونکہ روح مجرد سے نماز کیونکہ ادا ہوتی نماز  
 تو جسم ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور اگر روح کو بقول متکلمین مادی ہی مان لیا جاوے  
 تب بھی اس سے روزہ مثلاً کیونکہ ادا ہوتا کیونکہ متکلمین بھی اس کے قائل ہیں کہ روح  
 گو مادی ہے مگر نہایت لطیف ہے جیسے ملائکہ سو جیسے فرشتوں کو بھوک پیاس نہیں  
 لگتی اسی طرح روح کو بھی نہیں لگتی تو روزہ کا صدور تو روح سے کبھی نہ ہو سکتا و علی  
 ہذا بہت سے اعمال جسم پر موقوف ہیں اس لئے حفاظت جسم بھی ضروری ہے۔  
 اسی لئے سید العاشقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان یحدک  
 علیک حقاً" اور جو محققین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس ہیں وہ فرماتے  
 ہیں کہ ذکر کو دو دھگھی خوب کھانا چاہیے اور تمام رات نہ جاگنا چاہیے مگر آجکل

جہلا صوفیہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جسم کو مار دو تا کہ خدا جلدی مل جاوے جی ہاں ضرور ملیں گے وہ تو فرماتے ہیں لا تفتلوا انفسکم تو شوق میں ایک ضرر تو یہ ہوتا ہے کہ جسم کو امرات لگ جاتے ہیں جس سے اعمال نہیں ہو سکتے اور جب اعمال نہ ہوئے تو ترقی بھی نہ ہوگی۔ شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرض کی حالت میں زیادہ اعمال نہ بھی ہوں تو اعمال صحت کا ثواب برابر ملتا رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی اعمال پر موقوف نہیں بدون اعمال کے بھی ہو سکتی ہے۔ جو اب یہ ہے کہ حدیث سے تو صرف پہلے اعمال کا ثواب ملنا معلوم ہوتا ہے اس سے ترقی قرب کہاں ثابت ہوتی ہے یہ دعویٰ آپ بدون نص کے کیسے کرتے ہیں اور کسی عمل کا ثواب مل جانا اس کو مستلزم نہیں کہ جو ترقی خود مباشرت عمل سے ہوتی وہی اب بھی ہوگی (دیکھو تین دفعہ قل ہو اللہ پڑھنے کا ثواب پورے قرآن کے برابر ہے تو کیا اس سے یہ لازم آیا کہ تین دفعہ قل ہو اللہ کہنے سے ترقی بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی پورے قرآن کی تلاوت سے ہوئی ہے یا صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس تک ذکر اللہ کرنے کا ثواب حج و عمرہ کے برابر ہے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شخص کو وہی قرب ہوگا جو حج و عمرہ کرنے والے کو ہوتا ہے یہ دعویٰ بلا دلیل ہے) دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حالت مرض میں باوجود قلت اعمال کے ترقی بھی مثل صحت کے ہوتی ہے تو یہ بھی بدون اعمال کے نہیں بلکہ اعمال ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ حالت صحت میں اعمال ہو چکے ہیں اسی کے ساتھ حالت مرض کو ملحق کر دیا گیا اگر ملحق یہ نہ ہوتا تو یہ الحاق کیسے ہوتا معلوم ہوا کہ اصل سبب ترقی اعمال ہی ہیں۔ دوسرا ضرر یہ ہوتا ہے کہ حالت شوق میں بعض دفعہ انسان حق تعالیٰ سے بہت کھل جاتا ہے پھر نہ معلوم کیا کیا بکنے لگتا ہے۔ جیسے بعض اہل ادلال ہوئے ہیں گو ان سے خود مواخذہ نہ ہو مگر اضلال تو ضرور ہوتا ہے کہ دوسرے اس کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی نقص ہے علاوہ ازیں بعض دفعہ غلبہ ادلال میں حد سے نکل کر خود بھی یہ شخص گمراہ ہو جاتا ہے کیونکہ کسی وقت ایسا غلبہ حال نہیں ہوتا جس میں زبان پر قابو نہ ہو مگر زبان سے بے ساختہ کچھ نکل جاتا ہے جس میں یہ اپنے کو معذور سمجھتا ہے اور . . . . .

واقع میں معذور نہیں ہوتا تو مواخذہ میں گرفتار ہو جاتا اور بارگاہ قرب سے نکال دیا جاتا۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوق کی طلب میں یہ دو قیدیں بڑھا دیں سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو جملوں میں معافی کو کس طرح قید فرمایا ہے کہ دو لفظوں میں تمام مضرات سے پناہ مانگ لی۔ غرض غلبہ شوق میں یہ آفات ہیں اس لئے تم اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرو اور اگر تم کو غلبہ شوق نہ عطا ہوا ہو تو سمجھ لو کہ شاید تمہارے لئے غلبہ شوق میں کوئی آفت ہوتی اس لئے خدا تعالیٰ نے تم کو برد و خمود میں رکھا وہی ہر حالت کی حکمتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

آنکس کہ تو نگرمت نمی گرداند او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو کہ تجھے امیر نہیں بناتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ تیری ہی مصلحت کے یہ قلات

ہے کہ تجھے مالدار بنا دیا جاوے کیونکہ تیری مصلحت کو تجھ سے وہ بہتر جانتے ہیں۔)

اور اگر کسی کو شوق کا غلبہ عطا ہوا ہو تو وہ اسی میں راضی رہے وہ خمود و خمود کو طلب نہ کرے ممکن ہے کہ اس کے واسطے یہی ضروری ہو۔ کیونکہ بعضے اجن تو ہوا سے چلتے ہیں اور بعضے اجن آگ سے چلتے ہیں ممکن ہے کہ اس کے اجن کے لئے حرارت ہی کی مناسبت ہو اگر یہ حرارت سے خالی ہو گیا تو کھڑا کا کھڑا رہ جائے گا جیسا کہ حضرت عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

صنارہ قلندر سزوار بمن سنائی کہ درازو دور دیدم رہ و رسم پارسانی

(اے محبوب راہ عشق اور طریق جذب سے ہم کو راستہ طے کر لئے کیونکہ زہد خشاک کا

راستہ بہت طویل نظر آتا ہے)

بہر حال محبت کا ایک رنگ الہتاب ہے اور ایک رنگ خمود بھی ہے۔ بس صاحب خمود بھی اپنے کو محروم نہ سمجھے اب میں ان دونوں نسبتوں کی مثال دیتا ہوں کہ ان میں ایک تو لون چشتیہ ہے (یعنی الہتاب و اضطراب) اور ایک لون نقشبندیہ ہے (یعنی برود و خمود) پس اگر کوئی صاحب حرارت نہ ہو وہ گھبرا ئیں نہیں بلکہ یہ سمجھ لے کہ مجھے لون نقشبندیہ حاصل ہے گو وہ چشتیہ کا مرید ہو کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتیہ ہی پیدا ہوں بلکہ کبھی چشتیہ سے نقشبندی پیدا ہوتے ہیں۔ اور کبھی نقشبندیہ سے چشتیہ پیدا ہوتے ہیں جیسے مرغی کے نیچے بطخ کے انڈے رکھ دو تو بچے بطخ ہوں گے کہ وہ تو ذرا بڑے ہو کر دریا میں تیریں گے

اور ماں کھڑی منہ تکے گی وہ دریا میں تیر نہ سکے گی اور نہ بچے اس کے پاس رہ سکیں گے۔ گو وہ کتنا ہی بلا تھی رہے کیونکہ بطح کے بچوں کو تو دریا ہی سے مناسبت ہوگی گو تربیت مرغی کے نیچے ہوئی ہو وہ اس کے بلانے سے خشکی پر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح چشتی شیخ کے سارے مرید چشتی نہیں ہو سکتے بلکہ بعضے نقشبندی ہوں گے ان کو پانی سے مناسبت ہوگی اور بعضے چشتی ہوں گے ان کو آگ سے مناسبت ہوگی ہاں کوئی قیاس فاسد کرے تو اور بات ہے۔ جیسے ایک احمق شخص نے کسی کو دیکھا تھا کہ وہ کسڑی دکھا کر بھینس کو ڈیو ڈیو کر رہا تھا اس نے پوچھا کہ میاں تم کسڑی کو کیوں دکھا رہے ہو کہا اسے دیکھ کر بھینس کنارہ پر آجائے گی۔ ایک دفعہ ان حضرت کی چار پانی ندی میں بہ گئی تو آپ دوڑ کر گھر سے پیڑھا لائے اور اسے چار پانی کو دکھا کر ڈیو ڈیو کر کے لگے کسی نے کہا کہ میاں یہ کیا کہا کہ یہ چار پانی کا بچہ ہے اسے دیکھ کر وہ چلی آئے گی۔ اسی طرح ایک شخص تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا تھا اس کو چڑھنا ہی آتا تھا اترنا نہ جانتا تھا جب اترنا گیا تو شور کرنے لگا کہ مجھے اتار دو میں گرا لوگ حیران ہوئے کہ کس طرح اتاریں تو بوج بھگڑا کو بلایا اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا بس تدبیر سمجھ میں آگئی اس کے پاس ایک رستا پھینکو چنانچہ پھینکا گیا پھر اس سے کہا کہ اسے کمر میں مضبوط باندھو اس کے بعد لوگوں سے کہا کہ زور سے جھٹکا مارو وہ سسرا نیچے گرا اور گرتے ہی مر گیا لوگوں نے بوج بھگڑا سے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا کہا افسوس ہے کہ اس کا وقت ہی آگیا تھا ورنہ ہم نے تو اس طرح کنویں میں سے بہت سے آدمی نکالے ہیں سو یہ تو قیاس فاسد ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہر شخص کی طبیعت جدا ہے اور اس کے لئے طریقہ تربیت بھی الگ ہے سب کو ایک لاٹھی نہ بانگنا چاہیے۔ یہ میں نے اس واسطے کہدیا کہ شاید کوئی شخص چشتیہ سے مرید ہو اور صاحب حرارت نہ ہو بلکہ صاحب سکون ہو تو وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں تو نقشبندی ہو سکتا ہوں کیونکہ چشتیہ سے مرید ہوں اور نہ چشتی ہوں کیونکہ صاحب سکون ہوں تو بس میں کورا ہی ہوں۔ صاحب کورا تو ہمیں ہے ہاں کورا بیشک ہے کہ اس کے پاس دولت موجود ہے مگر اندھا ہے خوا مخواہ اپنے کو محروم سمجھتا ہے تو یہ غلطی ہے کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتی ہی پیدا ہوں نقشبندی نہ پیدا ہوں بلکہ یہاں ہر ایک سے دونوں

طرح کے رنگ حاصل ہوتے ہیں یہاں اب دودل میں مناسبت ضروری نہیں جیسا کہ ابوت و نبوت ظاہر یہ میں بھی مناسبت تمامہ ضروری نہیں چنانچہ کالے سے گورے اور گورے سے کالے پیدا ہوتے کبھی باپ احمق ہوتا ہے اور بیٹا ذہین کبھی برعکس مگر بعض ایسے جاہد ہوتے ہیں کہ نقشبندی خاندان میں بیعت ہو کر چشتی بننا گوارا نہیں کرتے بعضے چشتی سلسلہ میں مرید ہو کر نقشبندی بننا گوارا نہیں کرتے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نقشبندی کے مرید نے قبض کی شکایت کی حضرت نے اس کو ذکر جہر بتلایا کہنے لگا میں تو نقشبندی ہوں میں ذکر جہر کیونکر کروں فرمایا پھر مت کرو سو یہ محض جہالت ہے۔ صاحب نقشبندی اور چشتی میں حنفیہ شافعیہ کا سا اختلاف نہیں ہے جو حنفی یوں کہے کہ میں امام کے پیچھے فاتحہ کیونکر پڑھوں میرے مذہب میں تو حرام ہے۔ بلکہ ان دونوں میں ایسا اختلاف ہے جیسا اطبا اور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے۔ اب اگر طبیب یونانی کوئی ڈاکٹری دو بتلائے یا ڈاکٹر کوئی یونانی دو اپلائے تو کیا حرج ہے اسی طرح اگر کوئی نقشبندی ذکر جہر کو کسی کے لئے نافع بتلائے یا کوئی چشتی اپنے کسی مرید کو ذکر حنفی بتلائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کوئی تفسیر نہ تھی ہر شخص کے لئے اس کے مناسب تجویز فرماتے تھے کسی کو بالچہر کسی کو بالسر کسی کو تلاوت قرآن کسی کو تکثیر نوافل کسی کو خدمت خلق چنانچہ بعض کے لئے صرف اس کو نافع فرماتے تھے کہ تم اہل خانقاہ کی روٹی گوشت لا دیا کرو۔ پس مشائخ اور طالبین کو ایسا ہوتا چاہیے یہ نہیں کہ نقشبندی خاندان میں داخل ہوئے ہیں تو اب جہر کو حرام سمجھ لیں چاہے کیسی ہی ضرورت ہو یا چشتی ذکر حنفی کو حرام سمجھ لیں چاہے کسی کے واسطے جہر مناسب ہو یا نہ ہو۔ مشائخ کو محقق اور مجتہد ہونا چاہیے پس لوگوں کو مقلد بن کر رہنا چاہیے ان کو اپنی تجویز کا دخل نہ دینا چاہیے پس لوگوں کو تجویز کا غلط ہوتا ہے چنانچہ ایک صاحب مجھے خط میں لکھتے ہیں کہ ہم کو شغل انحد کی اجازت دیدی جائے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ کو اتنی بات حاصل ہے کہ خود اپنے لئے محمول تجویز کر لیں تو پھر کسی سے رجوع کی آپ کو کیا حاجت ہے۔ طب میں بڑا کام تو تشخیص ہی ہے اور تشخیص کے بعد علاج کر لینا کیا مشکل ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس شخص میں فلاں خلط کا غلبہ ہے اور وہ سبب مرض ہے جس کے لئے

مہدات و مفرحات کا استعمال مفید ہوگا تو اس کے بعد جس کا دل چاہے علاج کرے کیا یہ بھی کوئی طریقہ ہے علاج کا تشخیص تو خود کر لیں اور علاج دوسرے سے کرائیں اس طریق میں تو یہ ہونا چاہیے کہ بس حال بیان کر کے مردہ بدست زندہ ہو جاؤ۔ اپنی تجویز اور تشخیص کو دخل مت دو۔ مولانا فرماتے ہیں ۷

چوں گزیدی پیرہیں تسلیم شو، ہچو موسیٰ در طریق خضر و

(جب مرشد کو پکڑ لیا تو اس کے سامنے رائے زنی مت کرو اس کے حکم پر عمل کرو)

مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام کی بات پر عمل کرو)

بعض نسخوں میں غلطی سے پیرہن لکھ دیا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جب خلافت مل جاوے تب پیر کا کہنا ماننا چاہیے اس سے پہلے نہ مانے یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہ دو لفظ الگ الگ ہیں ۷ چوں گزیدی پیر۔ ہیں تسلیم شو۔

کہ جب کسی کو پیر بنا لو تو اب اپنے کو بالکل سپرد کر دو۔ انحد وغیرہ یا کوئی شغل خود بخود تجویز نہ کرو۔ اس مقام پر افادہ جدیدہ کی غرض سے لفظ انحد کی تحقیق بھی بیان کر دینا مناسب ہے۔ بہت لوگوں کا اور پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ لفظ دو حرفوں سے مرکب ہے ان حرف نفی سے جو ہندی لفظ ہے اور حد لفظ عربی سے جس کے معنی ترکیبی غیر محدود ہیں اور یہ خیال تھا کہ چونکہ اس شغل میں جو صورت مسموع ہو جاتی ہے وہ غیر محدود ہے۔ اس لئے اس کو انحد کہا جاتا ہے۔ بعضے اس کو غیبی صوت سمجھتے ہیں اور ملکوتی صوت کہتے ہیں ممکن ہے کہ کسی کے لئے صوت ملکوتی بھی منکشف ہوتی ہو مگر صوت حق تو ہرگز نہیں ہے بعض جہلاء نے اس کو صوت حق سمجھا ہے یہ غلط ہے چنانچہ اس خیال کے لوگوں نے شیخ سعدی کے شعر کی تفسیر اسی صورت سے کی ہے وہ شعر یہ ہے ۷

الست از ازل ہچناں شاں بگوش بفریاد قالوا بلے در خروش

راست کی آواز عاشقوں کے کانوں میں ہے اور ان کا قالوا ابلی کہتا بھی ان کو خوب

یاد ہے یعنی ان کے کانوں میں یہ آوازیں اب تک محسوس ہو رہی ہیں فراموش نہ ہو سکیں)

یہ تفسیر بالکل صحیح نہیں ہے اور اس کو صوت حق سمجھنا بالکل غلط ہے کیونکہ کلام الہی صوت و حروف کے



منزہ ہے شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے عارف اور محقق ہیں فرماتے ہیں مع قول اور الحن نے آواز نے۔ اور یہی علماء اہل سنت کا قول ہے کہ کلام الہی کیلئے صوت نہیں ہوئی اور شغل الحن میں صوت ہوتی ہے پس صوت حق نہیں ہو سکتی حقیقت یہ ہے دراصل یہ صوت ناسوتی ہے جو توج ہو اسے پیدا ہوتی ہے کان بند کرنے سے اندر ہوا محسوس ہو جاتی ہے اس آواز پیدا ہو جاتی ہے بعض لوگوں نے اسکو صوت حوض کوثر کہا ہے اور اس کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کرتے ہیں اول تو اس حدیث کے ثبوت کا حال معلوم نہیں (قال لجام اشار الواعظ صحیح العزیزی فی شرح الجامع الصغیر) اور اگر حدیث ثابت بھی ہو جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ عزیزی نے اسکی تصحیح کی ہے تو وہ تشبیہ پر محمول ہے کہ حوض کوثر کی آواز اس صوت کے مشابہ ہے یہ مطلب نہیں کہ بعینہ یہی صوت حوض ہے یہ تو حقیقت صوت میں کلام تھا لفظ کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں انادی ہے جو ہندی لفظ ہے بمعنی تریم اصل میں شغل جو گیوں کے لیا گیا ہے چونکہ کیسوی پیدا کرنے میں بہت نافع ہے اس لئے بعض مشائخ نے اس کو اختیار کیا تھا اور جو گیوں کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ صوت قدیم ہے اسی لئے وہ اس کو انادی کہتے ہیں مگر وہ لوگ مشرک ہیں ان کی باقابل قبول نہیں اور غالباً مشائخ نے اسی واسطے اس کو انادی سے اسخ کر دیا تاکہ عقیدہ جوگیہ کا ابطال ہو جائے اور ان کا کہنا غلط نہیں کیونکہ غیر محدود کی دو قسمیں ہیں آزی اور ابدی سو مشائخ کی مراد اسخ بمعنی ابدی ہے کہ جانب مستقبل میں یہ غیر محدود ہے۔ چنانچہ اگر عمر بھر کان بند رکھے جائیں تو یہ صوت ختم نہیں ہوتی پس یہ غیر محدود بمعنی لا تقف عند حد ہے اور ابدیت حدوت کے منافی نہیں بلکہ اس کے مناسب ضراب ہے، وہ انکی مراد نہیں خوب سمجھ لو چونکہ یہ کام کی تحقیق تھی اس لئے میں نے اس پر متنبہ کر دیا ممکن ہے بعض لوگ اس غلطی میں پڑے ہوں بہر حال طالب کو خود کوئی شغل تجویز نہ کرنا چاہیے بلکہ ہر طرح اپنے کو شیخ کے سپرد کر دے اور اس کی تجویز میں چون و چرا نہ کرے کیونکہ اس طریق کا زیادہ مدار اعتماد پر ہے بلکہ میں ایک اور بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ طالب کو شیخ کے ساتھ علمی مباحث میں بھی گفتگو نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس میں رد و قدح انکار و اقرار کی صورت ہوتی ہے جو شان طلب کے منافی ہے ہاں طالب کو استاد سے خوب حن و چرا کرنا چاہیے کیونکہ استاد اثر کالات علمیہ کے حل کر نیکیو پہلے سے آمادہ ہو کر بیٹھتا ہے اور شیخ اس کام کے لئے تیار ہو کر نہیں بیٹھتا وہ دوسرے کام کے لئے ہے جہاں عمل کی ضرورت ہے باتوں کی ضرورت نہیں پس شیخ کے ساتھ کان ہو کر رہنا چاہیے اور استاد کے ساتھ زبان ہو کر۔

(ان اشار اللہ باقی آئندہ)

ہمارے مولانا فرماتے تھے کہ ہر طالب علم کے چون و چرا انکند و ہر درویشے کہ چون و چرا کند ہر دورا کچرا گاہ  
باید فرستاد۔ پس شیخ سے استاد کا کام نہ لو سونار سے لو ہار کا کام نہ لو اس کے سامنے لو ہات  
لاؤ۔ بلکہ سوتا چاندی لاؤ تاکہ وہ خوبصورت جھوکے اور کرن پھول اور جھومر تیار کیے تمہارا مکان  
اور سر پر لگا دے پس یہ بڑی غلطی ہے کہ کسی کے پاس طالب بن کر نہ جائیں اور اس کو شیخ بنائیں پھر اس  
سے کام لیں۔ دوسرے صاحبو! ماں سے ماما کا کام نہ لو گو اس میں ایک سیم اور ایک الف زیادہ  
ہو گئے مگر عزت تو گھٹ گئی کیونکہ ماں کو ماما بنانا ذلت سمجھ کرنا ہے۔ لہذا شیخ سے علمی مباحث  
میں گفتگو نہ کرنا چاہیے مگر آجکل طالبین اس کا خیال نہیں رکھتے۔ ہاں گاہے گاہے ادب کے  
ساتھ ہو تو اس کا بھی مضائقہ نہیں یا عرصہ تک پاس رہنے سے دونوں کی طبیعت کھل گئی تو یہ بھی حرج  
نہیں کیونکہ انشراح کے بعد پھر ایک ناز کی سی حالت ہو جاتی ہے اور مقام ناز کے احکام جدا ہیں  
اس وقت جتنا چاہے لو لو اور جو چاہے پوچھو کچھ مضائقہ نہیں اسی کو کہتے ہیں۔

اے خانہ نیاز نہ چلنے سے تو چل یعنی مقام ناز ہے جس چال چاہے چل

مگر ایسے لوگوں کو شیخ کے ساتھ مباحث علمیہ میں گفتگو کرتا ہوا دیکھ کر دوسرا اپنے کو ان پر قیاس نہ  
کریں ورنہ وہی مثال ہوگی جیسے ایک شخص تھا جس کی بیوی اس کی کچھ زیادہ خاطر مدارات  
نہ کرتی تھی ایک دفعہ اس نے ایک لایٹی کو دیکھا جو اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ گھوڑا شوخی میں ادھر ادھر  
مٹہ مارتا تھا اور ولایتی اسکو چمکا کر کہہ رہا تھا کھاؤ بیٹا کھاؤ یہ بوقوت سمجھا کہ شاید کھاؤ گھوڑے کی اس  
ہیبت کو بھی خاطر مدارات میں کچھ دخل ہے دل میں سوچا کہ آج سے ہم بھی اسی طرح کھایا کریں گے  
گھر پہنچ کر بیوی سے کہا کہ آج ہم گھوڑے نہیں گے ہماری اگاڑی پچھاڑی باندھو اور ایک تو بڑے میں  
کھانا بھر کر ہمارے منہ پر چڑھاؤ ہم ادھر ادھر منہ ماریں گے تو تم کہنا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ اس غریب کے  
تمام احکام کی تعمیل کی یہ گھوڑے کی طرح بحالت رکوع کھڑے ہوئے اور دم کی جگہ ایک جھاڑو باندھی  
گئی منہ پر تو بڑا چڑھایا گیا اگاڑی پچھاڑی باندھی گئی اور اب اس ولایتی کے گھوڑے کی طرح شوخی  
کرنا شروع کی اور بیوی کہتی جاتی کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ یہ اور اُپھلے کو دے پیچھے کہیں چراغ رکھا تھا اس سے  
جھاڑو میں آگ لگ گئی یہاں تک کہ بدن کے کپڑوں تک پہنچ گئی اب میاں تو بندھے جوڑے کھڑے تھے

ضمائم کے اطلاع:- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرتے وقت خریداری تمیز ضرور لکھیں۔

وہ کیونکر آگ سے بچتے بیوی بھی ان ہی کی طرح بیوقوف تھی یہ حال دیکھ کر کوٹھے پر جا چڑھی اور محلہ والوں کو پکارا ارے دوڑو میرا گھوڑا جلا۔ محلہ والوں نے دل میں کہا کہ کبھت کو کھانے کیلئے تو ملتا نہیں اس یہاں گھوڑا کہاں سے آیا معلوم ہوتا ہے کہ ویسے ہی شرارت کی چیخ رہی ہے یہ کسے خبر تھی کہ وہ شوہر کو گھوڑا کہہ رہی ہے آخر کار میاں وہیں ہلکر مرٹا ہو گئے یہی حال ناقص کا ہوتا ہے جب وہ اپنے کو کامل پر قیاس کرنے لگے مولانا فرماتے ہیں۔

تازراروئے بساید بچھو ورد چوں نداری گرد بدخونی نگر د

زشت باشد روئے نادیا و تاز عیب باشد چشم تابستا و باز

پیش یوسف نازش و خوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

لے (تاز کے لئے چہرہ مثل گلاب کے پھول کے چاہئے جب ایسا چہرہ نہ ہو تو ناز کے قریب بھی مرت جاؤ۔  
لے بد صورت کا ناز کرنا بڑا معلوم ہوتا ہے جس طرح کہ اندھے کو اپنی آنکھ کا کھلار کھنا بڑا معلوم ہوتا ہے۔  
لے یوسف جیسے حسین کے سامنے کیا ناز کرتے ہو اس کے سامنے تو صرف نیاز اور آہ یعقوبی کرنی چاہئے، یعنی طالب اور مرید مرشد کے سامنے ناز نہ کرے نیاز اور تواضع سے رہے)

طالب کو شیخ کے سامنے نہایت ادب سے رہنا چاہئے اور کسی کو اس کے سامنے بولتا ہوا دیکھ کر اپنے کو اس پر قیاس نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ ایک خاص حالت انشراح پر پہنچ چکا ہے اس کا بولنا اور بحث کرنا سب ادب میں داخل ہے اور تمہارا بولنا بے ادبی میں داخل ہوگا اور بے ادب کا اس طریق میں کچھ کام نہیں ہے

بے ادب را تدریں رہ بار نیست جائے او بردار شد در دار نیست

(بے ادب کے لئے اس راہ میں کچھ حصہ نہیں ہے اس کا مقام دار پر ہے نہ کہ دربار میں ہے)

یعنی بے ادب کی جگہ دار پر ہے (یعنی سولی پر) اور دار کے اندر (یعنی گھر میں) اس کے لئے جگہ نہیں۔ صاحبوزنگوں نے جو شیوخ کے آداب لکھے ہیں وہ لغو نہیں ہیں اور ان تمام آداب کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ حاجی برانہ کو اس کے قلب کو مکدر نہ کرو ورنہ تم کو فیض بھی گد لاہی پہنچے گا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ شیخ میرزا اب رحمت ہے جس کے واسطے سے مکو فیض پہنچتا ہے پس میرزا اب رحمت کو میلانا کرو ورنہ فیض بھی گد لاہو کر آئے گا۔ یہ خلاصہ ہے ان آداب کا مشائخ نے اپنی پرستش نہیں کرائی بلکہ تم کو خاص دمصفا زلال رحمت پلانا چاہتے ہیں اور اس کا یہی طریقہ ہے کہ اس کا دل میلانا کرو پس ایک حق

شیخ کا یہ بھی ہے کہ طالب اپنی رائے اور تجویز کو دخل نہ دے تم یہ مرت سوجو کہ میرے واسطے غلبہ شوق مناسب تھا اور اب تک حاصل نہیں ہوا۔ یا التہاب واضطراب کی مجھے ضرورت تھی اور یہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ بس تم تو اطلاع و اتباع سے کام لکھو جب تمہارے سر پر ایسا شفیق موجود ہے۔ جو یوں کہتا ہے

من غم تو میخورم تو غم مخور  
یر تو من مشفق ترم از صد پدر

(جب میں تمہارا غم کھاتا ہوں پھر تم غم مت کھاؤ، تمہارے اوپر میں تو سیکڑوں بالوں کے زیادہ مہربان ہوں) یہ کھرتم کسی فکر اور سوچ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو حالات سے اطلاع کر کے بے فکر رہو اور اگر

شیخ پر ایسا اعتماد نہیں ہے تو یہ بدگمانی ہے اور

بدگمانی کردن و حرص آوری کفر باشد پیش خوان مہتری

(بدگمانی کرنا اور حرص کرنا ایسے محسن کے سامنے سخت بے ادبی ہے یعنی مرشد سے بدگمانی محرومی) اس کا انجام بجز محرومی کے کچھ نہیں طالب کو شیخ پر اعتماد کلی رکھنا چاہیے کہ یہ جو کچھ بتلاتا ہے اسی میں میرا نفع ہے۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ شیخ محض ہماری تسلی کے واسطے یہ کہہ دیتے ہیں کہ وساوس کا کچھ حرج نہیں ان پر التفات نہ کرو۔ التہاب واضطراب نہ ہونے کا بھی مضائقہ نہیں تم کو مقصود حاصل ہے یا درکھو یہ سراسر بدگمانی اور شیخ پر رہزنی کا الزام ہے۔ ارے شیخ کو تمہاری جھوٹی تسلی کرنے سے کیا ملتا ہے اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ جھوٹی باتوں سے تم کو بھالے کیا تم سے اسکو کچھ جاندا بیٹوانا رہ گئی ہے اس کی تو یہ حالت ہے

در پس آئینہ طوطی صفتم داشته اند  
انچه استاد ازل گفت ہماں میگونم

(آئینہ کے پیچھے طوطی صفت ہوں جو کچھ میرے دل میں حق تعالیٰ الہام فرماتے ہیں میں وہی اصطلاح طوطی کے لئے کہتا ہوں) — وہ تم کو وہی طریقہ بتلاتا ہے جو اس کے دل پر تمہارے مناسب

القا ہوتا ہے و ارشاد انبیا کی تعلیم کی وہی شان ہے جو تعلیم انبیا کی شان ہے کہ

گفتہ او گفتہ اللہ بود  
گر چہ از حلقوم عبد اللہ بود

(اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے دراصل وہ الہام حق ہوتا ہے اگرچہ وہ کلام اسکی زبان سے جاری ہوتا ہے)

اتفاق ہے کہ انبیا وحی سے کہتے ہیں جو قطعی ہے اور اہل اللہ و اراد الہام سے کہتے ہیں جو ظنی ہے

باقی اپنی طرف سے وہ کچھ نہیں کہتے ہیں۔ تم تو یہی سمجھو گو وہ کبھی اجہتا دیکھی کرے اور اگر وہ اجہتا دیکھیں

غلطی کر دیکھا تو خود کبھی مشتبہ ہو کر اصطلاح کر دے گا تم کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے یہ تو اسکی تعلیم کے متعلق گفتگو ہے جو تربیت باطن کے متعلق ہو اور اگر کوئی مسئلہ فقہی اجتہادی ہو تو اس میں بھی شیخ کی غلطی پکڑنے کا ہر طالب کو حق نہیں صرف اہل علم کو حق ہے وہ بھی ادب کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کا ان کو بھی حق نہیں اور اہل علم میں بھی ان کو حق ہے جس سے طبیعت کھلی ہوئی ہو وہ جس طرح چاہیں غلطی پکڑیں کیونکہ ایسے لوگ ادب کے حدود سے نہ نکلیں گے اس طریق میں چلنے رو ٹھٹھنے اور لڑنے جھگڑنے کی تو گنجائش ہے مگر گستاخی و بے ادبی کی گنجائش نہیں نہ اس لئے کہ شیخ کو اس کی وجہ سے اپنی کسر شان کا خیال ہو گا یا تم سے عداوت ہو جائے گی۔ ہرگز نہیں جس پر یہ اثر ہوتا ہو وہ شیخ بنانے کے قابل نہیں کیونکہ

دریا۔ بے فراواں نہ شود تیرہ بستگ عارف کہ بر بخت تنگ آبست ہنوز

دریائے فراواں میں پتھر مارنے سے کوئی اثر نہیں ہوتا جو عارف مخلوق کی ایذا رسانی سے بچیدہ اور متاثر ہوتا ہے (یعنی عقلی طور پر) وہ ابھی مبتدی ہے اس کا پانی ابھی قلیل ہے۔ البتہ طبیعتی اثر سے کامل بھی متاثر ہوتا ہے)

عارف تو اپنے کو سب سے بدتر سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی بے ادبی سے برا نہیں مان سکتا بلکہ یہاں بے ادبی اور گستاخی کی اس لئے گنجائش نہیں کہ اسے شیخ کو بھاری طلب میں خشک ہو جائیگا اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس شخص کو مجھ سے تعلق اور محبت نہیں، کیونکہ طلب و محبت کے لئے کچھ آثار و شرائط ہیں۔ اور بے ادبی و گستاخی ان کی اضداد ہیں اور شیخ کو طالب کے متعلق یہ خیال ہو جاتا کہ اس کو مجھ سے محبت نہیں میرا ب رحمت کے تکرار کا سبب اس پر وہ تم کو اپنی مجلس سے زکا لکر باہر کر دیکھا کہ تم کو طالبین میں داخل ہونیکا حق نہیں۔ ہاں اجنبی بنکر آؤ پھر جتنا چاہو برا بھلا کہو۔ طالب سنگر گستاخی کرنا نفاق اور دھوکہ دہی ہے۔ اور اگر تم عالم نہیں ہو تو پھر فقہی اجتہادی مسائل میں شیخ کی غلطی ہرگز نہ کالو نہ ادب سے نہ بے ادبی سے کیونکہ مسائل اجتہادیہ میں فقہار کا اجتہاد ہوتا ہے۔ تو ممکن ہے شیخ نے کسی دوسرے فقہیہ کے اجتہاد کو راجح سمجھا ہو اس میں تم دخل دینے والے کون ہو۔ اب ختم کے قریب آگیا ہوں خلاصہ میرے بیان کا یہ ہے کہ محبت کے دونوں ہیں۔ ایک الہاب و اضطراب جو نسبت چشتیہ کارنگ ہے اور ایک برودت و خمود جو نسبت نعمتیندیہ کارنگ ہے پس طالب کو ہر حال میں لاضنی اور خوش رہنا چاہیے

اور اپنے کو کسی حال میں محبت کے خالی اور محروم نہ سمجھنا چاہیے۔ درمیان میں اعتماد علی الشیخ کا مسئلہ اسی کی توضیح کے لئے بیان کر دیا گیا تھا۔ اب میں اول وہ آیت پڑھتا ہوں جس میں یہ مضمون منصوص ہے۔ پھر وہ آیت پڑھوں گا جو میں نے تلاوت کی ہے جن سے استشہاد لطیف کے طور پر اس مضمون کو مناسبت کے دراصل آج کا فوروزنجبیل کے متعلق ایک نکتہ میری سمجھ میں آیا جس کے لئے مجھے اپنی کتاب مسائل السلوک دیکھنے کی ضرورت پڑی جس میں آیت قرآنیہ سے مسائل تصوف کو ثابت کیا گیا ہے تو میں اس میں دیکھتا چاہتا تھا کہ کا فوروزنجبیل کے متعلق جو نکتہ میری سمجھ میں آیا ہے۔ کسی صوفی نے اس پر تنبیہ کی ہے یا نہیں کیونکہ مسائل السلوک میں منقول ہے مضامین بھی یکسر تہیں گو زیادہ اپنے ہی اقوال ہیں اور میرے قلب پر جب کوئی بات وارد ہوتی ہے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ سلف کے کلام سے اس کی تائید بھی مل جائے تو چھپا ہے کیونکہ ہمارے علوم وہی قابل اعتبار ہیں جو علوم سلف سے موند ہوں مگر اس وقت جلد دوم نہ ملی اور یہ مضمون اگر ہوتا تو جلد دوم ہی میں ہوتا کیونکہ یہ آیت جس میں زنجبیل کا ذکر ہے جلد دوم ہی میں ہو سکتی تھی۔ جب اخیر کی جلد نہ ملی تو میں نے ویسے ہی بے ضرورت جلد اول کو دیکھا اتفاق سے شروع صفحہ پر ایک اور آیت نکل آئی جس میں یہ مضمون صریح تھا اس کے مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ نص میں صریح ہونے کے بعد کسی کی تائید کی کیا ضرورت ہے اہل علم کو مضامین علمیہ میں وہ لذت آتی ہے کہ کسی چیز میں بھی نہیں آتی جب کوئی تیا علم حاصل ہوتا ہے تو واللہ سلطنت ہفت اقلیم اس کے سامنے گرد معلوم ہوتی ہے۔ جمعی تو کہتے ہیں ۷

تاہدانی ہر کرایزداں بخواند از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

یقیناً جس کو حق تعالیٰ اپنا خاص بناتے ہیں تمام دنیا کاموں سے بیکار فرمادیتے ہیں مگر ۷

نکتہ ہوا مگر تو مجذوب کیا غم و بڑی کار آمدیہ بیکاریاں ہیں )

اب لوگ ان سے دنیا کے خرافات میں شرکت چاہتے ہیں بھلا یہ حماقت نہیں تو کیا ہے۔ بہر حال یہ مضمون صراحتاً مل جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی اور یہ میرا کمال نہیں بلکہ استاد عاکر نے والوں کی کشش ہے۔ کہ ان کے افادہ کے لئے حق تعالیٰ یہ علوم عطا کر دیتے ہیں مشائخ کو غرہ نہ کرنا چاہیے کہ ہمارے اوپر یہ علوم و واردات قائل ہو رہے ہیں۔ صاحب یہ طالبین کی کشش ہے ان کی تربیت کے لئے حق تعالیٰ علوم مشائخ کو عطا فرماتے ہیں جیسے ماں کی پستان میں بچہ کی کشش سے دودھ اترتا ہے۔ اگر بچہ دودھ نہ پئے تو دو چار دن میں چھاتیاں اکڑ کر سوکھ جائیں گی اور دودھ خشک ہو جائیگا۔ اسی طرح طالبین نہ ہوں تو مشائخ پر بھی واردات بند

ہو جائیں مگر یہ بات مشائخ کے سمجھنے کی ہے طالبین یہ اعتقاد رکھیں ان کو مضر ہوگا۔ وہ شیخ ہی کا کمال سمجھیں اپنا کمال نہ سمجھیں (۱۲) بھلا اور تو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انما انا قاسم واللہ يعطی کہ میں تو صرف بانٹنے والا ہوں اور دینے والے حق تعالیٰ ہیں بس یہی اعتقاد مشائخ کو رکھنا چاہیے کہ ہم محض واسطہ فی التقسیم ہیں ہمارا ذاتی کمال کچھ نہیں انما انا قاسم پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حج کو تشریف لے گئے تو بعض خدام بھی ٹھاہولے جن میں سے بعض کے پاس تو زادراہ تھا اور بعض کے پاس کچھ نہ تھا انہوں نے آکر مولانا سے عرض کیا کہ ہمارا بھی حج کو جی چاہتا ہے مگر سامان کچھ نہیں۔ مولانا بڑے خلیق تھے فرمادیتے کہ بھائی چلے چلو جو میرا حال ہی تمہارا حال یہاں تو یہ رنگ تھا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رنگ تھا کہ ایک صاحب نے مولانا سے یہی عرض کیا کہ حضرت میرا بھی حج کو جی چاہتا ہے فرمایا کچھ سامان بھی پاس ہے۔ کہا کچھ نہیں صرف توکل پر چلتا ہوں مولانا نے فرمایا جاؤ بیٹھو بڑے توکل والے ہو بس جس وقت رب لوگ ٹکٹ لیں گے تم بالبو کے سامنے توکل کا پوٹلہ رکھ دینا کہ اس میں ٹکٹ کے دام نکال لو۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ میں کون نبوت تھا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صنا میں رنگ ولایت تھا۔ اور واقعی انتظام تو مولانا گنگوہیؒ ہی کے طرز میں ہے، خود ہننے ایسے توکل والوں کو دیکھا ہے کہ جہاز میں اور مکہ معظمہ جہہ پہنچ کر توکل کے بجائے ان میں محض تائل رہ جاتا ہے بس جہاں کوئی دسترخوان بچھا کر بیٹھا اور یہ متوکل صنا اس کے سر پر سوار ہو گیا یا شیخ لقمہ اتنی عربی تو جہاں ہی سے سیکھ لیتے ہیں میں نے کہا ہاں بھائی تم شیخ ہی کو لقمہ بنا لو اسے ہی کچھ کو کھا جاؤ۔ راستہ میں یہ لوگ بہت تنگ کرتے ہیں اس سفر میں اول کھانا پکانا ہی موت ہے نہ معلوم کس مصیبت سے تو کھانا تیار ہوتا ہے اور جب کھانے بیٹھو تو چار طرف سے یا شیخ لقمہ یا شیخ لقمہ مجھے تو ان لوگوں پر بڑا غصہ آتا تھا کہ جب ان پر نہ حج فرض تھا نہ عت توکل میسر تھا تو یہ آئے کس لئے۔ غرض مولانا محمد قاسم صنا کسی سے انکار نہ فرماتے تھے اس لئے ان کے ساتھ لوگ ہو گئے۔ اب راستہ میں جہاں مولانا کو فتوحات ہوتیں اور ہدایا ملنے تو سب ساتھیوں کو بلا کر تھوڑا تھوڑا تقسیم فرمادیتے کسی نے عرض کیا حضرت اپنے واسطے بھی تو کچھ رکھ لیجئے تو بے ساختہ فرمایا انما انا قاسم واللہ يعطی۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ لطیف ہے کہ میں تو قاسم ہوں (نام بھی قاسم ہی تھا) اور اللہ دینے والا ہے میرے پاس جو کچھ آتا ہے سب ساتھیوں ہی کی غرض سے آتا ہے۔ مولانا کے یہاں ایسے لطیفے کثرت سے رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں کچھ مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی

اور ہم نے سنا ہے کہ مولانا کی مجلس میں کھانا پینا مٹھائی بانٹنا اکثر رہا کرتا تھا۔ کوئی مجلس بہت کم اس سے خالی ہوتی تھی تو ایک دفعہ مولوی محمد فاضل صاحب پھلتی مٹھائی تقسیم کر رہے تھے اخیر میں کچھ بچ گئی تو مولانا فرماتے ہیں۔ الفاضل للقاسم کیا عجیب لطیف جملہ ہے جس کے چند معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بچا ہوا بٹنٹے والی کا ہے دوسرے یہ کہ بچا ہوا مسمیٰ بہ قاسم ہے یعنی میرا تیسرے یہ کہ مسمیٰ بہ فاضل مسمیٰ بہ قاسم کے لئے ہیں۔ لام تخصیص کا ہے یعنی ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہے (مولوی فاضل صاحب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مخلص شاگرد تھے ۱۲) چونکہ مجلس بے تکلفی کی تھی اور مولانا نے مزاج کا موقعہ دیدیا تھا تو مولوی فاضل صاحب نے بھی لطیفہ کا جواب دیا کہا نہیں الفاضل للفاضل والقاسم محروم۔ اس کے بھی چند معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ بچا ہوا مسمیٰ فاضل کا ہے یعنی میرا اور مسمیٰ بقاسم محروم ہیں یعنی آپ۔ دوسرے یہ کہ بچا ہوا اس شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا) اور بانٹنے والا محروم ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ جب شیخ و طالب میں بے تکلفی و انشراح ہو چکا ہو تو پھر مذاق اور دل لگی اور شوخی سب کی گنجائش ہے لیکن ہر ایک اپنے کو دوسرے پر قیاس نہ کرے خیر یہ تو اتنا ناقاسم پر ایک لطیفہ یاد آ گیا تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس مضمون کا صراحتہ مل جانا میرا کمال نہیں بلکہ استدعا کرنے والوں کی کرامت ہے۔ بہر حال اس مضمون کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں صراحتہ بیان فرمایا ہے جو سورہ ہود کی آیت ہے۔ وَلَمَّا أَذَقْنَا آلَاسَانَ مَتَاعَ حَمِيمٍ تَرَعْنَاهَا مِنذَانِهِ لِيُوسِ كَقُورِهِ وَلَمَّا أَذَقْنَا نَاعَهُم مِّنْ بَعْدِ إِسْرَائِيلَ مَسَّةً لِّيَقُولُوا لَوْ أَنَّا كُنَّا نَعْلَمُ السَّيِّئَاتِ عَمَّا كُنَّا نَعْمُوهُ لَنَفْرَحَنَّ بِهَا نَفْرَحًا كَثِيرًا وَالَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَعْرَفَةٌ وَاجْرُكِيْر۔ پ ۲۴۱۲) (توجہ) اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا (اب) وہ اترانے لگتا ہے (اور) شیخی بگھارنے لگتا ہے مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے نہیں ہوتے) ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے انسان کا ایک طبعی خاصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کی حالت یہ ہے کہ اگر ہم اس کو کسی رحمت کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے یہاں رحمت عام ہے رحمت ظاہر و باطنہ دونوں کو کیونکہ اس جگہ اس کو اطلاق کے ساتھ فرمایا ہے اور دوسری جگہ تصریح فرمائی ہے کہ رحمت کی



دو قسمیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے هو الذی اسبغ علیک نعمة ظاہرة و باطنة کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اپنی نعمتوں کو کامل کیا ہے ظاہری بھی اور باطنی بھی نعمت ظاہرہ کے معنی یہ ہیں کہ محسوس ہو اور باطنہ وہ ہے جو محسوس نہ ہو۔ خواہ دینی نعمت ہو یا دنیوی نعمت باطنہ دینیہ کی مثال تو شوق و ذوق وغیرہ ہے ایسے ہی انس واطمینان وغیرہ رنگ مختلف ہیں کسی نعمت کا رنگ کیفیت عشقیہ جذبہ کے ساتھ ہے اور کسی کا سلوک و معرفت عقلیہ کے طور پر باقی نعمت ہونے میں دونوں برابر ہیں اور نعمت باطنہ دنیویہ کی مثال عقل و شعور و ادراک و تیز و ذکاوت و عظمت و علم وغیرہ ہے۔ بہر حال یہاں نعمت باطنہ سے اصطلاح تصوف تو مراد ہے نہیں مگر صوفیہ جن کو نعم باطنہ کہتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ضرور ہیں گوان میں انحصار نہ ہو اور مٹا کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رحمت غیر مکتبہ موہوبہ مراد ہے جس میں اختیار انسان کو دخل نہ ہو کیونکہ نعمت مکتبہ اختیار کے سلب پر رنج کرنے کی ممانعت نہیں نہ اس پر یہ وعید ہے مثلاً کوئی شخص نماز پڑھتا روز رکھتا ہے پھر کسی دن یہ نعمت سلب ہو جائے کہ نماز روزہ فوت کر دے تو اس پر رنج ہوتا چاہیے اور اس رنج کرنے پر کوئی وعید نہیں ہے یہ وعید تو رحمت موہوبہ غیر مکتبہ کے سلب پر رنج و پریشانی کرنے کے متعلق ہے چنانچہ منارحمتہ اس کا قرینہ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور غیر اختیار پر مواخذہ نہیں ہے نہ سلباً نہ وجوداً۔ اگر کوئی نعمت موہوبہ بدون اس کے اختیار کے سلب ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا نہ قرب میں کمی ہوگی۔ اور اگر کوئی مصیبت و نعمت بدون اس کے اختیار کے پیدا ہو جائے تو اس پر بھی مواخذہ نہ ہوگا۔ نہ قرب میں کمی آئیگی بشرطیکہ اپنے اختیار کو ذرا دخل نہ دے مثلاً بڑے بڑے و سو سے از خود آنے لگیں یا کسی مخلوق سے اضطراب عشق ہو جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا اور یہ نہ کہا جائے گا کہ تم کو بے اختیار بھی و سو سے کیوں آئے اور بے اختیار ہی عشق کیوں ہوا بلکہ اگر اس میں اختیار کو دخل نہ دیا جائے تو عشق مجازی بھی رحمت ہو جاتا اور عشق حقیقی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ غرض عدم اختیار کی صورت میں نعمت بھی نعمت ہے اور جیسے امراض جسمانی میں اجر ملتا ہے کیونکہ ان سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح امراض باطنیہ میں بھی اجر ملتا ہے اگر ان کے بڑھانے کی کوشش نہ کرے بلکہ ازالہ و امانہ کی فکر کرے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۷

عاشقی گوتریں ستر و گزراں سرست ۶ عاقبت مارا بدار شہر بہرست

(عشق مجازی پر اگر صبر کیا جائے اور ہر طرح سے تقویٰ کا اہتمام ہو تو یہ عشق حقیقی کی طرف راہبری کر دیتا ہے۔

بشرطیکہ اپنے اختیار سے یہ عشق مجازی نہ اختیار کیا گیا ہو)

اور یہی مطلب مولانا جامی کے اس ارشاد کا ہے ۵

مناب از عشق رو گر چہ مجازی است کہ آں بہر حقیقت کار سازی است

(عشاق مجازی جو بدون اختیار ہو جائے گھبراؤ مت کہ اسی حق تعالیٰ کی محبت اور اہل اللہ کی محبت سمجھ میں آ جاوگی بشرطیکہ خدا شرع

کوئی کام نہ کرو بس صبر سے کام لو)

اگر اول الف باتا نخوانی ؛ ز قرآن حرف خواندن کے توانی

(اگر تم الف یا نہ پڑھو گے تو آگے قرآن پاک کس طرح پڑھو گے)

یعنی اگر بے اختیار عشق مجازی کسی میں پیدا ہو جائے تو اس میں گھبرائے نہیں کیونکہ اس درجہ میں وہ بھی کام

کی چیز ہے۔ اگر احتیاط رکھے تو وہ عشق حقیقی کا زینہ بن جاتا ہے باقی یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عشق مجازی

کو از خود پٹالو بلکہ اگر لپٹ جائے تو اس سے کام لو چنانچہ شیخ سعدی از خود پٹالنے کی توصیف صاف

نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ۵

سوم باب عشق مست و مستی و شور ؛ نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

(تیسرا باب عشق مستی غیر اختیاری کا ہے نہ وہ عشق جو فسق ہوتا ہے اور قصد کسی سے کیا جاتا ہے)

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو گلستان و بوستان میں عشق مجازی کی کچھ حکایتیں لکھی ہیں اس سے

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نخواستہ شیخ بھی آجکل کے لوگوں کی طرح عشق باز اور مردوں کو گھونڈنے والے

تھے اور وہ عشق مجازی کو مطلقاً اچھا کہتے تھے یہ بالکل غلط ہے۔ شیخ نے جہاں کہیں عشق مجازی کی مدح کی ہے

یا ایسے عشاق کی حکایتیں لکھی ہیں اس کے مراد وہی عشق ہے جو از خود بلا اختیار لپٹ جائے۔ چنانچہ باب

عشق کے شروع ہی میں فرماتے ہیں۔ ع۔ نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں ۵

نداوند صاحب دلاں دل بہ پوست و گرا بلہے داد بے مغز اوست

(اہل دل ہرگز کسی غیر اللہ کو دل نہیں دیتے نہایت بے وقوف اور بے مغز لوگ ہی عشق مجازی میں مبتلا ہوتے ہیں)

وہ تو ایسے شخص کو جو از خود مخلوق کو دل نہ سے ابلہ اور بے مغز فرما رہے ہیں۔ پھر وہ اس کی طرح

یا تعلیم کیونکر کر سکتے ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں ۵

مکن بد بہ فرزند مردم ز گاہ کہ ناگاہ فرزندت آید تباہ

رکسی کے لڑکے کو بری نظر سے مت دیکھو ورنہ تمہارے لڑکے کو دوسرے لوگ بری نظر سے دیکھیں گے )  
 واقعی جو شخص دوسروں کی اولاد سے برا تعلق رکھتا ہے دوسرے بھی اس کی اولاد سے ایسا ہی تعلق  
 کرتے ہیں۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ میرا لڑکا لوگوں سے محفوظ رہے تو اس کو چاہیے کہ دوسروں کی اولاد  
 سے برا تعلق نہ رکھے۔ بہر حال شیخ امر دیرست نہ تھے جیسا کہ جاہلوں کا خیال ہے انہوں نے تو ایک جگہ ایک  
 امر دیرست کی حکایت بطور ذم کے لکھی ہے کہ بقراط کا ایک زہد پر گذر ہوا جو بیہوش پڑا تھا بقراط نے  
 پوچھا کہ اسے کیا ہوا یہ کیوں پڑا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ایک حسین لڑکے کو دیکھ کر اسے نور خداوندی مشاہد  
 ہوا تو وجد سے بیہوش ہو گیا۔ بقراط نے کہا کہ اس کو امر دہی میں خدا کا نور نظر آیا میرے اندر نہ نظر آیا یہ  
 جھوٹا ہے۔ محض نفس کی شرارت سے یہ اس پر عاشق ہوا ہے۔ اگر قدرت خدا کے مشاہدہ سے عاشق ہوا  
 ہوتا تو اس کی نظر میں امر داوڑا ڈاڑھی والا دونوں برابر ہوتے اور گو بقراط کا قول خود کوئی حجت نہیں مگر فلسفی  
 کے قول کی تائید محقق کوئی کر دے تو اس کو صحیح کہا جائیگا چنانچہ اس حکایت کو نقل کر کے شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ  
 محقق ہماں بیند اندر ابل ؛ کہ در خو برویاں چین و چگل

(محقق تو اونٹ میں بھی وہی جمال حق دیکھتا ہے جس طرح اور مخلوق کے حسن کو آئینہ جمال جمال حقیقی سمجھتے ہیں  
 لیکن غیر محقق عشق مجازی میں دھوکہ سے پڑ جاتا ہے اور اس طرح وہ فسق میں مبتلا ہو کر تباہی کے قعر میں گر جاتا ہے)  
 بہر حال مشائخ نے جس عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زنیہ وہ ہے جس کا نہ حدود اختیار ہے نہ بقا اختیار  
 ہے یعنی نہ اس کو اختیار سے پیدا کیا گیا نہ اختیار سے باقی رکھا گیا ہے کہ نہ تو محبوب کے دیکھنے کو جاتا ہے نہ  
 اس کی آواز سننے کا قصد کرتا ہے نہ سامنے آنے جانے پر قصد نظر کرتا ہے نہ ارادہ سے اس کا خیال لاتا ہے  
 اگر ایسا کرے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد حق تعالیٰ کا عشق اس کے قلب میں جوش زن و موج زن ہوگا  
 اور یہ بھی نہ ہو تو یہ شخص بڑا مجاہد ہوگا۔ مجاہد بھی اصل ہے اور ایک حدیث اس کے متعلق مشہور ہے گو  
 صحت کا حال معلوم نہیں جس میں اس کو شہید کہا گیا ہے۔ عن عشق فکتو وعف فمات فہو شہید  
 قلت قال فی الدار المنتشرة له طرق من حدیث ابن عباس قلت اخرجہ الحاکوفی تاریخ  
 نيسابور والخطیب فی تاریخ بغداد وابن عساکر فی تاریخ دمشق واخرجہ الخطیب  
 ایضاً من حدیث عائشہ بلفظ من عشق فعف ثم مات مات شہید او اور الدیلمی بلا اسناد  
 عن ابی سعید العتق من غیوریتہ کفارة للذنوب اھر ص ۲۰۸ - ۱۲ جامع )

اس میں دو شرطیں بیان کی گئی ہیں ایک عفت جس کے معنی ہیں معاصی سے بچنا اور معاصی کی چند مثالیں میں نے بیان کر دی ہیں جن سے عشق سے بچنا ضروری ہے۔ دوسری کتمان یعنی عشق کو چھپانا یہ اس واسطے ضروری ہے تاکہ دوسرے کی (یعنی محبوب کی) بدنامی نہ ہو خصوصاً اگر عورت کے عشق ہو جائے تو وہاں کتمان بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لوگوں کے گمان بہت دور دور پہنچتے ہیں کہ شاید دونوں میں ملاقات ہوئی ہوگی۔ پھر اس سے عورت کی بہت بدنامی ہوتی ہے اور کسی کو بلا وجہ بدنام کرنا یا بدنامی کا سبب بننا گناہ ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جب عشق مجاز میں گھٹ گھٹ کر مرجانا شہادت ہے بوجہ تحمل مشقت شدیدہ کے تو عشق حقیقی میں گھٹ گھٹ کر مرجانا شہادت کیوں نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی عشق مجازی سے مشقت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ جو نسبت شوقیہ ہے یہ آگ جیسی ہے، دل کو بھون کر رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ۵

”غلام آن کلماتم کہ آتش افروزد“۔ اسی لئے نسبت چشتیہ کبھی آگ کی صورت میں کشف ہوتی ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجلی گر پڑی۔ ایک شخص نے مولانا محمد قاسم صناعی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرا پر بجلی گری۔ فرمایا مبارک ہو نسبت چشتیہ حاصل ہوگئی تو جو اس میں مرجائے وہ حریق تار کے مشابہ ہے اور نسبت سکون پانی جیسی ہے جو نہایت ٹھنڈی ہوتی ہے چنانچہ کبھی اس کا انکشاف بارش کی شکل میں ہوتا ہے کبھی دریا کی شکل میں اسی واسطے نقشبندیہ پانی کا مراقبہ بتلایا کرتے ہیں کہ یوں تصور کرے کہ گویا قلب پر عرش سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہم محمد اللہ دونوں کے یہاں گئے ہیں چشتیہ کے پاس بیٹھ کر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگ برس رہی ہے ان کی باتوں سے اور توجہ سے حرارت بڑھتی تھی اور بچپن میں مولانا رفیع الدین صاحب کے حلقہ میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ نقشبندی تھے بعض دفعہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قلب پر برون رکھ دیا ہوا اور یوں خیال ہوتا تھا کہ شاید فرشتوں میں بھی ایسی ہی برودت و سکون کی کیفیت ہوگی جیسی اس وقت ہمارے اندر ہے اور جس طرح آگ سے کبھی موت کی نوبت آجاتی ہے اسی طرح پانی کبھی بھی ڈبو دیتا ہے چنانچہ سکون و انس کے غلبہ سے بعض دفعہ استغراق پیدا ہو جاتا ہے جس میں انسان تدبیر بدن نہیں کر سکتا نہ کھانے کے ہوش رہتے ہیں نہ پینے کے اس کا وہی حال ہوتا ہے جو پانی میں ڈوبنے والا کا ہوتا ہے کہ گھٹ گھٹ کر جان دیتا ہے۔ غرض غلبہ ہر کیفیت کا قاتل ہے پھر یہ لوگ شہید کیوں نہ

ہوں گے ضرور ہوں گے تو اب سالک کو کسی حال میں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ خواہ غلبہ شوق ہو یا غلبہ انس ہو ہر حال میں راضی رہے ایک دن وصول ضرور میسر ہوگا اور نہ بھی ہو اور یوں ہی طلب میں گھٹ گھٹ کر رہ گیا۔ خدا کے راستہ میں اگر جان بھی جائے تو کیا ہوا پھر اس وقت یہ شہید ہوگا اور شہید بھی وصل ہوتا ہے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ نسبت چشتیہ آگ کے مشابہ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ چشتیہ میں برودت نہیں ہوتی یا نقشبند یہ میں حرارت نہیں ہوتی بلکہ دونوں نسبتیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں جیسے جسم میں حرارت و برودت دونوں ساتھ ساتھ مجتمع ہوتی ہیں۔ البتہ غلبہ ایک کو ہوتا ہے چشتیہ میں حرارت کا غلبہ ہوتا ہے۔

اور نقشبند یہ میں برودت کا دورے لے کر شراب پی رکھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شراب میں پانی کا جزو بھی ہوتا ہے لیکن چشتیہ کی شراب میں تو سنکھیا ملا ہوا ہے جس سے حرارت بڑھ جاتی ہے اور نقشبند کی شراب میں ایون ملا ہوا ہے جس سے برودت کا اثر غالب ہو گیا عارف فرماتے ہیں

ازاں ایفوں کہ ساقی می در افگند      حریقاں رانہ سرماندہ دستار

معلوم ہوتا ہے کہ شراب میں ایون ملانے کا رواج تھا تو نقشبند یہ کی شراب ایسی ہے اور ظاہر ہے کہ ایون کے مل جانے سے گو عارض برودت کا غلبہ ہو گیا مگر شراب کی حرارت بالکل زائل نہیں ہو گئی اور یہ فرق بھی دونوں نسبتوں میں ابتداء اور توسط میں نظر آتا ہے اور انتہا میں تو اہل شوق بھی اہل انس ہو جاتے ہیں یعنی چشتیہ بھی نقشبندی بن جاتے ہیں جیسے ہنڈ یا ابتدا میں کھد کھد کرتی ہے اور پکنے کے بعد خاموش ہو جاتی ہے۔ پس اخیر میں چشتیہ کی حالت بھی سکون کی ہو جاتی ہے مگر حرارت زائل نہیں ہوتی بلکہ قوت ضبط بڑھ جاتی ہے پہلے اوپر بھی اثر تھا اب اندر ہی اندر کام کرتی ہے چنانچہ ایک بار حضرت جنید رحمۃ اللہ کی مجلس میں کسی نے کوئی شعر پڑھا جس پر بہت لوگوں کو وجد ہوا مگر حضرت جنید ویسے ہی سکون کے ساتھ بیٹھے رہے کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو وجد نہیں ہوا تو فرمایا۔ و توی الجبال تحسیرھا جامدۃ وہی تمر مر السحاب۔ یعنی قیامت میں تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرو گے کہ وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بالوں کی طرح چلتے ہوں گے مطلب یہ تھا کہ حرکت تو ہم کو بھی ہو رہی ہے مگر دوسروں کو نظر نہیں آتی ہماری حرکت یہاں کی سی حرکت ہے۔ پھر فرمایا کہ ذرا میرے بدن کو ہاتھ تو لگاؤ بس ہاتھ لگانا تھا کہ خواب کوارہ جسم سے نکل پڑا معلوم ہوا کہ آپ پر بھی وجد کا اثر بہت سخت ہوا تھا مگر

کسی کے دل میں رہی اور کسی کے پار گئی

غرض جب حدیث میں عشق مجازی پر صبر کرنے والے کو شہادت کی بشارت دی گئی ہے تو عشق حقیقی کی تکالیف پر صبر کرنا شہادت کیوں نہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ کلفت باطنی کلفت ظاہری سے اشد ہے۔ ایک محقق فرماتے ہیں ۵

اے تراخارے بیانشکستہ کے دانی کہ چسیت حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورتد  
(اے شخص تیرے پاؤں میں تو کانتا بھی نہ چھبھا تو کیا جانے اس شیروں کو جو تلواروں کی بلا کو سر پر کھاتے ہیں)  
اور شیخ سعدی فرماتے ہیں ۵

خوشا وقت شوریدگان غمش اگر تلخ بینند و گمر ہمیش  
(کیا اچھا وقت ہوتا ہے کہ محبوب حقیقی کے غم سے شوریدہ حال ہیں اگر تا موافق حالات ہوتے ہیں تب بھی خوش ہیں اور اگر موافق حالات ہیں تب بھی خوش ہیں)

گدایان از بادشاہی نقور بامیدش اندر گدائی صبور  
(اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کو دیکھو کہ بادشاہت کی نفرت کئے ہوئے اور حق تعالیٰ کی رضا کی امیدیں بحالت گدائی مضامین)

دامدم شراب الم درکشند و گرتلخ بینند دم درکشند  
(ہر وقت دنیا کے رنج و غم کھاتے ہیں اور ان تلخیوں کے باوجود صبر و شکر سے رہتے ہیں)  
ان کے قلب پر اللہ ہر دم آ رہے چلتے ہیں اور دم بخود رہتے ہیں یہ تو نقش بند یہ کا حال ہے آگے فرماتے ہیں ۵  
سماع اے برادر یگویم کہ چسیت چو طاقت نماند بدانم کہ کیست  
(سماع اے بھائی بتاؤں کہ کیا چیز ہے مگر سماع سننے والوں کو میں جانتا ہوں کہ کون ہیں)

آگے فرماتے ہیں ۵

بہ تسلیم سرد گر گیاں برتند چو طاقت نماند گر گیاں درتند  
(حالت تسلیم سے سرد گر گیاں ہوتے ہیں اور جب تسلیم کی طاقت نہیں ہوتی تو گر گیاں پھاڑ ڈالتے ہیں)  
یہ چشتیہ کا حال ہے کہ اول تو وہ بھی ضبط سے کام لیتے ہیں جب طاقت ضبط نہیں رہتی تو ہاتھ پیر مارتے ہیں اور اگر یہ حدیث صحیح بھی نہ ہو تو وہ حدیث تو صحیح ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء امت کی نہرت بیان فرمائی ہے کیونکہ امت میں شہداء بہت ہیں۔ صرف مقتول ہی شہید نہیں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

المطعون شهیداً والمبیطون شهیداً والغریق شهیداً والحریق شهیداً اور ایک روایت میں ہے  
ومن مات بھدم الدار ومن مات بجمجم - او کما قال ای فی النفاس او التحل - یعنی جو  
طاعون میں مرے وہ بھی شہید اور جو پیٹ کی بیماری میں مرے جیسے ہیضہ وغیرہ وہ بھی شہید  
اور جو پانی میں ڈوب جائے وہ بھی شہید اور جو آگ میں جل جائے وہ بھی شہید اور جس پر مکان گر  
پڑے اور دب کر مر جائے وہ بھی شہید جو عورت بچہ کی وجہ سے مر جائے وہ بھی شہید اور جو آگ میں جل  
جائے وہ بھی شہید ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی شہداء ہیں اور میرے نزدیک سب میں علت مشترکہ یہ  
ہے کہ کسی ایسی مشقت کا ورود ہو جس کا تحمل عادتاً دشوار ہو چنانچہ جلتی نظیریں حضور صلی اللہ علیہ  
وسلم نے بیان فرمائی ہیں ان سب میں ایسی مشقت ہے جس کا تحمل دشوار ہے۔ طاعون میں ایک  
آگ سی بدن میں لگ جاتی ہے ہیضہ میں بھی سخت کرب و بے چینی ہوتی ہے ڈوبنے والا اور  
مکان سے دب کر مرنے والا گھٹ گھٹ کر جان دیتا ہے و علی ہذا اور میں بتلا چکا ہوں کہ نسبت  
چشتیہ تار کے مشابہ ہے اور نسبت نقشبندیہ پانی کے مشابہ ہے اور شوق کی آگ اور انس کی بروقت  
ظاہری آگ پانی سے اشد ہیں تو یہ بھی حریق و غریق کے مشابہ ہیں بلکہ یہ کہتا بھی بیجا نہیں کہ مقتول  
بالسیف کے مشابہ ہیں کیونکہ مقتول بالسیف کے شہید ہونے کی بھی تو یہی علت ہے کہ اس نے ایسی  
مشقت کا تحمل کیا ہے جس کا تحمل عادتاً دشوار ہے اور اس علت کا قرینہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ  
وسلم نے مقتول کے علاوہ اور بہت سوں کو شہید فرمایا ہے معلوم ہوا کہ مقتول کی شہادت کسی  
علت سے معلل ہے اور چونکہ وہ علت ان نظائر میں بھی موجود تھی اس لئے ان کو بھی مقتول  
کے ساتھ ملحی کر دیا گیا اور میں بتلا چکا ہوں کہ ان سب میں علت مشترکہ بھی ہے یعنی ورود مشقت  
شدیدہ یتعذر تحملها عادتاً اور جب حکم معلل ہے تو جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم کا قیاساً ثابت  
کر دینا غلط نہ ہوگا اور عشق حقیقی میں مشاق و آلام قتل بامر سیف سے زیادہ ہیں مقتول بالسیف تو ایک  
دفعہ جان چکا تلوار چل گئی قصہ تم ہوا اور یہاں یہ حال ہے کہ سہ کشتگان شجر تسلیم راہ ہر زمان از غیب  
جان دیگر رست + جن پر کیفیات باطنیہ طاری ہوتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ اپنی کیا گذرتی ہے واقعی  
وہ تو نہ معلوم کتنی مرتبہ جیتے اور مرتے ہیں۔ ایک عارف فرماتے ہیں انتم تخافون المعاصی و تخون  
تخاف الکفر۔ ظاہری تکالیف میں تو جان ہی کا خطرہ ہے اور باطنی تکالیف میں ایمان کا خطرہ ہے اور خطرہ

اور یہ خطرہ سبک شدہ ہے۔ حضرت شبلیؒ نے ایک دفعہ کسی سالک کو چچا ای الصبر اشد کہ بتلاؤ سب سے زیادہ سخت کونسا صبر ہے۔ قال الصبر باللہ قال لا قال الصبر مع اللہ قال لا۔ معنی اس نے کہا صبر باللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ کہا صبر مع اللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ قال فای الصبر اشد اس نے کہا پھر آپ بتلائیں کہ کونسا صبر اشد ہے فرمایا الصبر عن اللہ سے صبر کر لینا زیادہ سخت ہے، اور یہ کہہ کر ایک حج ماری اور بیہوش ہو گئے۔ ہائے (اس وقت مجمع کی عجیب حالت تھی اور حضرت مولانا پر بہت مجمع جلال تھا ۱۲ جامع) اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۵

۱۔ ای کہ صبر نیست از فرزند وزن صبر کے داری ز رت ذوالمنن

۲۔ ای کہ صبر نیست از دنیا ی دوں صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

۳۔ اے شخص تجھے فرزند وزن سے صبر نہ آیا مگر پھر کس طرح تو حق تعالیٰ جیسے حسن سے صبر کئے بیٹھا ہے۔

۴۔ تجھ کو صبر دنیا سے نہیں ہے لیکن حق تعالیٰ سے کس طرح سے صبر آ گیا ہے (

واقعی خدا سے صبر نہیں ہو سکتا اور سبک ہو سکتا ہے اور سالک کو ہر وقت اس کا خطرہ رہتا ہے کہ کہیں

حالت پیدا نہ ہو جاوے اس کو اپنی طلبت ہمیشہ بدگمانی رہتی ہے کہ میرا نذر طلبیگے بھی یا نہیں اور اس غم میں معلوم کتنی

دفعہ ہلاک ہوتا اور جیتا ہے میں دوبارہ وہ شعر پڑھتا ہوں ۵

۱۔ تراخائے بپانشکستہ کے ذاتی کہ چہیت حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورد

۲۔ اے شخص تجھے تو کا نشانہ بھی پیر میں نہ چبھا پھر تجھے اس شہر کا حال کیا معلوم ہو سکتا ہے جو سر پر تلواروں کے

داروں کا تھل کرتے ہیں)۔

۳۔ اے صاحب جس راستے پر وہ چل رہے ہیں واللہ وہ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے ان کی جان پر جو

بنتی ہے اس کی کسی کو کیا خبر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مشائخ بڑے مرہ میں ہیں لوگ ان کے ہاتھ چومتے ہیں تعظیم و تکریم کرتے

ہیں ہدایا و تحائف لاتے ہیں بس یہ سب سے زیادہ بے فکر ہیں اے تم کو ان کے دل کی کیا خبر کہ خدا تعالیٰ کے کیا کیا معاملات

ان کے ساتھ پیش آتے ہیں اور کیسے کیسے خطرات ان پر گذرتے رہتے ہیں بھلا جس کے سر پر تلوار کھڑی ہو اس کو کسی

کی تعظیم و تکریم یا ہاتھ پیر چومنے سے کچھ لطف آ سکتا ہے یہ محض بدگمانی ہے۔ اولیاء اللہ کے ساتھ تو جب ان کی

یہ حالت ہے تو کیا مقتول سیف اور جزیق دغریق تو شہید ہوں اور یہ لوگ شہید نہ ہوں یہ بھی ضرور مقتول

فی سبیل اللہ کی طرح شہید ہیں اور یہ میں قرآن کی تفسیر نہیں کرتا کہ لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات

بل احياء۔ میں اولیاء بھی داخل ہیں بلکہ علم اعتبار و قیاس کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بھی انھیں کے حکم میں



ہیں اور یہ کوئی تہما میری رائے نہیں بلکہ قاضی ثناء اللہ صاحب نے بھی تفسیر مظہری میں شہداء کے ذکر کے ساتھ فرمایا ہے اذکان ہذا حال المقتول بسیف الکفار فکیف بقتیل سیف الجبار کہ جب مقتول سیف کفار کی فضیلت ہے تو جو سیف جبار سے مقتول ہوا ہوا اور تلوار عشق کا کشتہ بنا ہوا اسکی تو کیا کچھ فضیلت ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ میں اس سلسلہ میں متفرد نہیں ہوں بلکہ فیہ سلف سلف میں بھی بعض کی یہی رائے ہے پس طالب کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ ان شاء اللہ وہ ہر حال میں واصل ہے یا شہید یا خواہ نسبت شوقیہ ہو یا نسبت النسیہ ہو ایک صورت میں وہ حریق ہے اور دوسری صورت میں غرق ہے اور دونوں کیلئے بشارت شہادت ہے۔

(یہاں پہنچ کر پھر حضرت مولانا نے کاتب سے ماقبل کا ربط دریافت فرمایا کہ یہ مضمون کس بات پر بیان ہوا تھا اس نے عرض کیا کہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہوا تھا کہ امور غیر اختیار یہ پر مواخذہ نہیں ہوتا فرمایا کہ جامع میں یہ کہہ رہا تھا کہ مواخذہ کا مدار اختیار پر ہے اور بے اختیار کے تو اگر زحمت بھی پیش آئے تو وہ رحمت ہے جیسے عشق مجازی اور وساوس اور خود وغیرہ تو امور غیر اختیار یہ سے انسان کو پریشان نہ ہوتا چاہیے مگر انسان کی عادت یہ ہے کہ یہ رحمت موہو یہ غیر مکتبہ کے سلب سے بھی پریشان ہوتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے اتھ لیٹس کفور کہ ناامید ہو جاتا اور ناشکر ابن جاتا ہے۔ چنانچہ کسی میں التہاب و اضطراب کی کیفیت نہ ہو تو وہ اپنے کو محبت سے خالی و محروم سمجھ کر وصول سے ناامید ہو جاتا ہے حالانکہ یہ کیفیت غیر اختیار یہ ہیں ان کے ہونے نہ ہونے پر کچھ بھی مدار نہیں پھر یہ شخص ناامیدی کے ساتھ ناشکری بھی کرتا ہے کہ جن افعال اختیار یہ کی حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دے رکھی ہے ان کی قدر نہیں کرتا اور ان کو اپنے لئے قرب و اصول کا کافی ذریعہ نہیں سمجھتا۔ ایک عادت تو انسان کی یہ ہے دوسری عادت یہ ہے ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء مسة لیقولن ذہب السیئات عنی کہ اگر پریشانی کے بعد حق تعالیٰ اس کو راحت دیدیں تو بے فکر ہو کر کہتا ہے کہ بس اب تو مجھ سے مصیبت ٹل گئی اور یہ شکر کے طور پر نہیں کہتا بلکہ اس طرح کہتا ہے انہ لفرح فخر یعنی خوش ہو کر اترتا ہے کہ اب تو بلا ٹل گئی بس اب کیا ہے کام مار لیا۔ چنانچہ بعض لوگ مقدمہ دائر ہو سکی حالت میں تو متفکرہ پریشان رہتے ہیں حق تعالیٰ سے دعائیں کرتے اور بزرگوں سے دلیف پوچھتے پھرتے ہیں۔ اور جہاں مقدمہ جیت گئے تو اس کو خدا کی نعمت نہیں سمجھتے بلکہ اتر کر کہتے ہیں کہ صہا ہمارے گواہ بڑے پکے تھے حاکم بڑا سمجھ دار تھا اور ہمارے کیلئے خوب بحث کی تھی یوں کہا اور یوں جواب دیا تھا۔ اس وقت ان لوگوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

حیث کو اپنی سعی و کوشش کا نتیجہ سمجھتے ہیں قبول دعا اور رحمت حق کا نتیجہ نہیں سمجھتے ارے تم کیسا وکیل لئے پھرتے ہو کہیں دوبارہ کیل نہ لگ جائے۔ خدا تعالیٰ کو پھر تمہارا ویسا ہی حال کر دینا کیا مشکل ہے۔ مگر انسان کا خاصہ ہے کہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا اور آئندہ کے لئے بالکل بیفکر ہو جاتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں رَبِّكَ الَّذِي يُزِيجُ لَكُمْ الْفَلَاحَ فِي الْبُحْرِ لِيَتَّبِعْتُمُوهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا وَإِذَا مَسَّكُمُ الضَّرَبُ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مِنْتُمْ سَعْوًا أَوْ أَيَاةً فَلَمَّا نَجَّكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے (قائدہ کے) لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے تو اس وقت خدا کے سوا تمہارے رب معبود (ذہن) سے غائب ہو جاتے ہیں (اور کسی تدبیر پر نظر نہیں رہتی اللہ ہی اللہ یاد رہتا ہے) پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچالے آتے ہیں تو اعراض کرنے لگتے ہیں اور (واقعی) انسان ہے بڑا ناشکرا کہ اتنی جلدی پہلی حالت کو بھول جاتا ہے، آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ تم کو یہ بے فکری کیوں ہو گئی۔ افا مننتھ ان یخسف بکم جانب البراد یوسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوا الکم وکیلہ۔ کیا تم کو کوئی اس سے بھی اطمینان ہو گیا کہ شاید خدا تعالیٰ خشکی ہی میں دھنسا دیں سخت ہوا بھیج دیں پھر تم کو کوئی بھی کار ساز نہ ملے چنانچہ ابھی زلزلہ اور طوفان خشکی ہی میں آگیا تھا کانگریسوں میں بعض ممالک میں کے اندر دھنس گئے اور بہت آدمی تباہ ہو گئے۔ جاپان میں ایسا سخت زلزلہ آیا تھا کہ لاکھوں آدمی مر گئے اور کروڑوں کا نقصان ہوا۔ یہ تو خسف ہی کا نمونہ ہے اور سخت ہوا کا بھی نمونہ آچکا ہے چنانچہ پچھلے دنوں اخبار میں یہ بات آئی تھی کہ ہردوئی میں ایسی سخت ہوا چلی جس سے بعض آدمی اڑ گئے اور کہیں سے کہیں جا کر گرے اور وہ تو خشکی میں بھی طوفان بھیج سکے ہیں چنانچہ ابھی پہاڑوں سے چشمے اُبل پڑے تھے جن سے سخت طوفان برپا ہوا ہزاروں گانوں تباہ اور ہزاروں آدمی برباد ہو گئے اور مویشیوں کا نقصان الگ رہا۔ آگے بڑے مزے کی بات فرماتے ہیں کہ کیا تم کو اس سے بھی اطمینان ہو گیا کہ شاید حق تعالیٰ پھر دریا ہی میں تم کو بھیج دیں کوئی ایسی ضرورت آپڑے جس سے دوبارہ دریا ہی کا سفر کرنا پڑے جس کو ایک دفعہ چکھ چکے ہو ام۱ منتھ ان یعد کوفہ تارة اخرى فیوسل علیکم قاصفا من الویجہ فیغرقکم بما کفرتھم لا تجدوا الکم علینا بہ تبیعا ۱ یہ تو ظاہری مضامین سے بیفکری کا جواب ہے اور باطنی خطرات سے بیفکری کا جواب بھی یہی ہے کہ اگر کسی شخص کو آج کیفیت شوقیہ حاصل نہ تھی پھر حاصل ہو گئی تو وہ بیفکر کس بات پر ہوتا ہے۔ ارے جس خدا نے تم کو پہلے خمود و خمود کے دریا میں ڈرکھا تھا

وہ پھر اسی دریا میں لوٹا سکتا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہ دوسری سخت گھاٹیاں تمھارے رستے میں پیدا کر سکتا ہے کیونکہ جس طرح ظاہر میں دریا اور پہاڑ ہیں دلدل میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ۷

آسماں ہاست در ولایت جساں      کار فرمائے آسماں جہاں  
(روح کی سلطنت میں بہت سے آسمان ہیں اور آسمان جہاں کا کار فرما یعنی حق تعالیٰ کا خاص نور بھی ہے)  
در رہ روح پست وبالہا ہاست      کو ہہائے بلند و صحرا ہاست  
(روح کے راستے میں بہت بلندیوں اور پستیوں میں بلند پہاڑ اور صحرا ہیں)

اور فرماتے ہیں ۷

غیب را ابرے و باکے دیگر است      آسمانے آفتابے دیگر است  
(عالم غیب کے لئے ابر اور باد دوسرے ہیں اور آسمان اور آفتاب وہاں کے دوسرے ہیں)  
مگر وہ دریا پانی کے نہیں ہیں نہ پہاڑ پتھر کے ہیں اور حزب البحر میں جو بحر الدنیا و بحر الآخرة کہا ہے وہ تشبیہ پر محمول ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا ہی بحر ہے جیسا کہ دنیا کا عرض باطن میں بھی جہاں و بحار ہیں جن کو صوفیہ کبھی آیت قرآنیہ کے تحت میں بھی اشارۃً بیان کر دیتے ہیں مگر تفسیراً نہیں بلکہ اعتباراً۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جن چیزوں کا خطرہ حق تعالیٰ نے اس جگہ اہل ظاہر کے لئے بیان فرمایا ہے باطن میں بھی تشبیہاً یہ خطرات موجود ہیں پھر بے فکری کیسی عرض حالات غیر اختیار یہ کے سبب پریشانی بھی مذموم اور ان کے حصول سے بے فکری بھی مذموم ہے۔ اسی کی حق تعالیٰ نے یہاں شریکیت فرمائی ہے کہ انسان ایک حالت میں تو یوس کفور بن جاتا ہے اور ایک حالت میں فرح فرماتا اور دیکھئے ان دونوں میں مقابلہ کیا اچھا ہے ہر حالت کے متعلق ایک صفت باطنی ہے ایک ظاہری ہے۔ سلب رحمت کے وقت تو یاس باطن میں ہوتا ہے اور کفر ظاہر میں اور عطائے نعمت کے وقت فرح باطن میں ہوتا ہے اور فرح ظاہر میں پس دونوں میں عجیب مقابلہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ یہ حالت سب کی نہیں بعضے اس سے مستثنیٰ بھی ہیں الا الذین صبروا و عملوا الصالحات مگر وہ لوگ جو صابر یہاں صبر کے معنی وہ نہیں ہیں جو عوام میں مشہور ہیں کہ کسی کے مرنے پر نہ روئے کیونکہ یہاں کون مرا تھا ہاں کیفیات مگرئی تھیں تو خیر یہ بھی اس کے عموم میں داخل ہی مگر نہ رونے ہی میں صبر کا انحصار نہیں ہے

بلکہ صبر سے مراد استقلال ہے یعنی ان معمولات پر جما رہتا جو شارع اور نائب شارع نے تجویز کر دیئے ہیں ان پر ہر حالت میں پابندی کرنا چاہیے چاہے کوئی کیفیت حاصل ہو یا حاصل نہ ہو نہ کسی کیفیت کے سلب سے پریشان ہو کر معمولات میں خلل ڈالو۔ نہ کسی کیفیت کے سلب پریشان ہو کر معمولات میں خلل ڈالو۔ نہ کسی کیفیت کے حصول سے بے فکر ہو کر معمولات میں کمی کر دینے سے معنی ہیں صبر کے آگے صبر کی علامت بیان کرتے ہیں کیونکہ دعویٰ صبر آسان نہیں کہ جس کا جی چاہے اپنے کو صابر کہنے لگے ۔

و جائزۃ دعویٰ المحبۃ فی الہوے ولكن لا یخفی کلام المناق

(اور محبت کا دعویٰ تو عشق میں جائز ہے مگر منافق کا کلام اور دعویٰ پوشیدہ نہیں رہتا)

بلکہ اس کے لئے کچھ علامات و شرائط ہیں یعنی و عملوا الصالحات کہ اعمال صالحہ بجالاتے رہیں اور ظاہر و باطناً معاصی سے بچتے رہیں جن میں یاس و ناشکری اور بظرف و فخر بھی داخل ہے اور نماز روزہ بھی داخل ہے پس جو شخص اوراد پر اکتفا کر کے طاعات کو بیکار سمجھنے لگے اور یہ دعویٰ کرے کہ اب مجھ کو نماز روزہ کی زیادہ ضرورت نہیں رہی مجھ کو رسوخ نسبت حاصل ہو گیا ہے وہ جھوٹا ہے اس کو رسوخ وغیرہ کچھ حاصل نہیں ورنہ اعمال صالحہ میں کوتاہی نہ کرتا اسی طرح جو شخص طاعات واجبہ پر اکتفا کر کے اذکار و اشغال و معمولات زائدہ کو ترک کر دے کہ ان سے کچھ نفع تو ہوتا ہی نہیں وہ بھی غیر مستقل اور ناقص فی المحبۃ ہے صبر کے معنی یہ ہیں کہ معمولات مستحیہ اور طاعات واجبہ سب کو دواماً ادا کرتا رہے۔ بعض دفعہ آدمی اوراد سے گھبراتا ہے اور دوسری ٹیک کاموں میں اس کا دل لگتا ہے اس وقت اوراد کو ہرگز ترک نہ کرے کیونکہ دوسری طاعات کا شوق جو پیدا ہوا ہے وہ بھی ان ہی اوراد کی برکت ہے اور اگر اوراد کو ترک کر دو گے تو چند روز میں دوسری طاعات کا بھی شوق نہ رہے گا جو پیدا ہوا ہے۔ میں نے ان اہل علم کو لکھا تھا کہ تم جو اوراد سے گھبراتے ہو اور لکھتے ہو کہ مجھے مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ وردہی کا اثر ہو کہ آپ کو مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے یہ جواب بطریق منع ہے مگر محض الزامی جواب نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان طاعات میں باہم علاقہ بھی ہے کہ ایک طاعت دوسری کو قوت ہوتی ہے گو تم کو اسکی

عہ جن کا ذکر شروع و عظیم ہوا ہے انہوں نے اوراد کو جنم روگ بتلایا تھا ۱۲ جامع

خبر نہ ہو ذاکرین اس کو ابھی طرح جانتے ہیں کہ جس دن معمول پورا ہو جاتا ہے اس دن ہر کام میں طبیعت کو بشارت اور نشاط ہوتا ہے اور جس دن معمول تاغہ ہو جاتا ہے اس دن کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اور کاموں میں جو نشاط ہوتا تھا وہ ورد کی برکت تھی مگر غلطی سے وہ شخص یوں سمجھتا ہے کہ مجھے اور کاموں سے خود دلچسپی ہے۔ جی ہاں ذرا اور اد کو چھوڑ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ اور کاموں سے کتنی دلچسپی ہے۔ پس یاد رکھو کہ ان اور اد ہی کی برکت سے نماز میں جی لگتا ہے انہی کے ذریعہ سے تلاوت قرآن میں مزہ آتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اس کا امتحان یہ ہے کہ دو ایسے شخصوں کی حالت کا اندازہ کر کے دیکھو جن میں سے ایک صاحب ورد ہو اور ایک صاحب ورد نہ ہو تو آپ صاحب ورد کو فرائض و واجبات کے ادائیں چست پائیں گے گو خود ورد میں اس کا دل نہ لگتا ہو۔ اور غیر صاحب ورد کو اس کی برابر چست نہ پائیں گے تو کیا ورد کا یہ تھوڑا نفع ہے کہ اس کی برکت سے فرائض و واجبات میں چستی پیدا ہو جاتی ہے۔ پس یہ اور اد بیکار نہیں ہیں بڑے کام کی چیزیں ہیں جمہمی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحبات و سنن کی ترغیب دی ہے بلکہ اگر احادیث کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و واجبات سے زیادہ سنن و مستحبات کی ترغیب و بیان فضائل کا اہتمام فرمایا ہے کیونکہ واجبات کو تو لوگ خود ہی کرتے ہیں ان کے لئے زیادہ ترغیب کی ضرورت نہ تھی اور سنن و مستحبات کا لوگ خود اہتمام نہیں کرتے اور ہیں ضروری بھی اور مفید اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا (جامع) اور اسی واسطے مشائخ نے بھی مستحبات کا بہت اہتمام فرمایا ہے۔ چنانچہ اہل طریق کا ارشاد ہے من کادرد ولد لا وارد له جس شخص کا کوئی ورد نہ ہو اس پر کوئی وارد بھی نہ ہوگا اور یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں حقیقت میں صاحب واردات ہی لوگ ہیں جو اور ادک کے پابند ہیں اور جو لوگ سوائے فرائض و واجبات کے کچھ نہیں کرتے ان پر واردات نہیں ہوتے (الاقلیل) پس خوب سمجھ لو کہ جس طرح فرائض و واجبات کی ضرورت ہے ایسے ہی اور اد کی بھی ضرورت ہے گو دونوں کا درجہ برابر نہیں بلکہ فرائض و واجبات اصل اور اور اد ان کی فرع ہیں مگر اصل کا نفع ان فرع ہی کے ساتھ کامل ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آپ مہل لیتا

چاہیں تو اس کے لئے طیب آپ کو ایک نسخہ لکھ کر دیتا ہے یہ تو اصل مسہل ہے لیکن اس کے بعد وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ دو چار گھنٹہ کے بعد مدد کے لئے سونف کا عرق بھی تم گرم پیتا یا بیخ جلا پایا کوئی گولی کھا لینا تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدد بیکار ہے ہرگز نہیں مدد کی بھی بہت ضرورت ہے ورنہ مسہل میں ضرور کسر زرگی اسی طرح یہاں سمجھو کہ اور دونوں اقل فرائض کے لئے بمنزلہ مدد کے ہیں اس کا نفع اس کے ساتھ مل کر ہی کامل ہوتا ہے پس ان کی پابندی بھی بہت ضروری ہے اور یہی معنی ہیں صبر کے کہ آدمی اپنے معمولات پر مستقل رہے جو شخص ہر حالت میں اپنے معمولات پر جمنا رہیگا اور اعمال شرعیہ کا پابند رہیگا وہ کسی نعمت موہو نہ غیر اختیار یہ کے سلب یا س د کفران میں اور کسی نعمت موہو بہ کے عطا سے فرح و فخر میں مبتلا نہ ہوگا کیونکہ اس کی نظر میں اعمال مکتبہ اختیار یہ مقصود بالذات ہوں گے اور اعمال موہو بہ غیر اختیار یہ مقصود بالذات نہ ہوں گے اور جو احوال موہو بہ کو مقصود بالذات سمجھتا ہے وہ ان کے حصول پر اعمال و معمولات میں اکثر کمی کر دیتا ہے اور سلب احوال پر یا س و کفران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں اولئك لهم مغفرة واجر كبير اس میں اول مغفرت کو مقدم فرمایا اس کا مزہ عشاق سے پوچھو غیر عشاق کو اس کی زیادہ قدر نہ ہوگی وہ تو یہ سمجھیں گے کہ بس صبر اور اعمال صالحہ کا صلہ کیا ملا کہ گناہ بخش دیئے گئے نہ جنت کا ذکر ہے نہ حور و قصور کا مگر عشاق کے دل سے اس کی قدر پوچھو کہ وہ اس کو سنتے ہی زندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو طلب رضا ہی میں مرتے ہیں اور جنت کی طلب بھی وہ رضا ہی کے لئے کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ۷

با تو دوزخ جنت است لے دلربا بے تو جنت دوزخ است لے جانفزا

راپ کے ساتھ دوزخ جنت ہے اور آپ کی جدائی سے جنت بھی دوزخ ہے

اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اول یہ فرمایا گیا ہے لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر اہل ظاہر کو ماقبل سے اس کا ربط سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اوپر فرمایا ہے انا فتحت لك فتحا مبینا ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے اور نمایاں کامیابی دی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخشیں تو اہل ظاہر یہاں چکراتے ہیں کہ بشارت فتح سے مغفرت کا کیا جوڑ ہے مگر عشاق نے اس کا ربط سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اصل میں تو فتح کے مضمون پر اتمام نعمت اور ہدایت و استقامت و نصرت و غلبہ کو متفرع کرنا مقصود تھا مگر چونکہ ان چیزوں کا مزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی

وقت آسکتا تھا جبکہ پہلے یہ تسلی کر دی جائے کہ حق تعالیٰ آپ سے راضی بھی ہیں اس لئے ان بشارت کی لذت کامل کرنے کے لئے پہلے لیذکر لک اللہ ماتقدا ما من ذنبک وما تاخر فرمایا گیا اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذاق عشق غالب تھا آپ کو سب سے پہلے اسکی فکر رہتی تھی کہ محبوب راضی بھی ہے یا نہیں اس لئے اول اس کا اطمینان دلا کر پھر دوسری بشارتوں کو بیان کیا گیا ہے ویتمو نعمۃ علیک ویسعدیک صراطا مستقیما وینصرک اللہ نصرا عزیزا کہ اس فتح سے آپ پر نعمت کا کام تمام کرنا مقصود ہے اور آپ کو صراط مستقیم پر پہنچانا اور نصرت الہی کے ساتھ (مخالفین پر) پورا غلبہ دینا منظور ہے (یہ فتح بطور استدراج وغیرہ کے نہیں اور نہ یہ غلبہ عارضی ہے بلکہ کامل و مکمل ہے جس کے بعد مغلوبیت کا احتمال ہی نہیں۔ وقد کان مکاتال فان الاسلام لہ یزل فی العروج والظہور بعد ذلک الفتمہ ۱۲ جامع) اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ نے عشاق کی رعایت سے مغفرت کی بشارت کو مقدم فرمایا جب ادھر سے اطمینان ہوا اور معلوم ہو گیا کہ محبوب راضی ہیں تو اب عاشق کو بھوک لگی۔ اس سے پہلے تو کسی چیز کی بھی طلب و خواہش نہ تھی اب جنت و حور وغیرہ کی طلب ہوئی کہ حضرت ہیں کچھ اور بھی ملیگا کیونکہ کریموں کا قاعدہ ہے کہ جس سے راضی ہوتے ہیں اس کو اپنی رضامندی کی کچھ نشانی بھی دیا کرتے ہیں جیسے غلوت وغیرہ تو ارشاد ہوتا ہے واجر کبیرہ اور ان کے لئے مغفرت کے ساتھ بڑا اجر بھی ہے (یہاں بھی عشاق کے مذاق کی رعایت ہے۔ اجر کی تفصیل نہیں کی کہ کیا ملے گا یہیں یہ فرمایا کہ بڑا اجر دیں گے اور جس چیز کو محبوب بڑا کہدے پھر اس کی بڑائی کی کیا انتہا ہے معلوم ہو گیا کہ وہ انعام ملیگا جو ہر دم و گمان سے بھی باہر ہے ۱۲ جامع) یہ تو مضمون مقصود کا بیان تھا اب میں آیات متلوہ سے اس مضمون کی لطیف مناسبت بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ یہاں حق تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے ایک یشربون من کأس کان مزاہرا کا فوراً اور آگے فرمایا ہے یسقون فیہا کاسا کان مزاہرا زنجبیل یعنی ایک جگہ تو فرماتے ہیں کہ جنت میں نیک بندہ ایسی شراب کے جام پیئے گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کان کو ایسا جام شراب پلایا جائیگا جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی (دوسری کی ۱۲) اسکے متعلق میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ یہ اختلاف مزاج باعتبار اختلاف احوال کے ہے اس کی تفصیل کے لئے اول دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ آخرت میں جہزہ کو عمل سے مناسبت ہوگی۔

دوسرے یہ کہ نعمائے جنت صورت اعمال ہیں اور یہ دونوں مقدمے سلف کے اقوال سے  
 موید ہیں بلکہ اشارۃً احادیث سے بھی ان کا پتہ چلتا ہے اول اہل کشف کے اقوال سے  
 تو اس میں بہت صریح ہیں مگر بعض علماء ظاہر نے بھی اس کو بیان کیا ہے چنانچہ ہذا الذی درزقنا  
 من قبل کی تفسیر میں مفسرین نے چند اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ نعمائے جنت صورۃً نعمائے  
 دنیا کے مشابہ ہوں گے ان کو دیکھ کر جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہم نے اس سے پہلے  
 دنیا میں کھائی تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ ثمرات جنت باہم مشابہ ہوں گے۔ اس لئے ایک بار  
 کسی چیز کو کھا کر پھر دوبارہ جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو صورۃً پہلے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے  
 کہیں گے کہ یہ تو ابھی کھائی تھی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ نعمتیں اعمال کی صورت ہونگی جن کو  
 دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ آہا یہ تو وہی ناز ہے جس کی ہم کو دنیا میں توفیق ہوئی تھی اور وہ مناسبت  
 ایسی ظاہر ہوگی جس کی صاحب عمل فوراً سمجھ جائے گا اور گو اس تفسیر کو علماء ظاہر نے زیادہ قبول نہیں  
 کیا مگر اس کی تغلیط بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ ایک حدیث میں  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان الجنة قيعان وعراسھا سبحان اللہ والحمد للہ  
 ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت تسبیح و تحمید وغیرہ  
 ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کے درخت ان کلمات کی صورت ہیں اسی طرح  
 بعض نصوص قرآنیہ میں ہے۔ ذوقوا ما کنتم تعملون کہ چکھو ان چیزوں کو جو تم کرتے تھے اگر  
 اس میں تاویل نہ کی جائے تو ظاہر نص ان لوگوں کی تائید کرتا ہے جو جزا کو صورت اعمال  
 کہتے ہیں باقی یہ مقدمات اقناعیہ ہیں۔ میں ان کی بنا پر دعویٰ نہیں کرتا اور نہ آیات کی تفسیر کرتا  
 ہوں بلکہ ایک لطیف استہناد علم اعتبار کے طور پر کرتا چاہتا ہوں۔ بہر حال حق تعالیٰ  
 فرماتے ہیں کہ جنت میں جو شراب ملے گی اس میں کافور کی آمیزش ہوگی جیسا کہ دنیا میں بعض  
 لوگ شراب میں سرور و کیف بڑھانے کے لئے کوئی مفرح چیز ملا لیا کرتے ہیں جیسا کہ  
 صاحب معلقہ کہتا ہے

ولا تبقى خمور الابد ریتنا

لہ الاہبی بصحنک فاصحیتنا

اذا ماء الماء خالطها سحنیتنا

لہ مشعشعة کان الحص فیہا



ترجمہ شعر لہ (اے محبوب اپنے پیالے سے ہمیں صبح کی شراب پلا اندرین کی شرابیں ہم سے  
بجا کر نہ رکھنا۔ لہ وہ شراب ایسی تیز ہو جو گلے میں اٹکنے والی ہو جب پانی اس  
پلے تو اور تیز ہو)

آیت میں مزاجہا کے معنی آمیزش کے ہیں۔ مزاج طبی مراد نہیں۔ اللہ بچائے واعظین  
سے نہ معلوم وہ اس جگہ مزاج کے معنی میں کیا گڑ بڑ کرتے ہوں گے آگے کافور  
کی تفسیر ہے عینا یشرب بها عما د الله۔ اس میں عینا کافور سے بدل ہے یعنی وہ  
کافور ایک چشمہ کا نام ہے دنیا کی طرح کافور کی پڑ یہ نہ ہوگی۔ یہاں تو کافور بخمد ہوتا ہے  
اور وہاں سیال ہوگا اور زنجبیل کا بھی وہاں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے  
وہ بھی کوئی بخمد چیز نہیں ہے بلکہ سیال ہے۔ اور قلیل مقدار میں نہیں ہے بلکہ اس کا  
ایک چشمہ ہوگا جیسے جنت میں دودھ کی نہریں ہوں گی۔ اس پر دیا نند نے ایک  
بیہودہ اعتراض کیا تھا کہ وہاں اتنی گائیں کہاں آئیں گی جن کے دودھ سے نہریں چل پڑیں گی  
سبحان اللہ یہ عقل ہے۔ دوسرے ادیان کے مقتداؤں کی گویا ان کے نزدیک بدون  
تھن کے دودھ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ تھن میں دودھ کہاں سے آتا ہے  
کیا اس کے واسطے بھی کوئی دوسرا تھن ہوتا ہے اگر یہ ہے تو پھر تسلسل مستحیل  
لازم آئے گا۔ پر یہ مشاہدہ کے بھی تو خلاف ہے۔ بھلا تھن کے لئے دوسرا تھن کہاں  
ہوتا ہے۔ لہذا ضرور کہتا پڑے گا کہ تھن میں بدون کسی تھن کے دودھ آگیا معلوم  
ہو کہ دودھ کا پیدا ہوتا تھن پر موقوف نہیں تو جس خدا نے یہاں خون اور گوشت  
میں سے ایسا لطیف دودھ نکال دیا کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ نہریں دودھ پیدا  
کر دے۔ لہذا یہ اعتراض محض بے عقلی کا ہے۔ ع

تو مشومت کر کہ حق بس قادر است

(تو منکپرت ہو کہ حق تعالیٰ بہت ہی صاحب قدرۃ ہیں)

افسوس کہ دوسرے ادیان والوں کو خدا تعالیٰ کی قدرت کا بھی علم نہیں جیسی تو  
ان کے مقتدا ایسی بے سرو پا باتیں کہتے ہیں غرض کافور ایک چشمہ کا نام ہے

جس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ تہایت عجیب و غریب شے ہے لیکن دنیا کی تمام چیزوں میں سے اس کو کا فور سے زیادہ مشابہت ہے ایسے ہی زنجبیل کی بھی حقیقت وہ نہیں جو ہم لوگ سمجھتے ہیں لیکن اس کو بھی تمام اشیاء میں زنجبیل دنیا سے زیادہ مناسبت ہے اس کا ضرور قائل ہونا پڑے گا کیونکہ یہ قرب اوصاف ہی سبب ہوا ہے اسے کا فور یا زنجبیل کہنے کا ورنہ کچھ اور کہا جاتا لیکن فی الجملہ مناسبت ہونے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کے خواص اور مزہ وغیرہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا دنیا کے کا فور و زنجبیل کا ہوتا ہے بلکہ خواص اور مزہ اس کا علیحدہ ہے جو نہایت لذیذ و خوشگوار ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں یشرب بھا عباد اللہ کہ اس چشمہ سے اللہ کے بندے پیئیں گے۔ یہاں عباد اللہ سے یا تو ابرار ہی مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اضافت تخصیص کے لئے ہے یعنی اصل میں تو وہ خاص مقربین کے لئے ہوگا مگر ابرار کو بھی ان کے طفیل میں مل جائے گا۔ آگے فرماتے ہیں ،

یفجرونها تفجیرا ط یہ عجیب تماشہ ہے یعنی وہ چشمہ اپنی طبیعت سے نہ بہے گا۔ بلکہ نیک بندوں کا تابع ہوگا ان کے اشارہ پر چلے گا۔ جہاں چاہیں لیجا میں گے اگر کہیں اونچے پر بیٹھے ہوں گے اور چشمہ کو وہاں بلا میں گے تو فوراً اوپر پہنچ جائے گا کیونکہ جنت اور جنت کی ہر چیز ذی حیاة ہے۔ اہل کشف نے ان الدار الاخرة لھی الجیوان کی یہی تفسیر کی ہے جس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ترغیب و ترہیب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما خلق اللہ جنة عدن خلق فیها الاعمین رأیت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر قال لھا تکلمی فقالت فتدا فدلج المؤمنون رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط باسناد بن احمد ہما جید۔

نیز اہل کشف نے فرمایا ہے کہ جہنم بھی ذی حیاة ہے وہ کوئی بے جان نہیں ہے بلکہ جان دار اثر دہے کی شکل میں ہے اور اتنا بڑا ہے کہ اس میں آسمان و

زمین سب آسکتے ہیں جیسے سمندر میں بعض مچھلیاں جہازوں سے بھی بڑی ہیں اور اس قول کی تائید ان احوال سے ہوتی ہے جو جہنم کے متعلق احادیث میں وارد ہیں۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے میں ان میں جہنم کو اس طرح لایا جائے گا کہ اس کے ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوئے ہوں گے۔ مگر اس پر بھی وہ قابو سے باہر ہوگی اور چیختی چلاتی آئے گی۔ سو بھلا بے جان چیز کے لئے بھی کہیں باگیں ہوتی ہیں اور وہ بھی کہیں چیخا چلا یا کرتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں جہنم اور جنت کا کلام کرنا بھی وارد ہے۔ اہل کشف کی اس تحقیق کے بعد ان احادیث میں تاویل کی کچھ حاجت نہیں رہتی۔ نیز قرآن مجید میں نار کو ہل امتلاآت کا خطاب اور اس کا ہل من مزید سے جواب مذکور ہے۔ نیز احادیث میں ہے کہ جو شخص جنت طلب کرتا ہے جنت اس کو طلب کرتی ہے اور جو شخص جہنم سے پناہ مانگتا ہے جہنم اس سے پناہ مانگتی ہے اور صابو جن چیزوں کو ہم یہاں بے جان سمجھتے ہیں وہ بھی تو خدا تعالیٰ کے سامنے ذی حیات ہیں گو ہمارے سامنے جامد ہیں۔ چنانچہ قرآن میں وارد ہے قلنا یا نار کونی بردا و سلاماً علیٰ ابراہیم۔ اور ہم نے کہا کہ اے آگ تو ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا ذریعہ بن جا۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ اگر سلاماً نہ فرمایا جاتا تو آگ اتنی ٹھنڈی ہو جاتی کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس کی برودت سے تکلیف پہنچتی اب سلاماً کی قید کے بعد اتنی ہی ٹھنڈی ہوتی جو ناگوار نہ ہو۔ سو اس میں حق تعالیٰ کا آگ کو خطاب کرنا مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ خطاب ذی حیات کو ہوا کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند

نامن و تو مردہ باحق زندہ اند

رپانی و ہوا خاک اور آگ سب بندے ہیں ہمارے ساتھ تو وہ مردہ

معلوم ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق زندہ کا ہے

اسی طرح آسمان وزمین و جبال وغیرہ سے حق تعالیٰ کا خطاب فرمانا نص میں مذکور ہے نیز ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے علاوہ اور بھی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن سے عناصر کا ذی حیات ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین نے اصحاب الاخدود کے قصہ میں لکھا ہے کہ ایک یہودی بادشاہ نے مسلمانوں کو مرتد ہونے پر مجبور کیا جب لوگوں نے اس سے انکار کیا تو ظالم نے بہت سی خنڈ قیں کھودیں اور ان میں آگ جلائی اور مسلمانوں کو مجبور کیا یا تو آگ کو سجدہ کرو ورنہ تم کو اسی میں ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ بہتوں نے انکار کیا اور ان کو آگ میں ڈال دیا گیا مگر ان کے ایک عورت بھی تھی جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا اس کو بھی کفر پر مجبور کیا گیا جب اس نے انکار کیا تو بچہ کو گود میں سے چھین کر آگ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ اللہ کیسے بچے مسلمان تھے کہ ایسے سخت امتحانات میں بھی ثابت قدم رہے۔ پھر مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی بڑی سخت تھیں۔ ایک آجکل کے مسلمان ہیں جو ذرا سی تنگی اور اسلا سے پریشان ہو کر مرتد ہونے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بس یوں کہئے کہ ان کے دل میں اول ہی سے ایمان نہیں تھا ورنہ ایمان جب دل میں پیوستہ ہو جاتا ہے پھر نہیں نکل سکتا۔ غرض جب بچہ کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت ماں کو ذرا گھبراہٹ ہوئی اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے اس وقت حق تعالیٰ نے اس کی امداد فرمائی کہ بچے کو بولنے کی طاقت دیدی اور اس نے اندر سے ماں کو پکارا۔

اندر آما در کہ من اینجا خوشم گر چہ در صورت میان آتشم

(اندر آجا اے میری ماں کہ میں یہاں خوش ہوں اگرچہ بظاہر آگ میں ہوں)

اندر آ اسراہ ابراہیم میں کو در آتش یافت و رودیاسمیں

(اندر آجا اے میری ماں اور اسرار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشاہدہ کر لے کہ

انہوں نے نمود کی آگ میں گلاب اور چینی کی بہا پائی تھی)

کہ اے ماں تو بھی اندر آجا اور ذرا اندر آ کر دیکھ یہاں تو عجیب و غریب باغ اور

پھول پھلواریاں ہیں یہ سن کر عورت بھی از خود آگ میں کود پڑی۔ اب کیا تھا یا تو

مسلمان آگ سے ڈر رہے تھے۔ یا پروانہ وار سب کے سب دامادم کو دہانے لگے اب یہ حال ہوا کہ سپاہی ان کو روکتے تھے اور وہ زور کر کے خود آگ میں گرتے تھے یہ حالت دیکھ کر بہت سے کافر بھی مسلمان ہو گئے اور کلمہ پڑھ کر آگ میں گرنے لگے۔ اس پر وہ یہودی جھلا اٹھا اور آگ سے کہنے لگا اے آگ تجھے کیا ہوا تو جلاتی کیوں نہیں۔ کیا تو آگ نہیں رہی کچھ اور بن گئی۔ اس وقت آگ نے جواب دیا یہ

گفت آتش من ہما نم آتشم

اندر آتو تا بہ بسنی تابشم

اس آگ نے کہا کہ میں تو وہی آگ ہوں تو آگ کے تو دیکھ کہ میں کس قدر گرم ہوں) کہا میں تو وہی آگ ہوں ذرا تو اندر آ پھر میری تپش کو دیکھ باقی ان کے واسطے میں آگ نہیں رہی کیونکہ ان کو جلانے کا مجھے حکم نہیں ہے اس کے بعد آگ پھیلی اور جتنے کفار خندقوں کے کنارہ بیٹھے ہوئے تھے بادشاہ سمیت سب جل بھن کر خاک ہو گئے۔ پس جمادات دنیا میں بھی حق تعالیٰ کے سامنے ذی حیاۃ ہی ہیں گو ہم کو جماد نظر آتے ہیں اور آخرت میں ہم کو بھی ہر چیز ذی حیات معلوم ہوگی۔ اسی لئے جنت کے چشمے اور نہریں مسلمانوں کے اشاروں پر چلیں گے جب تک معلوم ہو گیا کہ نعمائے جنت صورت اعمال ہیں اور جزا کو عمل سے مناسبت ہوگی۔ تو اب سمجھئے کہ وہاں جو مسلمانوں کو شراب ملے گی وہ کس چیز کے مناسب اور مشابہ ہے یعنی وہ کونسا عمل ہے جس کی صورت عالم آخرت میں شراب ہے۔ تو اہل لطائف نے لکھا ہے کہ یہ محبت کی صورت ہے۔ محبت میں بھی ایک تیزی اور سرور اور کیفیت مستی ہوتی ہے شراب میں بھی یہی صفات ہیں تو وہ اس کی صورت ہے۔ مگر اس شراب کو دنیا کی شراب پر قیاس نہ کرنا یہاں کی شراب تو ذی سرور ہے جس سے بیہودہ افعال و اقوال صادر ہوتے ہیں اور ہوش و ہوا اس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں کی شراب ظہور ہے کہ خود بھی پاکیزہ اور پینے والوں کو بھی پاکیزہ بنانے والی ہے

نہ اس سے درد سر اور چکر ہوگا نہ عقل زائل ہوگی لایصد عون عنہا ولا یتزقون  
 مگر اس سے یہ مت سمجھنا کہ وہ شراب سراب محض ہوگی جیسے پانی پی لیا ہرگز نہیں بلکہ  
 اس سے سرور و نشاط اس درجہ حاصل ہوگا جو یہاں کی شراب سے نہیں ہو سکتا منافع  
 فخر سب اس میں علی وجہ الکمال ہوں گے۔ مگر مضار و نقصانات بالکل نہ ہوں گے  
 تو وہاں شین کے ساتھ ساتھ سین بھی ہوگا یہ نہیں کہ شین کے بجائے سین ہو یہ دنیا  
 ہی کی ترکیب ہے جس میں شین اور سین آگے پیچھے ہیں یکجا نہیں ہیں۔ وہاں دونوں  
 ساتھ ساتھ ہوں گے یہاں کی شراب تو یصد عن السبیل اللہ ہے اور وہاں  
 کی شراب یصد عن غیر اللہ ہے۔ بہر حال اہل لطائف نے اس پر تو تنبیہ کی  
 ہے کہ شراب آخرت صورت محبت ہے لیکن اس پر کسی نے تنبیہ نہیں کی کہ اس کے  
 لئے مزاج ایک جگہ کا فور بتلایا گیا ہے اور ایک جگہ زنجبیل تو یہ مزاج کس چیز  
 کی صورت ہے اور اس کو کس سے مناسبت ہے اس کے متعلق میرے قلب  
 پر یہ لطیفہ وارد ہوا ہے کہ یہ محبت کی انہی دونوں نسبتوں کا لون ہے کافور  
 کو نسبت انس سے مشابہت ہے اور شراب کافور آمیز اس لون محبت کی صورت  
 ہے کیونکہ کافور بارد المزاج ہے اور زنجبیل کو نسبت شوق سے مشابہت ہے  
 اور شراب زنجبیل آمیز اس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ زنجبیل حار المزاج  
 ہے اور شوق میں حرارت و التهاب ہوتا ہے لہذا یہ اس کے مناسب ہے جیسا کہ  
 نسبت انس میں برود و خمود و سکون ہوتا ہے اور کافور اس کے مناسب ہے پس  
 نقش بند یہ کو وہاں شراب کافور ملے گی اور چشتیہ کو شراب زنجبیل (یعنی ان کو زیادہ  
 وہ اور ان کو زیادہ یہ ملے گی کیونکہ حرارت و سکون سے دونوں خالی نہیں ہاں ایک پر  
 ایک کا غلبہ ہے سو اس کا مقتضایہ ہی ہے کہ دونوں کو دونوں شرابیں دی جائیں گی۔  
 مگر کثرت و قلت کا فرق ہوگا (جامع) اور دیکھئے جیسے یہاں نسبت سکون اور نسبت  
 عشق کے آثار مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی دونوں کے ساتھ مختلف  
 معاملہ ہوگا۔ چونکہ نسبت سکون میں غلبہ سحر کو ہوتا ہے اور اس میں اختیار و

ارادہ قنات نہیں ہوتا تو ان کے واسطے فرمایا گیا ہے یشربون من کاس کہ وہ خود جام شراب پیئیں گے اور نسبت عشق میں اختیار و ارادہ باقی نہیں رہتا تو ان کے متعلق ارشاد ہے ویسقون فیہا کاسا کان من اجہا زنجبیلہ کہ یہ وہاں بھی خود نہیں پیئیں گے بلکہ دوسرے ہی لاکران کو پلائیں گے کہ وہاں بھی مستی ہی میں رہیں گے یشربون اور یسقون میں جو فرق ہے وہ اہل ذوق پر مخفی نہیں ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے اس کو تفسیر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اعتبار کے طور پر اہل لطافت کے مناسب یہ لطیفہ بیان کر دیا ہے کہ کافور و زنجبیل کو ان دونوں نسبتوں کے رنگ سے مناسبت ہے اور جیسے کافور و زنجبیل جنت میں شراب کے ساتھ ملائے جائیں گے جس سے شراب کا اصل اور ان کا فرع ہونا ظاہر ہو رہا ہے اسی طرح یہاں بھی سمجھئے کہ نسبت انس اور نسبت عشق کے آثار میں جو اختلاف ہے کہ ایک میں غلبہ حرارت ہے اور ایک میں برد یہ مقصود نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود محبت ہے جو دونوں میں مشترک ہے پس صاحب سکون کو عدم التہاب سے پریشان نہ ہونا چاہیے اور نہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھتا چاہیے بلکہ یوں سمجھئے کہ شراب محبت مجھے بھی حاصل ہے۔ مگر اس میں کافور ملا ہوا ہے جس کی وجہ سے حرارت کا غلبہ نہیں ہوتا پر اس کا حرج ہی کیا ہے تم بھی اللہ تعالیٰ کے مقربین میں داخل ہو اور اس جماعت میں سے ہو جن کو جنت میں کافور آمیز شراب دی جائے گی۔ پس ہر حال میں راضی رہو۔ اور اپنی تجویز کو دخل نہ دو حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں کافور ملا کر پلاتے ہیں۔ اور جس کو چاہتے ہیں زنجبیل ملا کر پلاتے ہیں۔ واصل دونوں ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۷

عاشقہ گرزین سر و گوزاں سرست

عاقبت مارا بدار شہ رہبرست

رعاشقی خواہ سکون قلب سے ہو یا اضطراب قلب سے ہو دونوں ہی حق تعالیٰ کے واصل ہیں کسی پر شوق اور عشق کا غلبہ ہے کسی پر انس اور سکون کا

میں نے پہلے اس بیان کا نام "الکافور والزنجبیل" تجویز کیا تھا اسی وجہ سے کہ اس میں نسبت مع الشرکے دو الوان کا ذکر ہوا ہے جن کو ان دونوں سے مناسبت ہے مگر بعد میں پھر دوسرا نام تجویز کیا جو ذرا عام لوگوں سے غیر مانوس ہے یعنی (المعرق والرحیق للمعرق والحریق) اس میں معرق کو تو معرق سے مناسبت ہے اور رحیق کو حریق سے معرق کہتے ہیں۔ اس شراب کو جس میں پانی ملایا گیا ہو اور معرق کہتے ہیں غریق کو قاموس سے معلوم ہوا کہ معرق اور غریق دونوں واحد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دریائے سکون و خمود میں ڈوبا ہوا ہے یعنی صاحب نسبت انس اس کے لئے تو شراب آب آمیز ہے اور جو جلا بھنا رہتا ہے یعنی صاحب نسبت عشقیہ اس کے لئے رحیق ہے یعنی شراب خالص کیونکہ لغت میں رحیق کے یہی معنی ہیں گو اس نام میں کافور و زنجبیل کی آمیزش پر اشارہ نہ ہو سکا مگر فرق پھر بھی ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ جس شراب میں پانی ملا ہوا ہو وہ خالص شراب سے تیزی میں کم ہوتی ہے پس اس نام سے یہ معلوم ہو گیا کہ غریق و حریق دونوں شراب خوردہ ہیں۔ مگر ایک نے تیز شراب پی ہے۔ ایک نے پانی ملی ہوئی۔ محروم کوئی نہیں میں نے اول یہ چاہا تھا کہ اس کا نام العریق والرحیق للغریق والحریق رکھوں کہ یہ بولنے میں ذرا سہل تھا۔ مگر لغت میں مجھ کو عریق کے معنی شراب آب آمیز تھیں ملے اور دوسرے جو معنی ملے وہ اس جگہ مناسب نہ تھے۔ اگر کسی کو لفظ عریق کا بمعنی معرق ہونا ثابت ہو جائے تو پھر یہ نام بہت اچھا ہے۔ میری نظر کتب لغت پر زیادہ نہیں ہے پس میرے پاس تو قاموس ہی ہے اسی میں سب تنگ و ناموس ہے اس میں مجھ کو یہ بات نہیں ملی ممکن ہے کہ کسی اور کتاب میں اس لفظ کا بمعنی معرق استعمال ہونا دستیاب ہو جائے۔ بہر حال اس وقت تو یہی نام میں نے تجویز کیا ہے۔ المعرق والرحیق للمعرق والحریق اور زیادہ تر اس نام کی رعایت سے میں نے سورہ دہر کی آیات پڑھی ہیں تاکہ میرا یہ لطیفہ قائم رہے۔ ورنہ اصل مقصود کو دوسری آیت میں مصرع تھا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی محبت عطا فرمائیں خواہ اس رنگ کی ہو یا اس رنگ کی۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علیہم و آلہم و اصحابہم اجمعین و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین۔ تمت بِالْحَمْدِ



اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ  
**شریعت اور طریقت** کے افادات کا انتخاب ہیں اس میں شریعت طریقت حقیقت معرفت بیعت اخلاق

بجاہد انکار اشغال مراقبات احوال توجیہات تعلیمات مسائل مع دلائل و حقائق سالک کے لئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث  
 نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اس طرح یہ کتاب اسلامی تصوف و  
 سلوک اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے شاید ہی تصوف کا کوئی اہم مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں روشنی نہ  
 ڈالی گئی ہو۔ اس کے مطالعے سے اسلامی تصوف و سلوک کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں تزکیہ نفس تہذیب اخلاق اصلاح  
 اعمال کا طریقہ نہایت واضح اور آسان ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شریعت و طریقت میں کوئی تضاد  
 نہیں اس کتاب کے ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے۔ مجلد ڈسٹ کور قیمت ۲۰٪ روپیہ علاوہ خرچہ ڈاک۔

## ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ ثنم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۵ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زر سالانہ ختم ہو گیا  
 ماڈاک خانہ نے وی پی رجبٹری وغیرہ کا خرچہ دو گنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی متگانے سے  
 آپ کے چار روپیہ کا نقصان ہے۔ لہذا زر سالانہ منی آرڈر سے ارسال فرما کر اپنے چار روپے  
 بچالیں۔ اور اپنے چار روپے کا نقصان نہ کریں۔  
 ۲۔ جدید سال ۱۹۸۶ء کے لئے پچیس روپے براہ کرم آج ہی ارسال فرمادیں۔ جزا  
 کم اللہ تعالیٰ۔

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو دو جدید خریدار کا بھی زر سالانہ ارسال فرمادیں  
 تو اس خاص دینی تبلیغی، اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاویگا۔ اسی قیس منی آرڈر میں چار  
 خریداروں تک کا زر سالانہ آسکتا ہے۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثنم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یتیموں  
 عرضیں قبول فرمادیں گے۔ جزا کم اللہ تعالیٰ والسلام۔

طالب دعا محمد عبدالمنان عفرہ مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی  
 ایم۔ اے جناح روڈ